فاطمہؑ، فاطمہؑ ہے

مصنّف

ڈاکٹر علی شریعتی

مترجم

پروفیسر سردار نقوی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب ـــــ فاطمہؑ فاطمہؑ ہے

مصنف ـــــ ڈاکٹر علی شریعتی

مترجم ـــــ پروفیسر سردار نقوی

ناشر ـــــ ادارہ احیاء تراث اسلامی

تزئین ـــــ مرکز کتابت ۲۰/ ۸۳۸ فیڈرل بی ایریا کراچی

تعداد ـــــ دو ہزار

سنِ طباعت ـــــ بار سوم فروری سنہ ۹۳ء

مطبوعہ ـــــ ابنِ حسن آفسٹ پریس کراچی

قیمت ـــــ ۴۵ روپے مجلد ۶۵ روپے

ملنے کا پتہ

احمد بک سیلرز

۲۰/۱۸/۷ فیڈرل بی ایریا کراچی

فون : ۶۸۴۹۲۴

فہرستِ مضامین

پیش لفظ ۴
آغازِ سخن ۷
تقصیر کس کی ہے؟ ۳۰
مسائل کا تجزیہ، اصل خامی کہاں ہے؟ ۴۰
مسئلہ کیسے حل کیا جائے؟ ۵۴
مثالیت / حقیقت پسندی ۶۹
تعمیرِ شخصیت کے دو قالب ۹۰
مغربی عورت حقیقت اور غلط فہمی ۹۲
تنہائی ۱۱۲
خاندان کی تشکیل ۱۱۵
سرمایہ دارانہ معاشرہ میں عورت کی
حقیقت جنسیت بجائے عشق ۱۱۹
مشرق کا معاشرہ اور عورت ۱۲۲
مشرقی معاشروں میں عورت کی
تبدیلی کا کردار ... ۱۲۶
ستم گر اور ستم پذیر ۱۲۸
فریادِ استعمار ۱۴۲

حصّہ دوم

فاطمہؑ ۱۵۱
شعب ابی طالبؑ کا کردار ۱۷۳
ہجرت ۱۸۹
عقدِ فاطمہؑ ۱۹۱
شفاعت ۲۰۲
رحلتِ پیغمبرؐ ۲۲۹
اسلام بعد رحلتِ پیغمبرؐ ۲۴۷
مگر فاطمہؑ ۲۶۱
سنگین صورتِ حال ۲۶۶
رحلتِ فاطمہؑ ۲۸۰

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

" فاطمہؑ فاطمہؑ است" ڈاکٹر علی شریعتی کی تصنیف ہے اوران کی تمام تخلیقات میں ایک منفرد اور ممتاز مقام رکھتی ہے ڈاکٹر شریعتی وہ عظیم دانشور ہیں جنہیں ایک انقلابی اور عہد ساز مفکر کے طور پر جانا جاتا ہے انہوں نے عہد جدید میں اسی عہد کے لب ولہجہ میں اسلام کی فکری بنیادوں کی تشریح کی ہے اور اس انداز سے تشریح کی ہے کہ اسلام کی عمل انگیزی کی صلاحیت اور انقلابی قوت کو ایک زندہ اور متحرک حقیقت بنادیا ہے ایک ایسی حقیقت جو عوام کے فکر و شعور کو زندہ و بیدار کر کے انہیں جوش جہاد، جذبۂ عشق اور تمنائے شہادت سے سرشار کر دیتی ہے۔

اور ڈاکٹر شریعتی نے اس کتاب میں جناب فاطمہؑ کے بارے میں پروفیسر لوئی ماسینوں (LOUIS MASSIGNON) کے اس عظیم تحقیقی کام سے استفادہ کیا ہے جس سے تعلق اور استفادہ پر خود ڈاکٹر شریعتی کو فخر ہے پروفیسر ماسیون ایک عظیم مستشرق تھے اور جناب سیدہؑ پران کا تحقیقی کام منفرد تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔

اس تناظر میں اس کتاب کے ترجمہ کا کام کس قدر دشوار اور آزمائشی کام ہے اس کا اندازہ اہل فکر ونظر خود کر سکتے ہیں جو اہل علم اس کتاب کا مطالعہ فرمائیں گے وہ اس کے مضامین کی ندرت، وسعت، تنوع، گیرائی، گہرائی اور نزاکت کے

پیش نظر اس کے ترجمہ کی دشواریوں کا احساس کر سکیں گے۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ کتاب کا ترجمہ اصل فارسی متن سے اس طرح ہم آہنگ ہو کہ اس میں مصنف کا مخصوص و منفرد اسلوب اور آہنگ بھی منعکس ہو سکے اور اردو کے انشاء کے تقاضے بھی مجروح نہ ہوں۔ مترجم نے مصنف کے مضامین اور افکار و خیالات کو بغیر کسی رد و بدل کے اردو کے قالب میں ڈھال دیا ہے اس لیے کہ ترجمہ کی دیانت کا یہی تقاضہ تھا۔ البتہ مصنف کے پیش کردہ تاریخی مواد، اسکی ترتیب، تجزیہ اور نتائج سے مترجم کا سو فیصد متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

جہاں تک اس کتاب کے موضوع اور مضامین کا تعلق ہے۔ خود کتاب کا نام اسکے مضامین کا اشاریہ ہے، ڈاکٹر شریعتی نے اس کتاب کا نام "فاطمہؑ فاطمہؑ است" رکھا ہے اور یہ نام ان کے تخلیقی اور اختراعی ذہن اور ان کے انقلابی انداز فکر کا آئینہ دار ہے ڈاکٹر شریعتی کا کہنا ہے (جیسا کہ اس کتاب کے آخری صفحات میں آپ ملاحظہ کریں گے) کہ جناب فاطمہؑ دختر پیغمبرؐ ہیں، ہمسر علیؑ ہیں، مادر حسنینؑ و زینبؑ ہیں اور بے شک یہ نسبتیں بڑی اہم، موقر اور مقدس ہیں لیکن ان کی شخصیت کی مختلف جہتیں ہیں جو بڑی روشن اور تابناک ہیں۔ مگر یہ جہتیں ان کی شخصیت کا مکمل احاطہ نہیں کرتیں ان کی تاریخی اور علامتی شخصیت ان نسبتوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے مگر ان سے زیادہ ہمہ گیر اور بامعنی ہے بے شک فاطمہؑ دختر پیغمبرؐ ہیں، ہمسر علیؑ ہیں، مادر حسنینؑ و زینبؑ ہیں۔ فاطمہؑ یہ سب کچھ ہیں مگر فاطمہؑ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہیں۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ اگر ایک جملہ میں فاطمہؑ کا تعارف کرایا جا سکتا ہے تو وہ تعارف یہی ہے کہ "فاطمہؑ فاطمہؑ است"۔

اسلام نے عورت کا جو تصور پیش کیا ہے۔ جناب فاطمہؑ کی شخصیت اس تصور کی تجسیم ہے۔ وہ ایک مثالی خاتون ہیں۔ اس مثالیہ کی شان یہ ہے کہ دنیا کی کوئی اور عورت اس کی بلندی اور عظمت تک نہیں پہنچ سکتی لیکن دنیا کی ہر

عورت کے لیے یہ مثالیہ ایک قابل تقلید نمونہ ہے۔ یہ وہ اسوۂ حسنہ ہے جس کی پیروی کے ذریعہ عورت خود اپنی حقیقت کو دریافت کر سکتی ہے۔ اپنی حیثیت مرتبہ اور مقام کا شعور حاصل کر سکتی ہے اور رزم گاہِ حیات میں اپنے لئے صحیح راستہ منتخب کر سکتی ہے۔

بے شک جناب فاطمہؑ مثالی بیٹی، مثالی بیوی، اور مثالی ماں ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ 'زنِ مبارز و مسئول' ہیں۔ وہ اپنی معاشرتی اجتماعی اور تاریخی ذمہ داریوں سے پوری طرح باخبر تھیں اور انھوں نے تاریخِ اسلام کے ایک انتہائی نازک اور حساس دور میں اپنی ان عظیم ذمہ داریوں کو اس احتیاط اور اہتمام کے ساتھ پورا کیا کہ ان کا نام تاریخ کے ہر دور میں ظلم سے ترکِ تعاون اور باطل کے خلاف احتجاج کی علامت بن گیا ہے۔

اس کتاب میں جنابِ فاطمہؑ کی شخصیت اور سیرت کا مطالعہ اسی وسیع تناظر میں کیا گیا ہے اور مصنف کا مدعا یہ ہے کہ ہم اس عظیم اور تاریخ ساز شخصیت کی معرفت کے ذریعہ اس لازوال اور لا محدود عقیدت کو جو جنابِ فاطمہؑ کے لیے ہمارے دلوں میں پائی جاتی ہے ایک تعمیری اور انقلابی قوت میں تبدیل کر سکیں کہ یہی اس ہستی کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا بامعنی طریقہ ہے۔

سردار نقوی

۱۹ر اکتوبر ۱۹۸۶ء

آغاز سخن

اس مقدس شب میں مجھ جیسے "نامقدس" شخص کی تقریر پہلے سے طے نہیں تھی بہرحال سب سے پہلے مجھے اس بات کا اعتراف کرنا ہے کہ مجھے جنابِ فاطمہؑ کی زندگی اور آپ کی شخصیت کے بارے میں پروفیسر لوئی ماسینوں کے عظیم علمی کام سے ایک گونہ تعلق رہا ہے۔ پروفیسر لوئی ماسینوں ایک عظیم انسان اور ایک عظیم اسلام شناس تھے اور جنابِ فاطمہؑ کی زندگی اور شخصیت پر آپ کا تحقیقی کام ایک گراں قدر علمی کارنامے کی حیثیت رکھتا ہے۔ خصوصاً پروفیسر موصوف نے جنابِ فاطمہؑ کی عظیم اور متبرک ہستی کے اس رخ کو اجاگر کیا ہے جو آپ کی وفات کے بعد تاریخ اسلام پر آپؑ کے زندگی بخش اثرات سے متعلق ہے۔ اس متبرک ہستی کی یاد تاریخ کے ہر دور میں مسلم معاشروں میں عدل کے قیام اور تعصب اور ظلم کے خلاف جدوجہد کی روح کو زندہ رکھنے کی ضمانت ہے اس لحاظ سے جنابِ فاطمہؑ کی شخصیت اسلام کی حقیقی روح کی علامت ہے اور تاریخ کے طویل ادوار میں جب داخلی اور خارجی عوامل اسلام کی تصویر کو مسخ کرنے کے لئے کوشاں نظر آتے ہیں تو آپؑ کی شخصیت اسلام کی اصلی اور حقیقی تصویر کی نشانی اور علامت کے طور پر ابھرتی ہے میں نے پروفیسر لوئی ماسینوں کے اس تحقیقی کام سے بہت

استفادہ کیا ہے اور ایک طالبِ علم کی حیثیت سے میں نے اس کارِ عظیم میں ایک گونہ حصہ بھی لیا ہے۔ (بالخصوص اس تحقیقی کام کے ابتدائی مرحلہ میں جو اسناد اور معلومات کی جمع آوری سے متعلق ہے) اس کام کے لیئے جناب فاطمہؑ کی بابت ان تمام تاریخی حوالوں اور اسناد کو جمع کیا گیا ہے جو چودہ صدیوں کے طویل عرصہ پر پھیلے ہوئے ہیں اور جو مسلم ممالک میں بولی جانے والی مختلف زبانوں اور مقامی بولیوں میں تحریر شدہ ہیں۔ تاریخی اسناد اور دستاویزات کے علاوہ لوک کہانیوں اور گیتوں کا بھی مطالعہ کیا گیا تاکہ زیرِ تحقیق موضوع کے متعلق تمام ممکنہ معلومات و اطلاعات کو جمع کیا جاسکے۔

میں نے یہ سوچا تھا کہ آج کی شب اپنی گفتگو میں پروفیسر لوئی ماسینوں کے اس عظیم علمی کام کا تعارف پیش کروں میں نے اس بات کو اس لئے بھی ضروری سمجھا کہ یہ کام ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ جبکہ پروفیسر موصوف اس دارِ فانی سے رحلت کر چکے ہیں اور چونکہ یہ کام ابھی تک شائع نہیں ہوسکا اس لیئے یورپ کے وہ صاحبانِ علم جو اسلام اور اس سے متعلق لٹریچر کے مطالعہ سے شغف رکھتے ہیں اس کام سے بے خبر ہیں اور اس کے نتیجہ میں خود ہمارے وہ اہلِ دانش جو یورپ کے مصنفین کی تحریروں کی وساطت سے اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں پروفیسر لوئی ماسینوں کے اس تحقیقی کارنامہ سے ہنوز متعارف نہیں ہوسکے اس پس منظر میں میں نے سوچا کہ میں آج کی شب دعوتِ تقریر کو قبول کرلوں اور خصوصاً اپنے ان طلبہ کے لیے جو حسینیۂ ارشاد میں "تاریخ و شناخت ادیان"، "جامعہ شناسی مذہبی" اور "اسلام شناسی" کے موضوعات پر میرے لیکچرز میں باقاعدہ شریک ہوتے ہیں پروفیسر ماسینوں جیسے عظیم استاد کی تحقیق کے بنیادی نکات اور خطوط اور اس تحقیق کے علمی اور تاریخی مضمرات پر روشنی ڈالوں۔

لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے سامنے جو مجمع ہے اس کی نوعیت کلاس روم کے اجتماع سے مختلف ہے اسی طرح میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ یہ مجمع کسی رسمی وعظ و خطاب میں شریک ہونے والا مجمع بھی نہیں ہے بلکہ وہ محترم خواتین و حضرات جو اس وقت یہاں موجود ہیں وہ علم و دانش کے لحاظ سے ہماری موجودہ نسل کے نمائندہ افراد ہیں یہ سامعین اس لیے جمع نہیں ہوئے کہ وہ جناب فاطمہؑ کے ذکر پر گریہ و بکا کریں اور اس کے ذریعے اپنے لئے روحانی ثواب حاصل کریں (ایسا ثواب جو بعد مرگ ان کے کام آئے) اور نہ یہ مجمع کسی تحقیقی موضوع پر خشک علمی اور تاریخی مباحث کو سننے کا خواہش مند ہے اس لیے کہ اس اجتماع کے سامنے ایک اور مسئلہ ہے اور یہ مسئلہ زندہ اور جدید، فوری اور شدید ہے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے کہ جو بہت حساس اور نازک ہے اس لیے اس کا جواب دینا بڑا مشکل ہے اور وہ سوال یہ ہے کہ مسلمان عورت کو کیسا ہونا چاہیئے

میں کون ہوں

ہمارے معاشرے میں عورت کی حالت بہت تیزی سے بدل رہی ہے وقت کا جبر اور سماجی اداروں کا جبر اسے اس کی حقیقت سے دور لئے جا رہا ہے اس سے اس کی تمام فطری خصوصیات اور قدیمی اقدار کو چھین کر اسے ایک ایسی ہستی بنائے جا رہا ہے جو ان کی مرضی اور خواہش کے مطابق ہے گویا عورت جیسی کہ وہ ہے، کی بجائے اب ایسی مخلوق نظر آتی ہے، جیسا اسے وقت اور حالات بنانا چاہتے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ وقت اور سماجی اداروں کا جبر عورت کو ایک مصنوعی قالب میں ڈھالنے میں بڑی حد تک کامیاب ہے

اس تناظر میں ہر زن آگاہ کے سامنے ہر ایسی عورت کے سامنے جو آگاہی اور شعور رکھتی ہے سب سے اہم اور شدید سوال یہ ہے کہ میں کون ہوں؟ مجھے کیا ہونا چاہیئے۔

ہر خود آگاہ عورت اس بات کا شعور رکھتی ہے کہ وہ اپنی موجودہ حالت پر جو اسے ماضی سے ورثے میں ملی ہے قائم نہیں رہ سکتی لیکن وہ محض نقالی کے طور پر اپنے چہرہ پر جدید مغربی عورت کا خول چڑھانے کے لیے بھی تیار نہیں ہے بلکہ اس کی خواہش ہے کہ وہ اپنی حقیقت کو خود دریافت کرے' اپنے وجود کی تعمیر نو خود کرے اپنے لیے چہرہ کا خود انتخاب کرے اور اس چہرے کو خود آگاہی اور ذمہ داری کے ساتھ اس طرح آراستہ کرے کہ اس میں انسانیت کا حقیقی اور فطری حسن نظر آسکے لیکن یہ کام کیسے ہو؟ ہمارے دور میں خود آگاہ عورت کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ اس کا حقیقی چہرہ کیا ہے؟ وہ اسے کیسے دریافت کرے۔ قدیم عورت کا روایتی چہرہ یا جدید عورت کا مصنوعی چہرہ انسانیت کے اس جوہر سے عاری ہے جو عورت کی اصل اور مستقل حیثیت اور فطرت کو نمایاں کرتا ہے پھر خود آگاہ عورت اپنی انسانیت کو کس چہرے میں تلاش کرے

اس مسئلہ سے ایک اور سوال بھی سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ ہم (بحمد اللہ) مسلمان ہیں۔ ہمارے معاشرے کی عورت جو اپنے لیے آزادی اور انتخاب کا حق، چاہتی ہے ایک تاریخ اور تہذیب سے وابستہ ہے اور اس کا تعلق ایک ایسے معاشرے سے ہے جس کی زندگی اور توانائی کا اصل سرچشمہ اسلام ہے ہمارے معاشرے کی عورت جو اپنی خودی کا خود اثبات کرنا چاہتی ہے جو اپنے وجود کو خود تعمیر کرنا چاہتی ہے جو ایک نشاۃ ثانیہ کے لیے بے چین ہے اور جو اس خلقت جدید میں ہر خارجی اثر کو رد کر کے اپنی مدد آپ کرنے کی خواہش رکھتی ہے جو نہ روایتی ساخت کو پسند کرتی ہے اور نہ مغربی تقلید پر راضی ہے اس کے لئے اسلام سے بے نیازی اور بیگانگی ممکن ہی نہیں ہے۔

ایسی صورت میں یہ ایک بالکل فطری بات ہے کہ مسلمان عورتوں کے ذہن میں یہ سوال ابھرے کہ ہم جناب فاطمہؑ کی زندگی اور شخصیت کے متعلق کیا جانتے ہیں اور کس قدر جانتے ہیں ہمارے عوام اس پاکیزہ اور بزرگ

ہستی سے بڑی عقیدت رکھتے ہیں ہر سال لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس عظیم ہستی کی یاد میں گریہ و بکا کرتی ہے۔ ہر سال ہزاروں بلکہ لاکھوں محفلیں اور مجلیس ان کی یاد میں منعقد کی جاتی ہیں بے شمار تقریبات ہوتی ہیں جن میں ان کی مدح وثنا کی جاتی ہے ان کی عظمت اور جلالت کو خراجِ تحسین پیش کیا جاتا ہے ان کی کرامت اور معجزوں کا ذکر ہوتا ہے ان کی مصیبت پر گریہ اور ان کے دشمنوں سے بیزاری اور نفرت کا اظہار کیا جاتا ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود ہمیں اس عظیم اور ہمہ گیر شخصیت کی معرفت حاصل نہیں ہے اور اس بزرگ اور مقدس شخصیت کے بارے میں ہماری معلومات بہت سطحی اور محض ان چند اطلاعات پر مشتمل ہیں کہ:۔

جناب فاطمہؑ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی چہیتی بیٹی تھیں جناب رسالت مآبؐ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد آپ کی زندگی آلام و مصائب میں گھر گئی۔ آپؑ کو فدک کی جاگیر سے محروم کر دیا گیا آپؑ کے گھر پر حملہ کیا گیا جس کے نتیجہ میں گھر کا دروازہ آپؑ کے پہلو پر گرا اور جناب محسنؑ شکم مادر میں شہید ہو گئے ان حالات میں آپ کی شخصیت حزن وملال کا مرقع بن کر رہ گئی آپ کا یہ معمول بن گیا کہ آپؑ اپنے بچوں کو ساتھ لے کر شہر سے باہر چلی جاتی تھیں اور اس دور افتادہ مقام پر تمام دن گریہ و بکا میں مصروف رہتی تھیں اس طرح ان کی مختصر عمر محض گریہ و بکا کرنے اور اپنے دشمنوں کے خلاف غم وغصہ کا اظہار کرنے میں بیت گئی یہاں تک کہ انہوں نے اس دار فانی سے رحلت کی اپنے انتقال کے وقت آپ نے وصیت کی کہ جنازہ رات کو اٹھایا جائے تاکہ وہ لوگ جن سے آپ ناراض تھیں آپ کے جنازے میں شریک نہ ہو سکیں اور نہ انہیں آپ کی قبر کا نشان معلوم ہو سکے۔

جنابِ فاطمہ کی عظیم شخصیت کے متعلق ہماری معلومات کا دائرہ محض ان چند اطلاعات تک محدود ہے ہم جو دل وجان سے ان کی عظمت اور جلالت کے

معترف ہیں اور ہم جو اپنے روح اور ایمان کی تمام گہرائیوں اور توانائیوں کے ساتھ ان سے عقیدت رکھتے ہیں ایسی بے پایاں اور لازوال عقیدت جس سے زیادہ عقیدت رکھنا کسی انسانی گروہ کے لیے ممکن نہیں ہے لیکن اس ہستی کے بارے میں جو ہماری عقیدتوں کا مرکز ہے ہماری معلومات افسوسناک حد تک محدود اور سطحی ہیں۔

عقل حقیقت نگر

میرے خیال میں ملتِ ایران کو تاریخ میں جو سب سے بڑا افتخار اور اعزاز حاصل ہے وہ یہ ہے کہ اس ملت نے اپنا رہبر، اپنا پیشوا اور اپنا امام حضرت علی کو چنا ہے

یہ انتخاب اس بات کی علامت ہے کہ اس ملت کی عقل عام سطح سے بلند اس کی فکر عمیق اور اس کا تلاشِ حقیقت کا جذبہ دیگر تمام باتوں پر حاوی اور غالب ہے۔

یہ انتخاب اس بات کا مظہر ہے کہ یہ ملت ظلم سے مقابلہ کا حوصلہ رکھتی ہے جھوٹ اور فریب کا پردہ چاک کر سکتی ہے اور غاصب اور طاقتور حکمرانوں سے پنجہ آزمائی کرنے کی ہمت رکھتی ہے۔

یہ انتخاب اس بات کی علامت ہے کہ یہ ملت کسی بھی حال میں سلطانِ جابر کو خلیفہ برحق ماننے کے لیے تیار نہیں ہے اور جابر حکومتوں سے مربوط تمام مصنوعی علماء کے روحانی اور دینی اثرات اور ہر طرح کے پرفریب پروپیگنڈہ سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی اہل ہے

یہ انتخاب اس بات کی علامت ہے کہ یہ ملت تاریخ میں باطل کے سیاہ دبیز اور ضخیم پردوں کے پیچھے چھپی ہوئی گمنام اور غیر معروف حقیقت کو تلاش کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے

یہ ملت تاریخ میں باطل کی تمام فریب کاریوں، طاقت کی تمام حشرسامانیوں اور حکومت نواز علمار کی تمام فتویٰ طرازیوں کے باوجود حق کو پہچاننے کی اہل ہے یہ اپنے رہبر و امام کے طور پر علیؑ کو منتخب کرتی ہے۔ ایک انتہائی مشکل، دشوار طلب اور صبر آزما انتخاب!

ملت ایران دورِ خلافت میں (ایران کی فتح کے نتیجہ میں) دائرۂ اسلام میں داخل ہوئی لیکن اس دن سے آج تک تاریخ کے اس طویل دور میں ہم نے ہمیشہ "حقیقی اسلام" اور "حکومتی اسلام" کے درمیان تمیز قائم رکھی خلفاء بنی امیہ و بنی عباس اور تمام خان و خاقان ترک و منگول و ایرانی جو مرکز اقتدار سے اسلام، حکومت قرآن، سنت پیغمبرؐ کے نام پر وابستہ رہے ہماری نظر کو دھوکہ نہ دے سکے۔ ہر چند کہ حکومت کی گرفت اس قدر مضبوط تھی کہ اسلام اور اس کے تمام عقائد اور معارف کو حکومت کی مرضی کے مطابق ڈھالا جا رہا تھا منبر و محراب، کتاب و تفسیر و حدیث و وعظ و تبلیغ، مسجد و مدرسہ، امام و قاضی، حتیٰ کہ صحابی اور تابعی حکومت کے زیر اثر تھے لیکن اس کے باوجود ہماری نگاہ حقیقت شناس دھوکہ نہ کھا سکی اور آج بھی جب لاؤڈ اسپیکر، ٹرانسسٹر ریڈیو، فلم، ٹیلیویژن، اخبارات، رسائل اور دیگر نشریاتی وسائل حکومت کے کنٹرول میں ہیں۔ اور بے عمل علمار حکران طبقہ کی حمایت میں اپنا زور علم صرف کر رہے ہیں اور اس حکومت کو جانشینی پیغمبرؐ، وراثتِ امامت اور حکومت الٰہی قرآن و سنت جیسی اصطلاحوں سے تعبیر کر رہے ہیں۔ ہماری ملت حقیقت حال کو اچھی طرح سمجھ رہی ہے واقعہ یہ ہے کہ حکومتوں اور حکمرانوں کے زبردست پروپیگنڈہ اور ان دبیز اور تاریک حجابات کے باوجود جو معارف و الٰہیات، علم و حکمت تاریخ و ثقافت، تفسیر و حدیث کے نام پر اسلام کی حقیقت کو حکومتی مفاد کے سانچوں میں ڈھالتے رہے تاکہ "وضعِ موجود" کی تائید اور "نظامِ حاکم" کی تقدیس کی جا سکے۔ یہ ایک اجنبی اور دور افتادہ ملت (ملتِ ایران) رسمی اور حکومتی اسلام کو قبول کرنے کے لیے

کبھی آمادہ نہ ہوسکی اور ہم اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہے کہ یہ تمام پروپیگنڈہ جھوٹا ہے حکومتوں کا شور وغوغا اور طاقت کے خیرہ کن مظاہر حق کے آئینہ دار نہیں ہیں بلکہ حق کی علامت وہ مرد بزرگ ہے جو تنہائی کا شکار ہے جس کا گھر مسجد نبوی کے ایک گوشے میں واقع ہے اور جو اپنی قوم کے جہل او ناشناسی کا اسیر اور اپنے دور کی روشِ سیاست کا شکار ہوکر گوشہ نشینی پر مجبور ہو گیا۔

دمشق کے قصر خضراء کی چمک دمک اور بغداد کے الف لیلوی شہر کے سحر کو رد کرکے ملت ایران کی نظر ایک مٹی کے چھوٹے سے گھر پر ٹھہرتی ہے۔ یہ علیؑ اور فاطمہؑ کا گھر ہے ہم اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ اسلام اسی اداس اور خاموش گھر میں مکین ہے۔

وہ حقیقت جسے اہلِ مدینہ، معاصر عرب، اصحاب پیغمبرؐ نہ دیکھ سکے یا انہوں نے نہ دیکھنا چاہا ہے اور وہ حقیقت جسے دمشق و بغداد کے بڑے بڑے مدرسے اور دانش گاہیں نہ تلاش کرسکیں یا انہوں نے تلاش کرنا مناسب نہ سمجھا اس "قوم بیگانہ" نے اس حقیقت کو دیکھ لیا اور پہچان لیا، حالانکہ یہ ملت عہدِ خلافت میں بزورِ شمشیر دائرہ اسلام میں داخل ہوئی اور اس کا اسلام سے ابتدائی تعارف ان لوگوں کے ذریعہ ہوا جو حکومتی اسلام کی تبلیغ و اشاعت پر مامور تھے۔

یہ انتخاب تنہا اور واحد انتخاب، نہایت دشوار اور نہایت بامعنی انتخاب ہے یہ نشانی ہے اس ملت کی غیر معمولی ذہانت اور معجزانہ عقلی بصیرت کی اور یہ علامت ہے اس ملت کی روحانی عظمت اور استقلال، حقیقت پسندی اور اس فکری استقامت کی جو تاریخ کے مروجہ دھارے کو رد کرنے اور خلافت کے مضبوط اور طاقت ور دارالے کی نفی کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے خلافت کا ادارہ تاریخ کے تمام حکومتی اداروں سے زیادہ طاقتور ہے اس لئے کہ اس کے پاس فوجی اور سیاسی طاقت کے ساتھ ساتھ مذہب و اعتقاد کی عظیم قوت اور تہذیب و ادب و دانش کی بیکراں دولت بھی ہوتی ہے لیکن ملت ایران کی فکری توانائی نے

تاریخ کے خلاف علم بغاوت بلند کرکے خلافت کے مضبوط اور مستحکم ادارے کو رد کردیا۔

اس ملت نے جو ایک اجنبی اور دور افتادہ اور بیگانہ ملت ہے حکومتی اسلام کے اس تمام شور وغوغا کے باوجود جو جنگ وجہاد، فتح وشکست، تعمیر وتخریب سے عبارت ہے اور اس ہنگامہ آرائی کے باوجود جو علم وفکر کی ترقی اور تہذیب وتمدن وانقلاب کے نام پر برپا کی جاتی ہے جس نے تاریخ کی سماعت کو مسحور کردیا ہے اور جس کی ہیبت سے زمین لرزہ براندام رہتی ہے ہمیشہ اس صدائے حق کو سنا ہے جو ایک ایسے مرد تنہا کا نالۂ دردمند ہے جو خود اپنے شہر میں اجنبی تھا جس کے اپنے ہم قریہ اس کی صدائے حق کو سننے اور سمجھنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ وہ مدینہ کی آبادی سے دور بنی نجار کے نخلستان میں جاکر رات کی تاریکیوں میں نالہ وفریاد کرتا تھا کیونکہ اس کی صدائے پردرد پر کان دھرنے کے لیے کوئی تیار نہیں تھا اس لیے وہ اپنے دل کا درد خود اپنے آپ سے بیان کرتا تھا۔ وہ کنوئیں میں منہ ڈال کر نالۂ جانکاہ بلند کرتا تھا اس کی یہ آہ و فریاد خود اس کے ذاتی مسائل کے متعلق نہ تھی بلکہ اس کا رنج وغم اور اس کا حزن وملال اس انقلابی تحریک کے متعلق تھا جس کو بارآور بنانے میں خود اس نے ہر طرح کی قربانی پیش کی تھی وہ دیکھ رہا تھا کہ مکروفریب دروغ واشرافیت کا نظام جو پہلے قیصر وکسریٰ کے روپ میں نمایاں اور ظاہر تھا اور جسے اسلام کی انقلابی تحریک کے ہاتھوں شکست ہوگئی تھی اب ایک نئے رنگ میں ظاہر ہو رہا ہے اب اس نے تقویٰ اور مذہب کا لباس پہن لیا تھا اب وہ انسانوں کو نہ جانے اور کتنی مدتوں تک تقویٰ اور مذہب کے حوالے سے فریب دیتا رہے گا۔ آخر اس فریب کا پردہ چاک کرنے کے لیے کون سا راستہ اختیار کیا جائے گا اور اس راستہ میں کیسی قربانیوں کی ضرورت پیش آئے گی وہ صاحب بصیرت انسان اس بات کو دیکھ رہا تھا کہ اسلام میں اس ظالمانہ اور پرفریب حکومتی نظام کے ظلم کا اولین نشانہ

"عوام" ہوں گے اور یہ نظام "عوامی حقوق کی پامالی" کے ذریعہ اپنی بنیادوں کو مستحکم کرے گا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ عوام کی قربانی کا پہلا مظہر خود اس کی ذات ہے اس سے بھی قبل اس کی شریک حیات ہے اور آنے والے زمانوں میں اس کا خاندان اس ظلم کا نشانہ بنے گا۔ اور اس کی اولاد کو نسل در نسل عوامی حقوق کے تحفظ کے لیے مسلسل قربانی دینی ہوگی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ فیصلہ اور یہ انتخاب یعنی تاریخ کے نہایت دشوار، ہولناک اور تاریک ادوار میں علیؑ کو اپنا قائد اور رہبر تسلیم کرنے کا فیصلہ کوئی آسان اور معمولی فیصلہ نہیں تھا بلکہ یہ فیصلہ اور انتخاب ہماری عقل رسا اور تلاش حقیقت کے نہایت کھرے اور سچے ذوق کی علامت ہے یہ اس بات کی علامت ہے کہ ہماری ملت عقلی اعتبار سے نابغہ (GENIUS) ہے وہ اخلاق کے حسن اور عشق کی فضیلت سے آشنا ہے وہ انسانیت کی عظمت اور اس کے حسن و شکوہ کا ادراک رکھتی ہے وہ اعلیٰ انسانی قدروں سے واقف ہے اور ان کی گہرائی اور ان کی بلندی کو سمجھنے کی استعداد رکھتی ہے یہ ملت ظلم اور تاریکی کے طوفانوں میں بھی حقیقت کے دامن کو مضبوطی سے پکڑے رہتی ہے اور تاریخ کے مروجہ فیصلوں کے علی الرغم اپنے لیے حقیقت کا انتخاب خود کرتی ہے یہ وہ ملت ہے کہ جو منارہ و محراب و منبر کی آوازوں، مفتیوں، قاضیوں اور موقع پرست علماء کے اثرات اور حکومت کی خون آشام تلواروں کی چمک دمک کے باوجود کبھی دھوکہ نہیں کھاتی اور اس تمام شور و غوغا کے جواب میں ہمیشہ ایک دل اور ایک جان ہو کر نہایت مستحکم لہجہ میں صرف ایک جواب دیتی ہے اور وہ جواب ہے "نہیں" (ہم ظلم و فریب سے دھوکہ نہیں کھائیں گے۔

لیکن ہمیں کسی بھی حال میں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ ایمان کے لیے فکر و فراست کے ساتھ ساتھ خون کی حرارت کی بھی ضرورت ہوتی ہے ایمان قربانی طلب کرتا ہے۔ حق کی کامیابی کے لیے ایثار کی ضرورت

ہوتی ہے اور قربانی و ایثار کا دائرہ بہت وسیع ہے یہ بہت دشوار راستہ ہے یہاں انسان کی دلیری اس کے اخلاص اور اس کی مصائب کے مقابلہ میں قوت برداشت کا امتحان ہوتا ہے اس راہ ایثار میں طوق وسلاسل کی سختیاں ہیں کوڑوں کی سزائیں ہیں الزام تراشی اور جھوٹا پروپیگنڈہ ہے۔ قید تنہائی کی سختیاں ہیں آوارہ وطنی کا حزن وملال ہے اس راہ میں انسانوں کو اپنی انانیت کو قربان کرنا ہوتا ہے اپنی اس مصلحت اندیشی کو جو ہم خدا خواہی وہم دنیائے دوں کا نمونہ ہے بھینٹ چڑھانا پڑتا ہے اپنے پندار تقدس اپنے زعم دانشوری اور اس کے علاوہ بھی اور بہت سی چیزوں کو نثار کرنا ہوتا ہے

یہی ایثار وقربانی کا بیکراں اور مسلسل جذبہ تشیع کی اصل ہے۔ وہ تشیع جو تشیع علوی ہے نہ کہ تشیع صفوی یا "شیعہ شاہ عباسی" شیعیت وہ تحریک ہے جو تاریخ کے ہر دور میں ظلم وفریب کے دل کو دہلا دینے کا موجب رہی ہے۔ شیعیت کبھی ظلم و فریب کی پشت پناہ نہیں ہو سکتی۔ اصل شیعیت مذہب عدل ہے حکومت معصوم کا عقیدہ ہے شیعت تاریخ ماضی کے کچھ مردہ اور راز کار رفتہ مسائل یا فرقہ وارانہ تعصبات کا نام نہیں ہے۔ نہ شیعیت حب اور بغض محبت اور نفرت کے ان تصورات کا نام ہے جن کا تعلق محض زبانی جمع خرچ سے ہے اور جن کی اساس عقلی اور علمی نہیں ہے جہاں ہدف تنقید اشخاص ہیں ادارہ نہیں ہے جس کا تعلق محض ماضی سے ہے حال سے نہیں ہے اور جس کا فائدہ صرف موت کے بعد ہے (شفاعت) زندگی میں اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا جا سکتا جسے ہم "ولایت علوی" کہتے ہیں اس کا مقصد لوگوں کو حکومت ظلم وجور اور دام فریب وجہل سے آزاد کرانا تھا اس عظیم تصور ولایت کا ولایت کے اس تصور سے کوئی تعلق نہیں ہے جس کے نتیجہ میں ہر ہمہ و شما فنی بن بیٹھا ہے۔ اس جھوٹی ولایت سے نہ خدا کی کوئی خدمت ہو سکتی ہے۔ اور نہ بندگان خدا کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے

اصل تشیع اسلام کے علاوہ کچھ نہیں ہے تشیع وہ نہیں ہے جس کے

متعلق ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ " اسلام بہ اضافہ چیز ہائے دیگر " ہے نہیں ایسا نہیں ہے۔ شیعیت اسلام میں کسی اضافہ سے عبارت نہیں بلکہ شیعیت تو صرف اسلام ہے۔ اصلی اور خالص اسلام۔ وہ اسلام جو ہر کھوٹ اور ملاوٹ سے پاک ہے اور جس میں خلافت و عربیت و اشرافیت کی ملاوٹ شامل نہیں ہے۔

عدل و امامت کے شیعی اصول اسلام میں کسی اضافہ کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ عدل و امامت کو اسلام سے خارج کرنا خود دین اسلام کو

اسلام سے منہا کرنے کے مترادف ہے اسلام کا پیغام عدل کا پیغام ہے اور یہی اس کا حقیقی امتیاز اور اختصاص ہے اسلام سے عدل و امامت کو خارج کرنا اور اس کی جگہ حکومت، نسل اور طبقہ وراثت کو اسلام میں شامل کرنا قبل اسلام کے عہد جاہلیت کی اقدار کو اسلام میں شامل کرنا ہے یہ ایک لحاظ سے جاہلیت جدید ہے۔

ماضی میں شیعہ اور سنی کا اختلاف علمی اور اصولی اختلاف تھا (زمانۂ حال میں اس اختلاف نے بے روح لفظی بحثوں اور فرقہ پرستی کی شکل اختیار کر لی ہے) یہ اختلاف امامت اور عدل کی ظلم و استبداد کے خلاف جنگ سے عبارت تھا یہی وہ اصل اختلاف تھا جس سے تمام اعتقادی، مذہبی، تاریخی اور فلسفیانہ اختلافات ظاہر ہوئے ہم نے محمدؐ کے ساتھ علیؑ کا اضافہ نہیں کیا بلکہ ہم نے علیؑ کا دامن پکڑ لیا تاکہ ہم محمدؐ کو گم نہ کر دیں کیونکہ وہ تمام خلفاء اور حکمران جو درحقیقت قیصر و کسریٰ اور فرعون کے جانشین اور ابوجہل و ابوسفیان کے وارث تھے اپنی حکومت کے جواز کو قائم رکھنے کے لیے محمدؐ کی جانشینی کے دعویدار ہیں۔ ہم نے خانوادۂ علیؑ (عترت) کو سنتِ پیغمبرؐ کی جگہ نہیں دی ہم نے سنتِ پیغمبرؐ کے ساتھ عترت کا اضافہ کیا ہے بلکہ نہایت سادہ اور سیدھی سی بات یہ ہے کہ ہم عترت کے ذریعے سنتِ پیغمبرؐ کو سمجھتے ہیں یہ خاندان خود پیغمبرؐ کا خاندان ہے اور ہم اس خاندان سے پوچھتے ہیں کہ حضورؐ نے کیا فرمایا کیا عمل کیا اور اس سے آپؐ کی خواہش اور منشاء

کیا تھا۔

دوستوں اور دشمنوں دونوں کے تصور کے برعکس شیعیت اسلام میں سنت پر سب سے زیادہ کاربند رہنے والا مذہب ہے شیعہ اور سنی میں بنیادی اختلاف یہ ہے کہ علیؑ اور سچے اور باشعور شیعوں کی ابتدا ہی سے یہ کوشش رہی کہ سنت کو ہر طرح کی بدعت اور ملاوٹ سے پاک رکھا جائے اور سنت پیغمبرؐ کی روح کو مسخ نہ ہونے دیا جائے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح دین کی تمام تعلیمات کو درہم برہم کر دیا گیا ہے تاریخ کے ان سیاہ ادوار میں جب دنیا میں ہر طرف اسلام جور و خلافت کی طاقت اور حکومت کا ڈنکا بج رہا تھا اسلام عدل و امامت، خونِ شہادت کے گرداب میں غرق تھا شیعوں نے شہادت کا انتخاب کر کے حکومت کی طاقت کی نفی کر دی۔ لیکن یہ انتخاب کوئی آسان بات نہ تھی یہ بڑا دشوار انتخاب تھا یہ بڑی آزمائش اور قربانی کا مرحلہ تھا۔

بنی امیہ و بنی عباس اور سلاطین ترک و منگول کے اذیت خانے اس بات پر گواہ ہیں کہ ہر دور میں علما امامت، موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانے والے مجاہدین اور حق پرست، عدل طلب اور آزادی پسند لوگوں نے اپنے آپ کو راہِ ایثار اور قربانی پر ثابت قدم رکھا اور آگ اور خون قید و بند اور ابتلا اور آزمائش کی تمام دشواریوں کے باوجود دمشق اور بغداد کے حکومتی محلوں کو رد کر کے اپنا تعلق ایک چھوٹے سے گھر سے استوار رکھا وہ چھوٹا سا گھر جس کی عظمت تمام انسانی عظمتوں کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہے

تاریخِ اسلام میں علیؑ کا ذکر کرنا یا فاطمہؑ سے اظہارِ عقیدت کرنا کوئی آسان بات نہیں تھی کمیت جس کی شاعری کا موضوع اس عظیم خاندان کی فضیلت اور بزرگی ہے کہتا ہے کہ "میں پچاس سال سے اپنی صلیب اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے ہوں" یہ ایک ذمہ دار شاعر کا رویہ ہے ایک ایسا شاعر جس نے اپنے شعروں

سے شمشیر جہاد کا کام کیا ہے۔

اور یہی ان تمام مردوں اور ان تمام عورتوں کی تقدیر رہی ہے جنہوں نے اس مذہب کی تاریخ کو مرتب کیا ہے یہ ایک ایسی تاریخ ہے جس کی ہر سطر پر ہر حرف شہیدوں کے خون کی سرخی سے لکھا گیا ہے یہ دور سابق کے وہ مہاجان عزم و ایثار تھے جنہوں نے اپنی قربانیوں سے تشیع کی روایت کو مستحکم کیا یہ وہ لوگ تھے کہ جو کسی مصلحت یا مغالطہ کا شکار نہ تھے ان کا انداز نظر یہ نہیں تھا کہ "امام تشریف لائیں گے تو ہر چیز کی اصلاح ہو جائے گی وہ اپنے آبائے کے دین کا احیاء خود فرمالیں گے ہمارا کام یہ ہے کہ ہم صبر کریں انتظار کریں" آج صورتِ حال یہ ہے کہ ہم نے تقیہ اور تحمل کی غلط تعبیر کر کے اپنی تمام ذمہ داریوں سے منہ موڑ لیا ہے

ابن سکیت ایک بہت بڑے ادیب تھے ان کا تعلق طبقۂ مجاہدین سے نہیں تھا بلکہ وہ لسانیات اور ادب کے ماہر تھے البتہ ان کا دل شیعہ تھا عباسی خلیفہ متوکل نے اپنے فرزندوں کی تعلیم کے لیے ان کا انتخاب کیا رفتہ رفتہ متوکل تک یہ خبر پہنچائی گئی کہ اس کے بیٹے علیؑ اور ان کے خاندان کی محبت میں گرفتار ہونے لگے ہیں مخبروں نے اس کے ساتھ ہی متوکل کو اس بات سے بھی آگاہ کیا کہ یہ کام اس معلم کا ہے جسے متوکل نے اپنے بیٹوں کی تعلیم و تربیت کے لیے مقرر کیا ہے

خلیفہ نے چاہا کہ اس خبر کی تصدیق خود کرے اس غرض سے وہ اچانک ایک دن کلاس روم میں پہنچ گیا پہلے تو اس نے ابن سکیت کی تعریف و توصیف کی اور اپنے فرزندوں کی تعلیمی ترقی پر اپنی خوشی کا اظہار کیا پھر اس نے سرسری انداز میں ابن سکیت سے پوچھا کہ میرے فرزندوں کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے جواباً ابن سکیت نے خلیفہ کے بیٹوں کی بہت تعریف کی

اچانک خلیفہ نے پوچھا۔ ابن سکیت کیا تمہارے نزدیک میرے بیٹے معتز اور مؤید علیؑ کے فرزندان حسنؑ اور حسینؑ سے افضل ہیں؟

ابن سکیت کو بڑا اہم اور دشوار فیصلہ کرنا تھا اس مرحلہ پر تقیہ کا مطلب عقیدے کی کمزوری اور دین کے ساتھ خیانت ہوتا دراصل تشیع علوی میں تقیہ کمزوری اور مصلحت شناسی کا نام نہیں بلکہ تقیہ ایک ٹیکٹک (TACTIC) ہے یہ ایک ایسا طریقہ کار ہے جس کا مقصد ایمان کا تحفظ ہے محض اپنی جان کا تحفظ نہیں ہے جیسا کہ آجکل خیال کیا جاتا ہے۔

ابن سکیت نے کسی ہچکچاہٹ کا اظہار کئے بغیر اسی فطری لہجہ میں جس لہجہ میں متوکل نے اس سے سوال کیا تھا دو ٹوک انداز میں کہا "قنبر علیؑ کا غلام، تم سے اور تمہارے دونوں فرزندوں سے کہیں زیادہ افضل ہے"

متوکل نے حکم دیا کہ ابن سکیت کی زبان گدی سے باہر کھینچ لی جائے ایسی ہی زبانیں تھیں جو تاریخ کے جابر حکمرانوں کے خلاف تازیانہ کا کام کرتی رہیں اور اگر سیاسی استبداد طبقاتی استحصال اور مذہب کے نام پر قائم کئے گئے غیر مذہبی نظام کی بنیاد کو ڈھا نہیں سکیں تو کم از کم اسے رسوا کر کے چھوڑے اور یہی وہ زبانیں تھیں جنہوں نے تاریخ میں حق گوئی کی مشعل کو روشن اور لوگوں کے دلوں میں آزادی، انصاف اور حق طلبی کی لگن کو زندہ رکھا۔

علماء اور عوام

ظلم و جبر کی طاقت کے خلاف اعلاء کلمۃ الحق کی یہ سنگین ذمہ داری دو گروہوں نے پوری کی ہے یہ دونوں گروہ صدیوں سے اپنی صلیب خود اپنی پشت پر اٹھائے ہوئے ہیں۔

ان میں سے ایک گروہ علماء کا گروہ ہے۔ علماء حق جو شیعیت کے لئے جہاد کرتے ہیں۔ ہمارے عقیدہ میں امامت، نبوت کا تسلسل اور اس کے دوام کی شکل ہے اور علم امامت کے دوام اور بقاء کی ضمانت ہے۔

دوسرا گروہ ان مردان خوش اعتقاد کا ہے جن کے صبر و سکوت کو دیکھ کر جابر حکومتوں کے قید خانے فریاد کرتے ہیں جن کے خون آلود چہروں کی تازگی

کو دیکھ کر جلاد شرم سے پانی پانی ہو جاتے ہیں اور جن کی پشتیں ان چٹانوں کی طرح مضبوط اور مستحکم ہیں جن پر تشدد کر کے خود ظالموں کے کوڑے درد مند ہو جاتے ہیں۔

عقل اور عشق

ہر مذہب، ہر مکتبِ فکر ہر تحریک اور ہر انقلاب کے اجزاء ترکیبی دو عناصر ہیں عقل اور عشق ایک روشنی ہے اور دوسرا حرکت ایک لوگوں میں شعور اور آگاہی پیدا کرتا ہے ان کو دانائی اور بینائی عطا کرتا ہے اور دوسرا انہیں جوش اور جذبہ اور ذوقِ عمل کو ابھارتا ہے الیکس کارل ... ALEXIS CARREL کا کہنا ہے کہ عقل موٹر کار کی روشنی ہے جو اسے راستہ دکھاتی ہے اور عشق اس کا انجن ہے جو اسے حرکت میں لاتا ہے ان دونوں عناصر میں سے ہر ایک دوسرے کے بغیر بے کار اور بے معنی ہے عشق بغیر عقل ایک موٹر ہے جو روشنی سے محروم ہے عشق کور خطرہ کی علامت ہے حادثہ اور موت کو دعوت دیتا ہے۔

کسی بھی معاشرہ میں جب کوئی تحریک ابھرتی ہے یا کوئی فکری انقلاب رونما ہوتا ہے تو دانشور اور خود آگاہ اور روشن فکر طبقہ کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے لیے راہِ عمل کی نشاندہی کرے اور اس تحریک کے فکری مقاصد سے لوگوں کو آگاہ کرے اور عوام اس آگاہی کے نتیجہ میں اپنے جوش و جذبہ اور ذوقِ عمل کے ذریعے اس تحریک میں روح پھونکتے ہیں اور اسے حرکت اور توانائی عطا کرتے ہیں کسی تحریک کی مثال ایک زندہ جسم کی سی ہے دانشور اور علماء اس جسم کا دماغ ہیں اور اس کا دل وہ عوام ہیں جن کے سینے عشق کی آگ سے لبریز ہیں اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اگر کسی معاشرہ میں ایمان اور اخلاص عشق اور فداکاری کا فقدان ہے تو اس کے ذمہ دار عوام ہیں لیکن اگر شعور اور آگہی کی کمی ہے راستہ اور ہدف غیر واضح ہے فکر مبہم ہے سوچ میں گہرائی اور گیرائی نہیں

ہے تو اس میں قصور علماء اور دانشوروں کا ہے اسی لیے خصوصاً مذہب میں عقل اور عشق کا ساتھ بہت ضروری ہے مذہب ایک طرح سے "آگاہی عاشقانہ" یا "عشق آگاہانہ" ہے یعنی یہاں عشق اور عقل کا چولی دامن کا ساتھ ہے عقل اور جذبہ کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا

اسلام میں بھی یہی صورت ہے بلکہ اسلام میں عقل اور عشق کا تعلق دوسرے مذاہب سے زیادہ گہرا ہے دینِ اسلام کی دو بڑی بنیادیں ہیں کتاب اور جہاد، کتاب علم ہے اور جہاد عشق، قرآن میں یہ تلاش کرنا بہت مشکل ہے کہ عقل و عشق (ایمان) کے درمیان خطِ فاصل کہاں ہے۔ قرآن شہادت کو زندگیٔ جاوید کہتا ہے اور ساتھ ہی قلم اور جو کچھ لکھا جائے (وما یسطرون) کی قسم کھاتا ہے پھر جہاں پیغمبرؐ کے رفیقوں کا ذکر ہے وہاں صدیقین اور صالحین کے ساتھ شہداء کا تذکرہ تو ہے مگر عابد، مجاہد اور مبلغ کا تذکرہ نہیں ہے۔

تشیع بالخصوص جیسا کہ اس کی تاریخ اور ثقافت سے ظاہر ہے عشق و جوش اور قربانی و شہادت کا مذہب ہے گرمیٔ احساس اور شعلۂ کردار کی تحریک ہے۔ اس کے باوجود تشیع کی اساس عقل و عرفان پر ہے یہ علم و عقل کا دین ہے یہ تاریخ انسانی میں ایک انوکھی انقلابی تحریک ہے جو شہیلی قربانیوں کے خون سے رنگین مگر عقلی اور علمی تحریک جس کی علامت اور جس کا سرچشمہ وہ ذات ہے جس کا نام علیؑ ہے علیؑ جو علم اور عشق کے باہمی اور متوازن امتزاج کا نام ہے

اور یہ حقیقت پرستی کا مذہب ہے اس لیے کہ حقیقت بغیر پرستش محض فلسفہ و دانش ہے (بے عمل فلسفہ) اور پرستش، بغیر حقیقت، ہوائے نفس کی غلامی ہے جس کا دوسرا نام بت پرستی ہے۔

اشک: شہادت عشق

تاریخ میں تشیعت کا نمود اور اس کی بقاء دو عناصر پر منحصر ہے ایک تو وہ

علماء اور مجتہدین جو علم و تحقیق کا مظہر ہیں جو اپنی فکر کی گہرائی کے ذریعہ اعتقادات کے باطنی مفہوم اور اس کے مکمل معنوں کا ادراک کر سکتے ہیں جو مذہب کی حقیقت اس کی روح اور اس کی صحیح سمت کی نگہبانی کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور فلسفہ و تصوف علم و ادب، زہد ریائی یونانی اور اشراقی فلسفہ و فکر کے حوالے سے دین میں جو گمراہیاں سر اٹھاتی ہیں ان کا تدارک کرتے ہیں۔

اور دوسرے وہ عوام ہیں جو مظہر ہیں وفاداری کا، جوش و جذبہ کا عشق و اخلاص کا جن کی حقیقت سے وفاداری اس قدر گہری اور پر جوش ہے کہ وہ علیؑ کے نام پر اور علیؑ کے مسلک کے تحفظ و بقاء کے لیے اپنی جانیں قربان کر دیتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ظلم و تشدد کے ان تمام ادوار میں جب حکومت کے لیے علیؑ کے دوستوں کا قتل عام کرنا ہنسی کھیل تھا وہ لب جو علیؑ کی مدح میں کھلتے تھے سی دیئے جاتے ہیں جب وہ خون جو علیؑ کی محبت میں جوش کھاتا تھا بہا دیا جاتا تھا تمام آزمائشوں اور خطرات کے باوجود عترت پیغمبرؐ کی محبت کا دم بھرا اس کی پاداش میں ان کے جسم سے ان کی کھالیں کھنچوا دی گئیں

اور آج بھی یہ گروہ عوام اس خاندان سے اسی طرح محبت رکھتا ہے اسی شد و مد سے دوستی کا دم بھرتا ہے خاندان پیغمبرؐ سے اس کی وفاداری میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی آج بھی ظلم و تشدد سے پر صدیوں کے گزرنے کے باوجود یہ وفا کار گروہ اس گھر کو چھوڑ کر کسی دوسرے قصر معبد یا محل کو اپنا قبلہ بنانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ یہ سب کے سب جناب فاطمہؑ کے سنگ در پر اپنے سرہائے عقیدت کو جھکائے ہوئے ہیں اس عالت میں کہ ان کے دل درد سے پر۔ ان کے لب معروف نالہ و فریاد اور ان کی آنکھیں اشکبار رہیں۔ یہ آنسو محبت کی وہ زبان ہیں جس کے ذریعے پاک دل اور وفادار لوگ اس گھر کے مکینوں سے اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار کرتے ہیں اور اس زبان سے زیادہ سچی، پاکیزہ اور بے ریا اور کون سی زبان ہو سکتی ہے کہ جس کا کلمہ نہ لفظ ہیں نہ

خطوط بلکہ جس کا کلمہ صرف اشک ہیں جس کی عبارت نالہ و فریاد ہے وہ نالہ و فریاد جو گہرے اور سچے عشق کی بے تابی اور شوق کی آئینہ دار ہے

کیا آنکھ زبان سے زیادہ سچی نہیں ہے کیا آنسو صداقت کا شاہکار نہیں ہیں؟ شعر کا حسن، عشق کی بے تابی، ایمان کا سوز و گداز شوق کی بے کلی، احساس کی تب و تاب جب کسی دل میں باہم گھل مل جاتے ہیں تو ایک قطرۂ گرم آنکھ سے ٹپک پڑتا ہے اس قطرۂ گرم کا نام ہے آنسو، آنسو جو محبت کی سب سے خالص اور کھری زبان ہے اور جو اظہار جذبات کا لطیف ترین پیرایہ ہے ہمارے عوام محبت کی اسی زبان کو استعمال کرتے ہیں اور وہ اس زبان کے استعمال سے خوب واقف ہیں۔

آپ اس بات پر تعجب نہ کریں کہ میں اس وقت 'گریہ' کے حق میں بول رہا ہوں جبکہ آپ نے بارہا مجھے اس گریہ پر تنقید کرتے ہوئے سنا ہے جس کا تعلق مجلسوں اور روضہ خوانی سے ہے لیکن میری ان دونوں باتوں میں باہم کوئی تضاد نہیں ہے منصوبہ بندی کرکے رونا اس گریہ سے بالکل مختلف ہے جو محبت کا ایک لازمی اور فطری تقاضا ہے۔ وہ لوگ جو رونے کو ایک رسمی فریضہ سمجھ کر انجام دیتے ہیں۔ ان کا رونا مصنوعی اور رسمی ہے اس کے برعکس میں اس وقت جس گریہ کے حق میں دلائل دے رہا ہوں وہ حقیقی اور فطری گریہ ہے جو جذبہ اور احساس کی روشنی اور عشق و اندوہ کا ایک لازمی اور فطری نتیجہ ہے

ریگی دی برے (REGI DEBRE) فرانس کے مشہور انقلابی ہیں جو آج کل لاطینی امریکہ میں سرگرم عمل ہیں انہوں نے کیا خوب کہا ہے کہ وہ انسان جو کبھی نہیں روتا اور جس کا دل ذوق گریہ سے عاری ہے اس میں درحقیقت انسانیت کی کمی ہے۔ وہ ایک پتھر ہے بے حس ایک روح ہے خشک اور وحشی

آنکھیں روتی ہیں اور دل فریاد کرتے ہیں اور یہ آنسو یہ نالہ و فریاد عشق کی شہادت دیتے ہیں ہر انسان جس کے پہلو میں دل ہے پتھر نہیں ہے غم سے

متاثر ہوتا ہے رفتہ رفتہ غم کا اثر گریہ کی تحریک کرتا ہے یہاں تک کہ اچانک گریہ گلوگیر ہو جاتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے جیسے دم گھٹ جائے گا ایسی حالت میں انسان اس بات پر مجبور ہے کہ وہ روئے اس کی آنکھیں اشکبار ہوں اور اس کے لب نالہ و شیون بلند کریں یہ گریہ جذبۂ عشق کی فطری اور سچی زبان ہے اس کے برعکس وہ مصنوعی رونا ہے جس کے لیے اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ جس کے لیے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی منصوبہ یا پروگرام بنایا جائے یہ گریہ ایک رسم ہے ایک طریقہ ہے ایک رسمی فریضہ ہے یہ کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ یہ حصول منفعت یا دفع مضرت کا وسیلہ ہے یہ اپنی خطاؤں کمزوریوں اور گناہوں کا کفارہ سمجھا جاتا ہے اور اس کے ذریعہ اپنی بداعمالیوں کا جواز فراہم کیا جاتا ہے میں نے ہمیشہ اس گریہ پر تنقید کی ہے اور میں اس وقت بھی اپنے موقف پر قائم ہوں۔

اگر کوئی عاشق اپنے معشوق کے ہجر کا شکار ہے۔ اگر کسی چاہنے والے کا دل اپنے کسی عزیز کی موت کے صدمہ سے سلگ رہا ہے تو اس کا رنج واندوہ اور گریہ و بکا ایک فطری امر ہے جب کبھی اس کے دل میں اپنے محبوب کی یاد آئے گی جب کبھی وہ زبان سے اس کا ذکر کرے گا اس کی روح عشق کی آگ میں تپنے لگے گی اور اس کا چہرہ محبت کے نور سے چمکنے لگے گا ایسی حالت میں آنکھیں بھی اس کے جذبات کی سچی ترجمانی کریں گی یعنی آنکھوں سے آنسو بے ساختہ ٹپکیں گے یہ گریہ ایمان کی گہرائی اور عشق کی سچائی کی نہایت لطیف اور واضح نشانی ہے۔

اب ذرا اس شخص کے متعلق سوچئے جو حرص و ہوا کا اسیر ہے، جو دولت شہرت اور عزت کے پیچھے دوڑ رہا ہے وہ اگر تاجر ہے تو صبح سے شام تک بازار میں سر کھپاتا ہے اور ہر جائز و ناجائز طریقے سے منافع کماتا ہے اور اگر کسی ادارہ کا کارکن ہے تو اپنے افسر کی خوشامد کرتا ہے لیکن اپنے ماتحتوں اور اہلِ

ضرورت کے ساتھ اس کا رویہ تکبر اور فرعونیت کا رویہ ہوتا ہے ایسا شخص شام کو اپنے کام سے فارغ ہو کر گھر لوٹتا ہے ہنسی خوشی کھاتا پیتا ہے چین کرتا ہے آرام کرتا ہے پھر دن ڈھلے سیر و تفریح کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے اور ہر طرح کی جائز و ناجائز تفریحات سے لطف اندوز ہوتا ہے ایسے میں اگر اسے خیال آتا ہے کہ آج کی تاریخ کی مناسبت سے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق اسے کسی اجتماع میں شرکت کرنا ہے تو وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس اجتماع میں شرکت کے لیے چلا جاتا ہے (ایسے اجتماعات عموماً مہینہ کی پہلی تاریخ کو ۷ سے ۹ بجے رات تک منعقد ہوتے ہیں) پھر وہ شخص اس اجتماع میں بیٹھ کر اپنے اوپر غم و غصہ کو طاری کرتا ہے قصداً نالہ و بکا کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اس کی آنکھیں اشکبار ہو جائیں پھر جب گریہ کا یہ پروگرام اور اس کی تمام رسمیں پوری ہو چکتی ہیں تو وہ آرام سے چائے اور قہوہ نوش کرتا ہے حقہ سے دل بہلاتا ہے اور ساتھ ہی اس خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ ان مراسمِ عزا میں شرکت کے ذریعہ اس نے اپنے ایمان اور عقیدہ کی بڑی خدمت کی ہے اس خوش فہمی کے نتیجہ میں وہ اپنے آپ کو روحانی طور پر ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے (جیسے اس کے تمام گناہ دھل گئے ہوں) لبعد ازاں ایک بار پھر وہ اپنے معمولات پر لوٹ جاتا ہے پھر مہینہ بھر دولت کے پیچھے سرگرداں رہتا ہے یہاں تک کہ دوبارہ پروگرام کے مطابق پھر وہی تاریخ آ جاتی ہے جب اسے مجلس گریہ میں شرکت کرنی ہے پھر وہ اس پروگرام میں شرکت کرتا ہے اس طرح اس کی زندگی کا کاروبار اس کے تمام معمولات اور رونے کا پروگرام ساتھ ساتھ چلتے ہیں، بلکہ گریہ کا پروگرام اس کے معمولات ہی کا حصہ بن جاتا ہے کیا آپ کسی ایسے شخص کو سچا عاشق مان سکتے ہیں؟ کیا آپ کسی ایسے انسان کی نالہ و شیون پر اعتبار کر سکتے ہیں کیا رسمی آنسوؤں کو حقیقی محبت کا مظہر سمجھا جا سکتا ہے؟

محبوب کی معرفت کے بغیر اس کے لیے رونا، اس کے ایمان اور جذبہ کی

حرارت کو اپنے دل میں محسوس کئے بغیر اس کے لیے نالہ فریاد کرنا محبوب سے عہدِ وفا کی علامت نہیں ہے یہ رونا ایسا ہی ہے جیسے خس و خاشاک سے پاک کرنے کے لیے آنکھیں دھولی جائیں۔

مت بھولئے کہ امام حسینؑ کی عظیم مصیبت پر جس شخص نے سب سے پہلے گریہ کیا وہ عمر ابن سعد تھا۔

اور یہ بھی مت بھولیے کہ اس طرح کے جھوٹے رونے پر جس شخصیت نے سب سے پہلے ملامت کی وہ جنابِ زینبؑ تھیں۔

اور یہ بات بھی یاد رکھئے کہ امام حسینؑ کے لیے جو پہلی رسمی اور دکھاوے کی مجلس برپا ہوئی اس کا محل وقوع دربار یزید تھا۔ لیکن ہمارے عوام کا گریہ "گریۂ عاشقانہ" ہے یہ اس گہری اور سچی محبت کی زبان ہے جس سے ہمارے دل لبریز ہیں اس محبت اور عقیدت کا مرکز خانۂ علیؑ و فاطمہؑ ہے یہ گھر ہمارے لیے یونانیوں کے پانتیون (PANTHEON) اور اولمپیا کی طرح بلکہ اس سے زیادہ مقدس اور متبرک ہے یہ ہمارے ناخداؤں کا مسکن ہے جو خدا کی مختلف صفات کے مظہر اور اس کی نشانیاں ہیں۔ یہ ناخدا صرف اشکوں کی زبان سمجھتے ہیں۔ یہ آنسوؤں کے علاوہ کسی اور زبان سے واقف نہیں ہیں اور ہمارے عوام نہ فلسفی ہیں نہ عالم وہ صرف محبت کرنے والے ہیں۔ عاشقانِ صادق جو اپنے محبوب کے لیے اپنی جانیں فدا کرنے کے لیے تیار ہیں وہ اشکوں کی زبان بولتے ہیں۔

تمام تاریخ میں کسی مذہب و ملت کا سرمایہ ایسا خاندان نہیں ہے۔ وہ خاندان جس میں باپ علیؑ ہے ماں فاطمہؑ ہے بیٹے حسنؑ اور حسینؑ ہیں اور بیٹی زینبؑ ہے اور یہ سب لوگ، یہ سب یگانۂ روزگار افراد۔ ایک ہی وقت اور ایک ہی زمانے میں ایک ہی مکان کی چھت کے نیچے رہتے تھے یہ سب مل کر ایک اکائی تھے۔ ایک گھر، ایک خاندان کی اکائی۔

ہماری قوم نے اس گھر، (جنابِ فاطمہ کے گھر) کے خس و خاشاک سے ایک

تہذیب تعمیر کی ہے ایک ثقافت کو تراشا ہے۔ یہ گھر ایک تاریخ کا سرچشمہ ہے۔ وہ تاریخ جو نیکی اور پاکیزگی کی تاریخ ہے جو جوش عمل، جذبۂ ایثار و استقامت، شجاعت اور فضیلت کی تاریخ ہے۔ یہ تاریخ وقت کے افق پر محیط ہے یہ پاک و صاف پانی کا وہ زندگی بخش دریا ہے جو صدیوں سے ہمارے عوام کی روح کو سیراب کر رہا ہے اور ہنوز ہمارے وجدان اور احساس میں جاری و ساری ہے

تمام انسانی تاریخ میں یہ وہ واحد ملت ہے جو مستقل اپنے محبوب خاندان کے غم کو سینے سے لگائے ہوئے ہے تمام روئے زمین پر یہ وہ واحد ملت ہے۔ جو ان ہستیوں پر ڈھائے گئے مظالم کی یاد میں جو اس کے ایمان اور آزادی کی علامت تھیں دل گرفتہ اور غم زدہ ہے اور اس کا یہ غم و اندوہ تاریخ کے طویل عرصہ پر پھیلا ہوا ہے زمانہ کی گردش اس غم کو دبایا مٹا نہیں سکی اور حکومتوں کے جبر و استبداد نے اس گھرانے کی فضیلت کو گھٹانے اور اس کی حقیقت کو چھپانے کی جو کوششیں کیں ان کے باوجود یہ ملت اس گھر کی محبت اور عقیدت کو سرمایۂ حیات بنائے ہوئے ہے اور اس کے مکینوں کے آلام و مصائب کی یاد میں دل گرفتہ اور اشک فشاں ہے نہ ہمارا غم گھٹ سکا ہے نہ ہماری محبت میں کمی آئی ہے اور نہ ہمارے آنسو تھمے ہیں۔

لیکن یہ عشق 'عقیم' ہے۔ بانجھ ہے، بے نتیجہ ہے۔ ان اشکوں کی مثال اس بارش کی سی ہے جو کسی شور زمین پر برستی ہے اس دشت میں نہ گھاس اگتی ہے نہ پھول کھلتے ہیں اور ہمارا تمام جذبۂ فداکاری، ہماری عقیدت کا تمام سرمایہ، ہمارا تمام جوش و خروش، ہماری تمام توانائی اور ہماری تمام کوششیں بظاہر بے نتیجہ ہیں، بے ثمر ہیں۔ ان سے ہماری زندگی میں کوئی انقلابی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ مگر کیوں؟

باب دوم

تقصیر کس کی ہے؟

اگر ہمارا عشق عقیم، اور ہمارے اشک بے ثمر ہیں تو قصور کس کا ہے؟

قصور وار علماء ہیں کہ جو عوام کی رہنمائی کے فریضہ کو صحیح طور پر انجام دینے سے معذور نظر آتے ہیں۔ یہ ذمہ داری علماء کی ہے کہ وہ عوام کے شعور کی تربیت کریں انہیں خود آگاہی اور ذمہ داری کا احساس پیدا کریں اور ان کی جدوجہد کے لیے صحیح سمت متعین کریں۔

ہماری عقل و دانش کی اعلیٰ ترین صلاحیتیں، ہماری فہم و فراست کا بہترین سرمایہ، فلسفہ، کلام، تصوف، فقہ و اصول، ادبیات و معنی بیان و بدیع اور صرف و نحو جیسے کاموں کے لیے وقف ہیں اور سالہا سال کے تحقیق و تفکر اور علمی ریاضت اور مشقت کا بعد اس کا نتیجہ محض ایک "رسالہ عملیہ" کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جس میں صرف آداب طہارت، نجاستوں کی اقسام عورتوں کی طہارت کے مسائل اور شکیات نماز جیسے موضوعات کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔

جہاں تک کہ عوام میں آگاہی پیدا کرنے کا تعلق ہے جہاں تک لوگوں کے شعور کی تربیت کا سوال ہے لوگوں کو مذہب کی حقیقت اور اس کے فلسفہ اور احکام سے روشناس کرانے کی ذمہ داری ہے ہمارے علماء اس ذمہ داری کی طرف توجہ نہیں کرتے یہ علماء لوگوں کو پیغمبرؐ کی سنت اور امامت کی حقیقت

اور معنویت اہل بیت کی معرفت ، انقلاب کربلا کی معنویت اور تشیع کی تحریک کی فکری اور عملی بنیادوں سے آگاہی کا فرض پورا نہیں کرتے۔ جیسے ان علماء اور مجتہدین کے خیال میں یہ سب باتیں ان کے شایانِ شان نہیں ہیں بلکہ یہ ان کم علم لوگوں کے فرائض ہیں جن میں اتنی عقلی استعداد نہیں تھی کہ وہ مجتہد کے بلند درجہ پر فائز ہو سکتے۔ نتیجہ یہ کہ ہم نے عوام میں ذمہ داری اور مسئولیت کو بیدار کرنے کا کام دوسرے درجہ کے علماء کے سپرد کر دیا ہے۔

یہی سبب ہے کہ "معرفت اہل بیت" اور حقائق اسلام کی تبلیغ کا کام مدارس قدیم کے ان طلبہ کے ہاتھ میں آگیا ہے جو علمی اعتبار سے کوئی قابلِ ذکر حیثیت نہیں رکھتے ہمارے نوجوان جب علوم اسلامی کی تحصیل کے لیے دینی مدارس میں داخل ہوتے ہیں تو ان میں جو اعلیٰ ذہنی اور فکری صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں وہ سالہا سال کی محنت اور مشقت کے بعد 'مجتہد' یا 'فقیہ' بن جاتے ہیں یہ وہ علماء ہیں جو حوزۂ علمیہ میں محصور ہو کر عوام سے کٹ جاتے ہیں۔ وہ طلباء جو منصب اجتہاد کے اہل نہیں سمجھے جاتے۔ جن کی ذہنی صلاحیتیں نسبتاً پست ہوتی ہیں لیکن جنہیں قدرت نے حسین اور جوشیلی آواز دی ہے اور اور جو تقریر اور خطابت کے فن میں آگے بڑھ سکتے ہیں انہیں مجبوراً معاشرہ میں دین کی تبلیغ و ترویج کا فرض سونپ دیا جاتا ہے ایک تیسرا گروہ بھی ہے جو ہر دو قسم کی صلاحیتوں سے عاری ہے وہ نہ ذہنی استعداد میں بلند ہے اور نہ فن خطابت سے واقف یہ گروہ تیسرا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔ یہ چپ سادھ لیتا ہے گنگ ہو جاتا ہے تقدس کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے یہ گروہ موقع اور مصلحت کے لحاظ سے کبھی مجتہدین کے حلقہ میں نظر آتا ہے اور کبھی مبلغین کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔

ان حالات میں آپ خود انصاف کیجئے کہ عوام کی تقدیر کا کیا حال ہوگا مذہب اور اس کی حقیقت پر کیا گزرے گی؟ اس بات پر بہت زیادہ تفکر اور تدبر کرنے

کی ضرورت نہیں ہے یہ تو سامنے کی بات ہے وہ یہ حقیقت ہے جسے ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔

کیا سبب ہے کہ وہ ملت جو ایمان وعشق کی دولت سے مالا مال ہے جس کے پاس قرآن ہے۔ نہج البلاغۃ ہے۔ علیؑ اور فاطمہؑ جیسی شخصیتیں ہیں حسینؑ اور زینبؑ جیسے کردار ہیں جس کی تاریخ روشن ہے مگر جس کی تقدیر سیاہ ہے اس قوم کا مذہب اور ثقافت، شہادت ہے مگر یہ قوم پھر بھی مردہ ہے کیوں؟

جون آف آرک کا تعلق فرانس سے تھا وہ ایک حساس لڑکی تھی جو خواب وخیال کی دنیا میں رہتی تھی اس نے خواب دیکھا تھا وہ فرانس میں بادشاہت کے استحکام کے لیے قیام کرے۔ مدتوں فرانس کے دانشور اور چوٹی کے روشن فکر اس تخیلاتی لڑکی کے کردار سے آزادی، ایثار اور انقلابی خیالات کی حرارت حاصل کرتے رہے۔

اب آپ جناب زینبؑ کے متعلق غور کیجیے کہ جنکی ذمہ داری ایک لحاظ سے امام حسینؑ کی ذمہ داری سے بھی زیادہ سنگین تھی انہوں نے امام حسینؑ کی شہادت کے بعد پیغام حسینؑ کی اشاعت کی ذمہ داری کو پورا کیا ان کے علیؑ ہاتھوں میں کربلا کا انقلابی پرچم ہے اور انہوں نے اس پرچم کو بلند رکھا ایسی حالت میں جب جھوٹ، مکر، فریب اور ظلم کا نظام اس پرچم کو سرنگوں کرنے کے درپے تھا جب انقلاب کے تمام پیرو مرچکے تھے اور گروہ سابقین سے تعلق رکھنے والے مسلمان تک حیرت کا شکار تھے ایسی حالت میں علیؑ کی بیٹی زینبؑ نے ان ہاتھوں میں جو علی کی طرح مضبوط تھے انقلابی پرچم کو اٹھائے رکھا مگر ہم نے اس کردار کو کس طرح پیش کیا ہے۔ ہمارے نزدیک جناب زینبؑ کی حیثیت محض ایک ایسی بہن کی ہے جس کا واحد کام یہ تھا کہ وہ اپنے بھائی کے غم میں نوحہ وفریاد کرتی رہے۔!!

میں ایک ایسی صدائے فریاد سن رہا ہوں جو غم وغصہ کی آواز ہے اس آواز

کے مخاطب وہ علماء اور دانشور ہیں جو عوام کے شعور کی تربیت کے ذمہ دار ہیں جو اسلام محمدؐ اور تشیع علیؑ کی تشریح و تبلیغ کے ذمہ دار ہیں مجھے نہیں معلوم کہ یہ صدائے خشمگیں "حلقوم علیؑ" سے آرہی ہے یا محروم بشعور عوام کے لاشعور کی گہرائیوں سے بلند ہورہی ہے۔

یہ آواز سوال کر رہی ہے کہ یہ تم کن کاموں میں مشغول ہو کن باتوں میں پڑے ہوئے ہو آخر تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ تم اپنی ذمہ داری پوری کیوں نہیں کرتے تم حق بات کیوں نہیں کہتے اس تمام طویل عرصہ میں تم کوئی ایک ایسی کتاب نہیں لکھ سکے جو یہ بتا سکے کہ قرآن کا پیغام کیا ہے اس کے بجائے تم عشق مولا کے نام پر مدح و ثناء قصیدہ و نوحہ کے انبار لگائے جاتے ہو تم نے عوام کے درمیان علیؑ کو لب بستہ کر دیا ہے وہ لوگ جو فارسی جانتے ہیں اس بات کو کیسے سمجھ سکتے ہیں کہ علیؑ کا پیغام کیا ہے (اس لیے کہ یہ عربی ہے اور فارسی دانوں کے لیے اس کا فارسی ترجمہ ضروری ہے (LAMARTINE -) لامارتین جو فرانس کا رومانیت پسند مصنف ہے اس کی تمام کتابیں فارسی میں ترجمہ ہو چکی ہیں اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ یونان کی زن فاحشہ بلیتیس کے تمام اشعار کا فارسی میں نہایت خوبصورت ترجمہ موجود ہے لیکن علیؑ کا ایک خطبہ یا ان کا ایک قول بھی فارسی میں ترجمہ نہیں ہوسکا۔

آخر یہ کیا ماجرہ ہے کہ ان آئمۂ اطہار کے بارے میں جن کی کرامات اور معجزات کا ہم ہر وقت ذکر کرتے رہتے ہیں ان کے یوم ولادت اور یوم وفات پر جشن یا مجلس عزا منعقد کرتے ہیں ہمارے پاس کوئی ایک معتبر کتاب نہیں ہے کوئی ایک کتاب ایسی نہیں جو ان کی سیرت اور حالات کی شرح میں لکھی گئی ہو اس بات کا کیا جواز ہے کہ وہ ملت جو علیؑ کی شیعہ اور ان سے محبت کرنے والی ہے اس کے پاس کوئی ایک رسالہ یا کتاب ایسی نہیں ہے جو یہ بتا سکے کہ علیؑ کون تھے، فاطمہؑ کون تھیں۔ ان دونوں کی سیرت و کردار کے خدوخال کیا تھے وہ اور ان کی اولاد کس طرح

رہتے تھے ان کی سوچ کیا تھی ان کا قول اور عمل کیا تھا ہمارے پاس ان، موضوعات پر کوئی ایک تصنیف نہیں ہے۔

ہمارے عوام کہ جن کی تمام زندگی آئمہ کی محبت کے لیے وقف ہے جو ان کے مصائب پر رونے کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں۔ جن کی زندگی کے ماہ وسال ان آئمہؑ کی محبت ان کی مدح و ثناء اور ان کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے وقف ہیں جو اس کام کے لیے اپنا وقت اور اپنی دولت دونوں خرچ کرتے ہیں جو ان اماموںؑ سے ہر طرح خلوص و عقیدت رکھتے ہیں مگر ان کے متعلق کچھ جانتے نہیں۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جن کی زندگی کا ہر رخ ان کی ہر حرکت اور سکون ان کا تکلم ان کا سکوت ان کی آزادی ان کی گرفتاری غرض ان کی تمام زندگی لوگوں کے لیے نمونۂ حیات ہے پیغام آگہی ہے، عزت آزادی اور احترام انسانیت کا سبق ہے مگر ہم ان زندگی بخش اور انسانیت طراز ہستیوں کے بارے میں کیا جانتے ہیں بس اس قدر کہ فہرستِ امامت میں کس شخصیت کا نام کس شمار پر ہے

اگر ایک شخص روزِ عاشورہ اپنے سر و تن پر تلوار کے زخم لگاتا ہے امام حسینؑ کے نام پر زخموں کی تکلیف میں بھی راحت محسوس کرتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ امام حسینؑ کی صحیح معرفت نہیں رکھتا یا کربلا کی معنویت کو اچھی طرح نہیں سمجھتا تو قصور کس کا ہے۔

اگر ایک عورت اپنے وجود کی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ جناب فاطمہؑ و جناب زینبؑ کے نام پر گریہ کرتی ہے۔ ان ہستیوں کی یاد اس کی رگ و پے میں رچی ہوئی ہے اور اس یاد سے اس کے خون میں حرارت کی لہر دوڑ جاتی ہے جسے اگر اس بات کا اعتبار ہو کہ اس کی جان ان بزرگ ہستیوں کے کسی کام آسکے گی تو وہ ان کے نام پر اپنی جان کا نذرانہ بصد خلوص و عقیدت پیش کرنے کے لیے تیار ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ ان عظیم ہستیوں کی حقیقت سے واقف نہیں ہے ان کے احوال سے بے خبر ہے اور ان کے اقوال کا علم نہیں رکھتی تو

ایسا کیوں ہے اگر جناب فاطمہؑ کے متعلق اس کی معلومات صرف اتنی ہیں کہ ان کے پہلو پر ان کے گھر کا دروازہ گرایا گیا ہے اور اگر جناب زینبؑ کے بارے میں اس کا علم محض صبح عاشور سے عصر عاشور تک محدود ہے وہ ان کے بارے میں صرف اس قدر جانتی ہے کہ وہ ایک مظلوم اور غمزدہ عورت تھیں جسے اپنے بھائی کی لاش کو تلاش کرنے کے لیے خیمہ سے نکلنا پڑا اور اس کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتی۔ وہ پیغام حسینؑ کی تبلیغ و اشاعت کے بارے میں ان کے کردار سے ناواقف ہے وہ عصر عاشور کے بعد انہیں گم کر دیتی ہے تو اس میں قصور کس کا ہے

اور اگر اس مرد عقیدت مند کا با شعور اور تعلیم یافتہ بیٹا اور اگر اس زنِ خوش عقیدہ کی پڑھی لکھی اور روشن فکر بیٹی یہ سوال کرتے ہیں کہ آخر یہ مذہب گریہ و عزاداری یہ دینِ نوحہ و بکا ہمارے کس کام کا ہے؟ آخر فاطمہؑ حسینؑ اور زینبؑ کی محبت اور ان کی یاد میں گریہ و بکا ہماری قوم کے جو غلام اور پسماندہ ہے اور جسے آگاہی اور آزادی دشمن قوتوں سے مقابلہ کرنے کی توانائی کی ضرورت ہے، کس کام آتی ہے۔ اگر ہماری نسل کے دماغ ان سوالوں کے بارے میں صاف نہیں ہیں تو قصور کس کا ہے۔

اور اگر وہ روشن فکر اور آزادی پسند طبقہ جو عوام کی محرومی اور پسماندگی پر رنجیدہ ہے۔ جو عوام میں بیداری اور جوشِ عمل کا خواہاں ہے جو اپنے اجتماعی حالات کو تبدیل کرنا چاہتا ہے مگر جو اپنے مذہب اور تاریخ سے آگاہ نہیں ہے جو (اپنے ماحول سے متاثر ہو کر) اسلام کو مدینہ، خانۂ فاطمہؑ شہادت گاہِ حسینؑ اور کاروانِ زینبؑ سے اخذ کرنے کی بجائے اسے اصفہان، تہران مشہد اور قم میں تلاش کرتا ہے اور عزاخانوں، تکیوں اور خانقاہوں کو دین کا مرکز سمجھتا ہے وہ یہ اعتراض کرتا ہے کہ ہمارے طبقۂ نسواں کے لیے جو محرومی جہالت اور پسماندگی کا شکار ہے اور جسے آزادی آگاہی اور بصیرت کی ضرورت ہے آخر یہ مذہب جو بظاہر ماضی کا افسانۂ غم ہے اور جو صرف تاریخ

کے گزرے ہوئے واقعات پر نفرت اور ملامت کا اظہار ہے اور جو صرف جذبات محبت نفرت کے رسمی اظہار کا مجموعہ ہے کس مرض کی دوا ہے یہ ہمارے کس دکھ کا مداوا کرتا ہے یہ ہماری عملی زندگی پر کیا اثرات مرتب کرتا ہے تو قصور کس کا ہے؟ بات یہ ہے کہ ہم نے دین کو محض قصۂ ماضی سمجھ لیا ہے اور حال سے اس کا رشتہ توڑ لیا ہے۔ ہم محض ماضی کے چند واقعات کی یاد منا کر مطمئن ہو جاتے ہیں اور ان واقعات میں جو درس عمل اور پیغام انقلاب ہے اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں ہم نے مذہب کو واقعات و حوادث کا مجموعہ بنا دیا ہے ایسے واقعات و حوادث جو صرف ماضی سے متعلق ہیں اور جو ہمارے موجودہ حالات کو بدلنے کے لیے کوئی تحریک فراہم نہیں کرتے اس سے بھی بڑھ کر سنگین اور افسوسناک بات یہ ہے کہ ہم نے ماضی کی یاد کو حال کو فراموش کرنے کا ذریعہ بنا لیا ہے ہمارا مذہب ہمیں موجودہ حالات سے بیگانہ بنا کر ہماری تمام توجہ ماضی کے ان واقعات کی طرف منعطف کر دیتا ہے جو صدیوں قبل ایک اجنبی اور بیگانہ سرزمین پر رونما ہوئے ہیں۔ ہم اپنے دور میں ہونے والے ظلم و ستم سے غافل ہیں۔ ہم اجتماعی ذمہ داریوں کو محسوس نہیں کرتے۔ ہمارا معاشرہ غلامی کے طوق میں جکڑا ہوا ہے لیکن ہم اپنی گردن میں اس طوق کی سختی اور ایذا محسوس نہیں کرتے ہمارا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ ہم ماضی کے واقعات پر غم و غصہ کا اظہار کرتے ہیں۔ ہم جب یہ سنتے ہیں کہ خلیفہ نے ایک بیمار کی گردن کو طوق میں جکڑ دیا تھا تو ہمارا خون کھولنے لگتا ہے ہم اپنی تلوار کو بے نیام کرتے ہیں لیکن اس کا ہدف خود ہمارا سر ہوتا ہے۔ ہم خود کو زخمی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم پر از خود رفتگی اور بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے پھر اس کے بعد ہمارا دل مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس طرح ہمارے تمام گناہ دھل گئے تمام خطائیں معاف ہو گئیں۔ ہمارے شانوں سے تمام ذمہ داریوں کا بوجھ اتر گیا۔ ہم اس خوش فہمی کا شکار ہوتے ہیں کہ اس "مختصر عمل جراحی" کے ذریعہ ہم نے

عدل الٰہی کے قانون کو بدل دیا ہم نے مکافاتِ عمل کی میزان کو منقلب کر دیا اس خون کے ساتھ جو ہمارے سر سے بہا ہے ہمارے نامۂ اعمال کی تمام سیاہی دھل گئی۔ اب ہمارے گناہ خواہ ان کا شمار آسمان کے ستاروں، دریا کی موجوں اور صحرا کے ریت کے ذروں سے بھی زیادہ ہو یکسر معاف ہو گئے۔ اب ہم ایسے ہو گئے جیسے کہ وہ طفل جو ابھی رحمِ مادر سے برآمد ہوا ہو۔ نہ صرف یہ کہ ہمارے گناہ معاف ہو گئے بلکہ شاید یہ بھی کتاب اللہ اور رسولؐ پر ہمارا احسان بھی ہو گیا۔ یہی وہ غلط اندازِ نظر ہے جس کی وجہ سے ہم نے اپنے مذہب کو جو لوگوں کو شعور آگہی کا پیغام دیتا ہے ان میں ذمہ داری اور مسئولیت کا احساس پیدا کرتا ہے، جو امر بالمعروف، نہی عن المنکر، جہاد و شہادت، ایثار و انفاق اور قیامِ عدل و تردیدِ ظلم سے عبارت ہے ایک ایسے مجموعۂ رسوم میں تبدیل کر لیا ہے جس کے معنی گریہ و بکا نالہ و شیون، توسل و تقیہ، بے معنی انتظار، بے اصولی شفاعت اور بے مقصد تعریف و تحسین اور طعن و نفرین بن کر رہ گئے ہیں۔ ہمارے نزدیک ہمارے آئمہ کا کام فقط اتنا ہے کہ وہ دوسری دنیا میں ہماری دستگیری کریں ہمیں عذابِ جہنم سے بچائیں ہمارے گناہوں کو بخشوائیں اور ہماری شفاعت کریں ہم ان آئمہ ہدایت سے اپنی دنیا اور دنیاوی زندگی کی اصلاح کے لیے کوئی سبق نہیں لیتے نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے عوام کمزوری، درماندگی اور بیچارگی کا شکار ہیں اور اسی کو اپنی تقدیر سمجھ کر مطمئن ہیں وہ غفلت کا شکار ہیں وہ ظلم و ستم کو سہتے ہیں اور اس کے خلاف آواز بلند کرنے کی ضرورت سے غافل ہیں۔ وہ ذلیل ہیں، پسماندہ ہیں، کمزور ہیں وہ اپنے حالات کو بدلنے کے لیے کوئی اقدام نہیں کرتے وہ ہر عمل اور ہر اقدام سے مایوس اور بے نیاز ہیں۔ مگر اس صورتِ حال کی ذمہ داری کس پر ہے قصور کس کا ہے؟

اگر ہمارے عوام کا عقیدہ یہ ہے کہ صرف "حبِ علیؑ یا ولایت علیؑ" کا ایسا اعتقاد جو معرفت اور عمل سے تہی ہے کوئی ایسی کیمیائی تاثیر رکھتا ہے کوئی

ایسا جادو ہے جو برائیوں کو نیکیوں میں تبدیل کر دیتا ہے اگر ان کے نزدیک آیۂ قرآنی " ان کی برائیاں (سیّات) نیکیوں (حسنات) میں تبدیل کر دی جائیں گی " کا مفہوم یہ ہے کہ خواہ انسان اس دنیا میں کتنے ہی گناہ کرے قیامت میں اس کی یہ برائیاں اچھائیاں بن جائیں گی۔ با الفاظِ دیگر اگر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خواہ انسان اس دنیا میں کتنے ہی گناہ کرتا ہے محض حبِ علیؑ قیامت میں اس کے لیے ثواب اور بخشش کی ضمانت ہے تو اس میں قصور کس کا ہے؟

اگر ولایت و امامت علیؑ کا عقیدہ۔ جو صدیوں سے ایک عظیم انقلابی تحریک کی علامت ہے ایک ایسی تحریک جو قیام عدل و آزادی اور ظلم و استبداد کے خلاف جنگ اور جہاد کی تحریک ہے جو درحقیقت لوگوں کے لیے آگاہی اور بیداری کا پیغام ہے آزادیٔ مساوات، انصاف اور احترام انسانیت کا پیغام ہے جو ایک کامل فرد اور ایک صالح معاشرے کے قیام کے لئے جدوجہد کا پیغام ہے جو استبداد، استحصال اور طبقاتی تضاد کو رد کر کے ایک ایسے معاشرے کے قیام کی دعوت دیتا ہے جس کی بنیاد عدل و احسان پر ہو۔ ولایت و امامت علیؑ کا عقیدہ جو نکر و عمل میں انقلاب برپا کر کے فرد اور معاشرے کی حالت بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن ہم اس عقیدہ کے انقلابی ثمرات سے محروم ہیں اور اگر ہم نے علیؑ اور فاطمہؑ اور دیگر آئمہ کی پیروی کی قدر و قیمت اس کے اثرات و ثمرات کو اس دنیا کی بجائے صرف آخرت سے متعلق سمجھ رکھا ہے بالفاظ دیگر اگر ہم نے امامت کے دائرہ کار اور اس کے اثرات کو اس دنیا کی بجائے اس دنیا میں منتقل کر دیا ہے اپنی زندگی سے اس کا تعلق ختم کر کے اسے صرف حیات بعد الموت کے مسائل تک محدود کر دیا ہے تو اس میں قصور کس کا ہے؟

اگر ہمارے آباؤ اجداد نے اپنی زندگی، اپنے حالات، اپنے طریقۂ فکر اور اپنے معاشرے کو بدلنے میں اس خاندان کی حیات کے زندگی بخش اور انقلاب آفرین اثرات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا اور اگر ہماری جدید نسل اس بے عملی اور

بے اثری سے بددل ہو کر مذہب سے مایوسی اور اس عظیم خانوادہ سے بے تعلقی کا شکار ہو رہی ہے تو قصور کس کا ہے؟

خلاصہ یہ ہے کہ اگر ہمارے اہلِ فکر و نظر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ اگرچہ کہ مسلم معاشرہ ہے ایک ایسا معاشرہ ہے جو ولایت علیؑ امامت ائمہ اطہار اور مودتِ خانوادۂ رسولؐ پر اعتقاد رکھتا ہے لیکن اس کے باوجود بہت سے دیگر معاشروں سے خواہ وہ مسلم معاشرے ہوں یا غیر مسلم خواہ ولایت علیؑ پر اعتقاد رکھتے ہوں یا منکرینِ امامت و ولایت ہوں خواہ وہ مادی معاشرے ہوں یا غیر مذہبی معاشرے، تمدن، ثقافت مادی معیارِ زندگی کے اعتبار سے پست تر ہے تو اس اعتراض کا جواب کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بعض دیگر معاشرے بھی، بیرونی استعمار، تاریخی استبداد اور دیگر عوامل انحطاط کی زد پر رہے اور بعض حالات میں یہ عوامل نسبتاً زیادہ گہرے اور زیادہ شدید تھے لیکن باوجود اس کے کہ وہ حبِ علیؑ عزاداریٔ حسینؑ انتظارِ امامؑ، موحد اور فقہ جعفری کے اصولوں سے ناآشنا اور بے بہرہ تھے مگر انہوں نے ان منفی اور عوام دشمن طاقتوں کا مقابلہ زیادہ ہمت اور جرأت سے کیا اور وہ عدل و انصاف اجتماعی اور نیکی اخلاق، انسانی آزادی اور احترام، تلاشِ حقیقت اجتہادِ علم، پاکیزگیٔ فکر و نظر غرض انفرادی اور اجتماعی زندگی کی ہر سطح پر ہم سے بہتر نظر آتے ہیں وہ جہادِ زندگی میں کامیاب اور تعمیر و ترقی کی راہ میں ہم سے آگے ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ ہماری پستی اور درماندگی میں قصور کس کا ہے؟

باب سوم

مسائل کا تجزیہ

اصل خامی کہاں ہے؟

اگر ہماری ملت ولایت وامامت علیؑ کی معتقد اور خانوادۂ رسولؐ سے محبت کی دعویدار ہونے کے باوجود ذلت اور مسکنت کا شکار ہے تو اس میں قصور کس کا ہے؟ اصل خامی کہاں ہے؟

— کیا یہ پاک اور بزرگ خانوادہ بے فیض و اثر ہے؟

— یا ہماری نئی نسل کے روشن فکر طبقہ نے معاملات کا غلط تجزیہ کیا ہے

— یا ہمارے مذہبی عوام نے اپنے فرائض کی بجا آوری میں کوتاہی کی ہے!

علیؑ حقیقت کا بروشن ترین مظہر ہیں وہ اپنی ذات میں ایک ادارہ ہیں۔ ایک مکتبِ فکر ہیں۔ وہ انسانیت کے تصوّر کمال اور ارتقار کی تجسیم ہیں۔

وہ ایک اساطیری واقعیت ہیں ایک دیومالائی سچ ہیں۔

وہ ایک ایسے انسان ہیں جیسا کہ ایک مثالی انسان کو ہونا چاہیئے مگر جیسے مثالی انسان واقعیت کی دنیا میں ہوا نہیں کرتے۔

اور ان کی زوجہ فاطمہؑ ایک آئیڈیل (مثالی) عورت کا نمونہ ہیں، کامل اور پاکیزہ ترین نمونہ۔ یہ ارتقار کی وہ آخری ممکنہ حد ہے جس تک ایک مثالی عورت پہنچ سکتی ہے مگر جس تک رسائی کسی دوسری عورت کے لئے ممکن نہیں ہے۔

اور حسینؑ اور زینبؑ ایسے مثالی بہن اور بھائی ہیں جو تاریخ میں ایک بے مثال انقلاب کی علامت ہیں ایک ایسا انقلاب جس نے ظلم و استبداد اور مکر و فریب کو رسوا اور ذلیل کر کے انسانیت کی حرمت اور آزادی کا پرچم سر بلند کیا

یہ گھر یہ علیؓ اور فاطمہؑ کا گھر در حقیقت 'کعبہ' ہے جہاں ابراہیمؑ کی ، اولاد اور ان کے وارث مقیم ہیں کعبہ ایک علامت ہے اور یہ گھر ایک حقیقت ۔ وہ گھر پتھروں کی عمارت ہے یہ گھر انسانوں سے عبارت ہے اس گھر کے گرد صرف مسلمان طواف کرتے ہیں لیکن یہ گھر ہر اس دل کا کعبہ ہے جو انسانیت کے حسن اور جمال سے محبت رکھتا ہے جو انسانیت کی نجات کے لیے آزادی، عدالت عشق ، اخلاص، تقویٰ اور جہاد کی قدروں پر یقین رکھتا ہے اور جو اصول شہادت کو انسانیت کی زندگی کی ضمانت سمجھتا ہے ۔

آیئے اس تصویر کا دوسرا رخ دیکھیں تاریخ کے اس تمام طویل عرصہ میں وقت کی اس دشوار اور آشفتہ مسافت میں جب تاریخ شہنشاہوں کا دم بھرتی نظر آتی ہے جب تمدن و ثقافت ، ادب و ہنر، علم و دانش اور مذہب و سیاست بادشاہوں اور ان کے محلات کے گرد چکر لگاتے نظر آتے ہیں ہمارے باشعور وفادار اور فضیلت شناس عوام ہمیشہ اس گھر کی حرمت اور عظمت کے معترف نظر آتے ہیں اور وہ اس خانوادہ سے جسے محروم و مظلوم بنا دیا گیا ہے اور جو مکر و فریب کا شکار رہا ہے ایک ایسی وابستگی اور عقیدت کا اظہار کرتے رہے ہیں جو نا قابل شکست ہے جو دائمی اور ابدی عہد وفا ہے وہ اپنی تمام آرزوئیں اور خواہشات ، ایمان اور جذبہ ، فکر و نظر غرض اپنا تمام سرمایۂ حیات ان ہستیوں پر نچھاور کرتے رہے ہیں اور آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ لوگوں کی زبانیں ان کی مدح و ثنا میں مشغول، ان کے دل ان ہستیوں کی یاد میں بے تاب اور ان کی آنکھیں ان کے غم میں اشکبار ہیں اور وہ اپنے آئمہ کے نام پر جان و مال کی کسی قربانی سے دریغ نہیں کرتے ۔

ذرا دیکھئے تو سہی کہ یہ بھوکے اور غریب عوام اپنے محبوب خانوادہ کے ایک ایک فرد سے عقیدت اور محبت کے اظہار کی نشانی کے طور پر کیا کچھ نہیں کرتے رہے اور کیا کچھ کرنے پر آمادہ نہیں ہیں آخر اس راہ میں انہوں نے کون سا دقیقہ فروگذاشت کیا ہے۔

کبھی کبھی "جیب" "جبین" کے مقابلے میں ایمان اور اخلاص کی بہتر نشاندہی کرتی ہے بالفاظِ دیگر ایمان اور اخلاص کی گہرائی کا اندازہ کرنا ہے تو دیگر عوامل کے مقابلہ میں مالی ایثار ایک بہتر پیمانہ کا کام دیتا ہے اس لحاظ سے ذرا ان تمام اوقاف اور وسائل نذر و نیاز کا اندازہ لگائیے جو اس خاندان کے نام پر خرچ کئے جاتے ہیں آج کے دور میں بھی جب مادیت کا رجحان قوی اور مذہبی جذبہ کمزور ہوتا جا رہا ہے جب اقتصادی جذبہ غالب جذبہ بن گیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ ہمارے عوام افلاس اور تنگدستی کا شکار ہیں ان کے لیے خود اپنی غذا اپنے بچوں کے لیے دودھ کی فراہمی اور بیماروں کے لیے علاج کا مسئلہ زندگی کا سب سے بنیادی اور سنگین مسئلہ بن گیا ہے اس کے باوجود ان ایام میں جو ان ہستیوں کی یاد منانے کے لیے مخصوص ہیں دس لاکھ (ایک ملین) سے زیادہ مجالس ان کے نام پر منعقد کی جاتی ہیں مختلف درجات کے تقریباً ڈیڑھ لاکھ مذہبی علماء اور ستر ہزار سے زیادہ روضہ خواں مداح، نوحہ خواں وغیرہ جن کا کام ان بزرگ ہستیوں کی یاد تازہ کرنا ہے کی تمام معاش ان رقوم پر منحصر ہیں جو مذہب کے نام پر عوام خرچ کرتے ہیں علاوہ ازیں امام بارگاہوں (حسینیہ) اور خانقاہوں (تکیہ) کی تعمیر بھی انہی رقوم سے کی جاتی ہے ماتمی دستوں اور انجمنوں کی تشکیل اور ان کے اخراجات بھی اسی رقم سے پورے ہوتے ہیں اس کے ساتھ ہی مجلسوں کے تبرک اور طعام پر بے اندازہ رقم خرچ ہوتی ہے پھر وہ رقم بھی ہے جو خمس، سہم امام، صدقات اور خیرات کے نام پر نکالی جاتی ہے اور اس کثیر اور خطیر رقم کا حساب لگانا مشکل ہے "مذہب کے نام پر ہمارے عوام کے

مالی ایثار کی اہمیت اس وقت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہماری قوم اقتصادی اعتبار سے پسماندہ ہے۔ ہم نہایت غریب لوگ ہیں ہماری فی کس آمدنی دنیا کے بیشتر ممالک کے مقابلہ میں بہت کم ہے اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ہماری قوم معاشی اعتبار سے زبردست طبقاتی تضاد کا شکار ہے ہمارے قومی سرمائے کے نصف پر تقریباً چند ہزار افراد قابض ہیں ہماری کل آمدنی کا دو تہائی (۲/۳) حصہ ہماری مجموعی آبادی کے ۲% حصہ کے تصرف میں ہے۔

ماضی کے برعکس اب دولت پرانے جاگیرداروں اور تاجروں کے ہاتھ سے نکل کر جدید سرمایہ داروں، صنعت کاروں اور لیڈر شپ والی طبقہ کے ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے اور سرمایہ (روپیہ) جو پہلے دھات کے سکوں کی شکل میں ہوتا تھا اب کرنسی نوٹوں کی صورت میں تبدیل ہو گیا ہے پہلے اس سرمایہ کی جگہ دکانیں بازار دستکار، صراف اہل حرفت اور اہلِ محنت کے ٹھکانے تھے اب اس کی جگہ بینک اسٹاک ایکسچینج، بیرونی کمپنیاں، تجارتی اور صنعتی ادارے اور شراکتیں اور کارخانے ہو گئے ہیں یہ نودولتی طبقہ مغرب زدگی کا شکار اور مذہب سے بیزار ہے اور اگر اس طبقہ کے کچھ افراد مذہبی جذبات اور میلانات رکھتے بھی ہیں تو پھر صورت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مذہب کو مغربی رنگ میں رنگ لیا ہے ان کے تمام آداب و رسوم، طور طریقے، مذہبی شعائر اور معمولات مغرب کے سانچے میں ڈھل گئے ان کا اسلام، بقولِ سید قطب "امریکی اسلام" ہے ایک ایسا مذہب ہے جو انسان کو ہر قسم کی ذمہ داری، ایثار اور عمل کی زحمت سے بے نیاز کر دیتا ہے یہ بے مسئولیت بے زحمت اور بے خرچ اسلام ہے اس امریکی اسلام کے پیروکار مذہب پر بیشتر نکتہ چینی کرتے ہیں، نظریاتی بحثیں کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر بزعم خود دانشوری فرماتے ہیں روشن فکر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور ان کی نئی نسل، نوجوان لڑکے اور لڑکیاں، سوئٹزرلینڈ، پیرس، انگلستان، امریکہ اور آسٹریا جیسے مقامات پر نائٹ کلبوں، رقص گاہوں اور عشرت کدوں میں بے تحاشہ روپیہ خرچ کر کے دادِ

عیش دیتی ہے۔

یہ مغرب زدہ حضرات اپنی بیگمات کے ہمراہ سال میں ایک دوبار مغربی ملکوں کا چکر لگاتے ہیں۔ یہ اپنے ساتھ بے اندازہ دولت لے جاتے ہیں جو بازاروں اور تفریح گاہوں میں پانی کی طرح بہائی جاتی ہے اس طرح یہ دولت بڑی آسانی سے مغربی سرمایہ داروں کی جیبوں میں منتقل ہو جاتی ہے، یورپ کے عیار تاجر اور عیاشی کے اڈوں کے نگراں انہیں دودھ دینے والی گائیں سمجھتے ہیں انہیں پسماندہ ملکوں سے آئے ہوئے ایسے گدھے تصور کرتے ہیں جن کی جیبیں دولت سے بھر ہیں اور جو اس دولت کو یورپی رقاصاؤں کے عشوۂ و ادا پر نچھاور کرتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کا تعلق ایک ایسے ملک سے ہے، جو پسماندہ، غریب اور افلاس زدہ ہے اور جب ان کی جیبیں خالی ہو جاتی ہیں تو پھر وہ اپنے وطن لوٹ آتے ہیں تاکہ وطن عزیز میں ایک بار پھر استحصال، مکر اور ریاکاری کے ذریعہ اپنے لیے دولت اکٹھا کریں اور پھر اس دولت کو لے جاکر مغربی سرمایہ کاروں کے حوالے کر دیں ایسے لوگ اپنی زندگی کو اسی روش پر ڈھال لیتے ہیں اور اسے ترقی، تہذیب، اور شائستگی کا نام دے کر خود کو بڑا مہذب اور کلچرڈ سمجھتے ہیں

دوسری طرف ایک ایسا شخص جو کسان یا دستکار یا متوسط درجہ کا تاجر ہے اپنی پوری زندگی میں صرف ایک بار حج یا زیارت کربلائے معلیٰ کی نیت کر سکتا ہے وہ تمام زندگی کی محنت اور کوشش کے نتیجہ میں صرف ایک بار سفر کرنے کی ہمت کر سکتا ہے اس کے لیے حج یا زیارت کے لیے سفر کرنا اس کی پوری زندگی کا حاصل ہے یہی سفر اس کے لیے تفریح بھی ہے، سیاحت بھی ہے، فریضہ کی ادائیگی بھی ہے یہی وہ واحد رابطہ ہے جو اس کے اور بیرونی دنیا کے درمیان ممکن ہو سکتا ہے یہ اس کے ایمان اور عقیدے کی تجدید اور جلا اور اپنی تاریخ اور ثقافت سے وابستگی کا ذریعہ ہے یہی وہ سفر ہے جس کے ذریعے وہ اپنی محبوب شخصیتوں کے مزارات کی زیارت کر کے اپنے عشق و ایمان کی تجدید کر سکتا ہے اپنی روح اور

قلب کو تازگی اور سکون بخشتا ہے اور اسی سفر کے ذریعے وہ اپنے تمدنی اور فنی آثار کا مشاہدہ اور مطالعہ کر سکتا ہے غرض یہ سفر اس کے لیے مذہبی فکری ثقافتی، تاریخی اور سماجی ہر لحاظ سے گوناگوں فوائد کا حامل ہے لیکن وہ اس سفر کے لیے تمام عمر میں صرف ایک مرتبہ قصد کر سکتا ہے اس لیے کہ اس کی جیب میں اس سفر کا بار برداشت کرنے کی اہل نہیں ہے اس ایک سفر حج و زیارت کے لیے بھی اسے ایک طویل مدت تک رقم پس انداز کرنا پڑتی ہے کسی نہ کسی طرح وہ پانچ ہزار تومان پس انداز کرتا ہے اس میں سے تین ہزار تومان تو آمد و رفت کے کرائے میں خرچ ہو جاتے ہیں۔ ہزار تومان سے وہ مختلف تبرکات و تحائف خرید کر اہل وطن کے لیے ہمراہ لے آتا ہے اور ہزار تومان زادِ راہ کے طور پر استعمال کرتا ہے ان سے مسافر خانہ کا کرایہ، بسوں کا کرایہ اور روزانہ کی خورد و نوش کی قیمت ادا کرتا ہے خیال رہے کہ یہ رقم اس رقم سے کہیں کم ہوتی ہے جو کوئی ایک مغرب زدہ جوڑا . . . .

کسی ایک رات میں قحبہ خانوں میں لٹا دیتا ہے یا پھر اپنے ایک پر تکلف ناشتہ پر خرچ کر دیتا ہے ایک طرف تو اس نودولتے طبقے کے افراد مغرب زدہ جدیدیت اور ترقی یافتگی کے نام پر ملکی سرمایہ کو اپنی عیاشی پر خرچ کرتے ہیں اور دوسری طرف نام نہاد دانشوری اور روشن فکری کے نام پر جب وہ غریب عوام کے مسائل پر اظہار خیال فرماتے ہیں تو پھر انسانی اقدار، اقتصادی اور طبقاتی مسائل، اجتماعی ہمدردی اور ملکی ترقی کے موضوعات پر ایسے ترقی پسند خیالات و افکار کا اظہار فرماتے ہیں جنہیں سن کے توپ گیوارہ جیسا انقلابی بھی دم بخود ہو جائے۔

اس وقت ہماری عام اقتصادی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے عوام پریشانی اور بھوک کا شکار ہیں اور ان کی پریشانی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ دوسری طرف ایک نودولتی طبقہ امیر سے امیر تر ہوتا جا رہا ہے چھوٹے جاگیردار تاجر اور پرانے امراء کا طبقہ اس نئے ابھرنے والے طبقے کے مقابلہ میں پسماندہ اور کمزور ہوتا جا رہا ہے دولت کی تقسیم کا توازن بدل رہا ہے پرانا طبقہ امراء اب

نسبتاً کمزور ہوگیا ہے۔ امیں کے اکثر لوگ اپنی پرانی حالت پر برقرار ہیں جبکہ اس طبقہ کی اقلیت اپنی حالت بدل کر نو دولتی طبقہ میں شامل ہو رہی ہے گویا دولت کی تقسیم کے لحاظ سے اس وقت معاشرے میں دو واضح طبقات ہیں طبقۂ جدید اور طبقۂ قدیم جن کے افراد مذہبی عقائد اور شعائر سے وفادار ہیں معاشرہ کی اس اقتصادی، معروضی اور محسوس درجہ بندی کے مطابق وہ لوگ جو مذہب سے وفادار ہیں ان کا تعلق اس روایتی اور قدیم طبقہ سے ہے جو اقتصادی اعتبار سے، پسماندہ ہے اور تیزی سے ضعف اور انحطاط کا شکار ہو رہا ہے اس کے باوجود مذہب کے نام پر مجالس و محافل کے انعقاد، دینی مدارس کے قیام اور روحانیون کے اخراجات کی مد میں جو رقم خرچ کی جا رہی ہے دیگر مذہبی شعائر اور حوزۂ علمیہ کے لیے جو صرف کیا جا رہا ہے وہ اس بات کا روشن ترین ثبوت ہے کہ ہمارے عوام کا مذہب سے کس قدر گہرا تعلق ہے پیغمبرؐ کے خانوادہ سے ان کی عقیدت کس قدر پائیدار، عمیق، پرخلوص اور ناقابل شکست ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خانوادۂ پیغمبرؐ و علیؑ سے ہمارے عوام کی عقیدت اور محبت کی گہرائی کا اندازہ لگانا ممکن نہیں ہے۔

گفتگو کے اس مرحلہ پر پھر وہی سوال کہ اگر ہماری قوم ذلت اور مسکنت کا شکار ہے تو اس میں قصور کس کا ہے پوری شدت اور سنگینی کے ساتھ ہمارے سامنے آکھڑا ہوتا ہے ہر باشعور شخص جس نے اس مسئلہ کا مطالعہ کیا ہے۔ گہری فکر و نظر اور منطقی تجزیہ کے ذریعہ اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے وہ رفتہ رفتہ چند بدیہی اور متعارف حقیقتوں تک پہنچتا ہے اور وہ حقیقتیں مختصراً اور با الترتیب اس طرح بیان کی جا سکتی ہیں۔

سب سے پہلی حقیقت یہ ہے کہ ہمارا دین یعنی اسلام تاریخ کا سب سے آخری مذہب اور سب سے زیادہ مکمل اور ترقی یافتہ مکتب فکر ہے اور محمدؐ، قرآن، عترت، اصحاب و تاریخ اسلام ایک باعزت، باشعور، متمدن

مہذب، متحرک، پر شوکت اور ہر لحاظ سے ترقی پذیر زندگی کا سبق دیتے ہیں اس دین کا عقیدہ توحید انسان کی اجتماعی وحدت کی اساس ہے اور رسالت کا مقصد اجتماعی زندگی کو عدل کی بنیاد پر قائم کر کے ایک ایسی امت کی تشکیل کرنا ہے جس کا ہر فرد جذبۂ شہادت سے سرشار ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہمارا مذہب، مذہب تشیع، مذہب امامت و عدل، علیؑ اور اولاد علیؑ کی پیروی کا مذہب ہے اس مذہب کی تاریخ جہادِ مسلسل کی تاریخ ہے ایک ایسی تاریخ ہے جو ایثار و قربانی کے جذبے سے سرشار ہو یہ آزادی کے لیے جنگ کرنے اور آزادی اور انصاف کی دشمن قوتوں سے مزاحمت نہ کرنے کی تاریخ ہے یہ ایک ایسی تاریخ ہے جس کا طرۂ امتیاز ظلم و استبداد جور و ستم نفرت اور تعصب کے خلاف مسلسل جنگ ہے اس تاریخ کا امتیاز ان تمام قوتوں سے مسلسل اور پیہم لڑائی ہے۔ جو غصب حق، مسخ حقیقت، سیاسی جبر، اقتصادی استحصال اور روحانی استبداد کی علامت ہیں علیؑ اور حسینؑ اور زینبؑ پر ایمان عدل و رہبریٔ معصوم، اجتہاد و جہاد، فلسفۂ شہادت اور فلسفۂ انتظار غرض تشیع اور اس کے تمام اصول ہر لحظہ قیام عدل کے لیے جدوجہد کا پیغام ہیں۔

حقیقت کا ایک اور رخ یہ ہے کہ ہمارے عوام جن کو ایمان کی حرارت اور عشق کا سوز و گداز حاصل ہے خانوادۂ نبیؐ و علیؑ سے ایک ایسی والہانہ محبت اور عقیدت رکھتے ہیں جو محض رسمی مذہبی اعتقاد سے کہیں زیادہ ہے ان ہستیوں کا نام ان کی روح کو تازگی بخشتا ہے اور ان کی یاد ان کی رگوں میں لہو کو گرم کر دیتی ہے وہ ان کے قدموں پر اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے بیتاب رہتے ہیں وہ اپنی محبوب ہستیوں کی خاطر قربانی پیش کرنے کے آرزو مند ہیں وہ اس غم میں کہ وہ عاشورا کے خونین دن کیوں موجود نہ تھے نالہ و فریاد کرتے ہیں۔ خون کے آنسو بہاتے ہیں اور غم سے بے حال ہو کر دیوانہ وار اپنے سر اور چہرے کو تیغ و خنجر سے زخمی کر لیتے ہیں اور تمام سال ان کے غم میں غمگین اور ان کی یاد میں

سوگوار رہتے ہیں تمام سال ان کے حالات و واقعات کی فکر و جستجو کرتے ہیں ان کی مدح و ثناء اور تعریف و توصیف میں اپنی زبانوں کو معروف رکھتے ہیں ہم ایک ایسی قوم ہیں جو عشق کے جذبہ سے سرشار، سراپا سیاہ پوش، سراسر اشک و درد میں غرق اور اپنی روح کی تمام توانائیوں کے ساتھ جانبازی اور قربانی کے لیے آمادہ اور شدت عشق سے بے حال، بے تاب اور آشفتہ ہے

اس ضمن میں ایک اور واضح حقیقت یہ ہے کہ ہمارا موجودہ دانشور طبقہ روشن فکر نسل، حساس، اور بیدار ہے وہ تاریخ عالم تقدیر جہاں اور اپنی ملت کی حالت سے بخوبی آگاہ ہے وہ زمانہ کی رفتار سے آشنا اور اس کے تقاضوں سے باخبر ہے اور ایک مثبت اور فعال سوچ رکھتی ہے اس کی فکر انقلابی اور اس کا ایمان پرجوش اور متحرک ہے یہ دانشور اپنے عوام کی بیداری کے نقیب ہیں لوگوں کو آزادی اور عمل کا پیغام دیتے ہیں۔ انہیں ذمہ داری اور مسئولیت کے شعور کو بیدار کرتے ہیں وہ ان ذمہ داریوں سے اچھی طرح باخبر ہیں جو کسی معاشرے میں دانشور طبقہ پر عائد ہوتی ہے اور نہ صرف یہ کہ اپنی ذمہ داریوں کا گہرا شعور رکھتے ہیں بلکہ عملاً ان ذمہ داریوں کو بطریق احسن پورا کر رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ پھر ہماری ملت کی حالت اس قدر افسوسناک کیوں ہے وہ تمام عناصر جو ملت کے لیے زندگی، بیداری اور قوت تعمیر و ترقی بخش سکتے ہیں آخر بے اثر کیوں ہیں۔ ان کا ہماری زندگی اور حالات پر کوئی اثر کیوں مرتب نہیں ہوتا دین مذہب طبقۂ دانشوراں (روشن فکر) اور عوام کہیں کوئی کمی یا خرابی نہیں ہے پھر ملی صورت حال اس قدر خراب کیوں ہے۔

آخر ایسا کیوں ہے کہ ہماری آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو جو ہمارے ایمان اخلاص اور وفاداری کی علامت ہیں اور ہمارا ایمان جو ان مفاہیم سے متعلق ہے جو زندگی اور آزادی سے لبریز ہیں اور ہمارا عشق جو ان ہستیوں سے ہے جو انسان کی عظمت و جلالت کا شاہکار ہیں ہمارے لیے بے ثمر اور بے نتیجہ ہے ہم مومن و

عاشق ہیں لیکن ہمارا ایمان اور ہمارا عشق ہمارے مسائل کو حل کرنے میں کوئی مدد نہیں کرتا۔ مگر کیوں؟

ہمارا دین۔ دین نجات ہے۔ ہمارا مذہب۔ مذہب عدالت ہے ہمارا طبقہ دانشوران (روشن فکر) بیدار اور ذمہ داری کے احساس سے سرشار ہے ہمارے عوام مومن ہیں۔ سچے اور مخلص مومن اور عاشقان صادق اس کے باوجود ہم درماندہ مفلس، غریب اور جہالت کا شکار اور ترقی کی دوڑ میں بہت سی قوموں سے پیچھے ہیں۔ ایسا کیوں ہے۔ قصور کس کا ہے؟

ایک لفظ میں اس سوال کا جواب یہ ہے کہ قصوروار "عالم" ہیں لیکن کیسے؟ اس لیے کہ اسلام محمدؐ اور علیؑ و کار حسینؑ پر ہمارے ایمان کے بے ثمر اور بے نتیجہ ہونے کا واحد سبب یہ ہے کہ ہم دراصل ان عظیم ہستیوں کو پہچاننے سے معذور اور محروم ہیں۔

ہمیں ان سے عشق ہے لیکن ہم ان کا شعور نہیں رکھتے۔

ہم ان سے محبت کرتے ہیں لیکن ہمیں ان کی معرفت حاصل نہیں ہے۔

ہمارا دین جو حقیقتاً حیات تازہ بخشنے والا دین ہے۔ اگر ہمیں زندگی نہیں بخشتا تو اس کا سبب یہ ہے کہ ہم اس دین پر رسمی ایمان رکھتے ہیں مگر اس دین کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں اور دین کی حقیقت سے آگاہی عطا کرنے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ دینی شعور کی تربیت کا ذمہ دار کون ہے؟

"عالم"

یہ عالم کا فرض تھا کہ وہ لوگوں کو علیؑ اور ان کے پیغام فکر سے آگاہ کرتا۔

عالم علم فقہ

اسلام کے لغت میں عالم، دائرہ بے تعہد، یعنی کسی ایسے شخص کو نہیں

رکھتے جس نے کچھ کتابیں تو پڑھ رکھی ہوں مگر جو اپنی معاشرتی اور اجتماعی ذمہ داریوں کے عہد کو پورا نہیں کرتا اسلام کسی ایسے شخص کو عالم نہیں تسلیم کرتا جو محض صاحبِ معلومات ہو جس کے ذہن میں معلومات اور اطلاعات کا ڈھیر تو جمع ہو مگر جس کا دل بے نور ہو دراصل علم ایک نور ہے۔ نورِ خداداد۔ اور عالم کا دل اس نور کے پرتو سے منور ہوتا ہے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ "علم ایک نور ہے۔ جسے اللہ جس قلب میں چاہتا ہے روشن کرتا ہے" حضورؐ کا یہ ارشاد پراسرار اور مبہم نہیں ہے یہاں علم سے مراد محض علم لدنی، علم اشراقی یا عرفانی نہیں ہے اسی طرح یہاں علم سے مراد طبیعات، کیمیا، تاریخ، جغرافیہ، فقہ، اصول، فلسفہ اور منطق بھی نہیں ہے اس لیے کہ یہ سب علوم محض "معلومات کا مجموعہ" ہیں یہ نور، نہیں ہیں وہ علم جو نور ہے، علم رسول ہے، علم ہدایت ہے، علم عقیدہ ہے جسے قرآن کی اصطلاح میں فقہ کہتے ہیں۔ یہ بات اور ہے کہ ہم نے آج کل فقہ کے معنی بہت محدود کر دیئے ہیں اور ہم محض فروعی اور شرعی احکام کے علم کو فقہ سے تعبیر کرتے ہیں لیکن اصطلاحِ قرآن میں فقہ ایک بلیغ اور جامع علم ہے فقہ کا علم رکھنے والا عالم تاریکی سے کوئی سروکار نہیں رکھتا وہ اپنے علم کے نور سے فضا کو روشن کرتا ہے رات کی تاریکی کا پردہ چاک کرتا ہے۔ راہ ہدایت وعمل کی نشاندہی کرتا ہے اس کا دائرہ عمل کسی خاص طبقہ تک محدود نہیں ہے وہ محض چند طالب علموں ہی کو درس نہیں دیتا بلکہ وہ عوام کی شعوری تربیت کا فریضہ ادا کرتا ہے اس کا علم افلاطونی اکیڈمی کا علم نہیں ہے (جو محض نظری ہے۔ عملی نہیں) بلکہ اس کا علم، علم رسالت کا پرتو ہے، حضورؐ نے فرمایا علماء انبیاء کے وارث ہیں [۲]

وہ علم جو محض معلومات کا انبار ہے ایک طرح کی قدرت اور طاقت ہے۔

۱؎ العلم نور یقذفہ اللہ فی قلب من یشاء (ارشاد پیغمبرؐ)

وہ علم جو نور ہے، وہ ہدایت ہے اور ایسا عالم جس کے لیے اس کا علم نور بن گیا، وہ ایک صاحبِ بصیرت دانشور ہے۔ وہ ایک ایسا روشن فکر ہے جو متعہد (COMMITTED) ہے جو اپنے مکتبِ فکر کی ذمہ داریوں سے آگاہ ہے اور ان کو پورا کرتا ہے اور جو اپنی اجتماعی ذمہ داریوں کا شعور رکھتا ہے اور ان ذمہ داریوں کو پوری طرح نبھاتا ہے۔

شیعہ عالم کی مسئولیت اس کی ذمہ داری اہم تر اور واضح تر ہے وہ نائب امام ہے اپنے علم کی بدولت وہ امامت کی ذمہ داری کا بارِ عظیم اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے اور امامت کی ذمہ داری (مسئولیت) نبوت کی ذمہ داری کا تسلسل ہے۔

عالم تشیع نائب امام ہے وہ امام کے نام پر لوگوں سے رقم وصول کرتا ہے سہم امام کو اپنے تصرف میں لاتا ہے وہ لوگوں کو پیغمبرؐ کی رسالت اور علیؑ کی امامت کی معنویت اور پیغام سے متعارف کرانے کا ذمہ دار ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس باب میں علماء نے مکمل سکوت اختیار کر رکھا ہے اگر لوگ یہ نہیں جانتے کہ امام کسے کہتے ہیں؟ آئمہ کی سیرت اور ان کی فکر کیا تھی انہوں نے کیا کہا کیا عمل کیا، کس طرح زندگی گذاری تاریخ پر کیا اثرات مرتب کئے ان کا مکتب فکر کیا ہے انہوں نے کس نظام فکر و عمل کی حمایت اور کس کی مخالفت کی۔ مختصر یہ کہ اگر عوام اس بات سے بے خبر ہیں کہ آئمہ اپنے پیروؤں سے کس بات کی خواہش کرتے ہیں اور ہم ان کے راستہ کو جاری رکھنے کے لیے کیا کر سکتے ہیں تو یہ علماء کا قصور ہے۔

اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ فارسی زبان میں کسی یورپی فلم پر کتابیں جس قدر تعداد میں ملتی ہیں اتنی تمام آئمہ شیعہ کے متعلق بھی دستیاب نہیں ہیں تو قصور علماء کا ہے۔

---

۱ العلماء ورثۃ الانبیاء (ارشادِ پیغمبرؐ)

اگر ہمارا پڑھا لکھا نوجوان یونان کی زنِ فاحشہ بلیٹیس کے اشعار کا نہایت خوبصورت فارسی ترجمہ تو پڑھ سکتا ہے لیکن اسے علیؑ کی نہج البلاغۃ کا ترجمہ دستیاب نہیں تو قصور وار علماء ہیں

اگر ہمارے عوام کی اپنے آئمہ کے متعلق معلومات کا دائرہ صرف ان کے اسماء اور چند معجزات اور کرامات تک محدود ہے اور اگر ہم ان کی تمام پر برکت زندگی میں سے صرف ان کے ایام ولادت وشہادت ہی سے واقف ہیں تو یہ قصور علماء کا ہے۔

محبت ــــ معرفت

علیؑ چشمۂ حریت ہے۔ منبع توانائی ہے مگر وہ لوگ جو علیؑ کی محبت کا دم بھرتے ہیں۔ غلامی میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ضعف اور انحطاط کا شکار ہیں اس تضاد کا سبب کیا ہے؟۔ عدم معرفت" ہم علیؑ کی حقیقی معرفت نہیں رکھتے محبت کی قدر وقیمت اور معنویت معرفت کے حوالے سے مقرر ہوتی ہے جہاں معرفت نہیں ہے وہاں محبت بے اثر ہے بے قیمت ہے، وہ چاہنے والوں کی زندگی مین کوئی تبدیلی رونما نہیں کرتی۔ بے معرفت محبت بے اثر بے قیمت شے ہے۔ قرآن کی اگر معرفت حاصل نہ ہو سکے اگر اس کی تلاوت بصیرت کے ساتھ نہ کی جائے تو پھر قرآن اور کسی اور کتاب میں کوئی اور فرق نہیں ہے قرآن بے شک سرچشمۂ ہدایت ہے لیکن اس ہدایت کے حصول کے لیے معرفت ناگزیر شرط ہے۔

علی بھی اپنے پیروکاروں کو آگاہی، عظمت، عزت اور آزادی کی دولت عطا کرتے ہیں۔ مگر کب، جب وہ یہ پہچان سکیں کہ علیؑ کون تھے

عشق وایمان کی روح معرفت ہے۔ یہ معرفت ہے جو محبت کو جوشِ عمل اور جذبۂ تعمیر عطا کرتی ہے۔

جناب فاطمہ کی عظیم شخصیت بھی عدم معرفت کے پردوں میں نہاں ہے
ہم نے ان کے کردار و عمل کو مدح و ثنا کے لفظوں کے ڈھیر اور نالہ و شیون کی کثرت
میں گم کر دیا ہے۔

باب چہارم

مسئلہ کیسے حل کیا جائے

سہ چہرۂ زن

مسلم معاشروں میں عورت کے تین روپ ہیں۔

ایک روایتی عورت کا روپ ہے دوسرا روپ جدید عورت کا ہے جو مغرب کی تقلید کرتی ہے۔

عورت کا تیسرا روپ وہ ہے جس کی علامت جناب فاطمہؑ ہیں وہ خواتین جو جناب فاطمہؑ کی تقلید کرتی ہیں ان میں اور روایتی عورت میں کوئی ایک بھی قدر مشترک نہیں ہے ہمارے (ایرانی) معاشرہ میں روایتی عورت کا جو تصور ہے وہ جناب فاطمہؑ کی روش سے اتنا ہی دور ہے جتنا کہ جدید مغرب زدہ عورت کا تصور آج کی دنیا، خصوصاً مشرقی دنیا اور اس میں بھی بالخصوص ایرانی معاشرہ جس زبردست حقیقت سے دوچار ہے وہ حقیقت تغیر اور انقلاب کی وہ کیفیت ہے جو تمام انسانی اقدار، کیفیات اور تصورات کو بدل رہی ہے ہمارا معاشرہ، تضاد، بحران اور آشفتگی کا شکار ہے ایک نیا طبقہ وجود میں آرہا ہے جسے روشن فکر یا تعلیم یافتہ یا جدت پسند (MODERN) طبقہ کہتے ہیں جو قدیم روایتی مردوں اور عورتوں سے قطعی مختلف ہے یہ تضاد ایک جبری تضاد ہے ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ ان تاریخی اور سماجی عوامل کو جو اس تبدیلی اور تضاد کا محرک بنے ہیں روکنا کسی کے بس میں نہیں تھا۔

یہ تغیر اور انقلاب اچھا ہے یا برا اس سے قطع نظر ہمیں اس وقت یہ کہنا ہے کہ معاشرتی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اور ان کے زیر اثر مردوں اور عورتوں کی وضع قطع سوچنے کے طریقے اور رہنے سہنے کے ڈھنگ بدلنا لازمی ہیں یہ ممکن ہی نہیں کہ آج کی عورت قدیم اور روایتی روش پر قائم رہ سکے۔

گذشتہ دور میں بیٹا باپ کے نقش قدم پر چلتا تھا۔ بالکل اپنے باپ کے قالب میں ڈھل جاتا تھا۔ کوئی باپ کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کا بیٹا اس سے اس قدر مختلف ہو جائے گا کہ باپ اور بیٹے کے درمیان کوئی قدر مشترک کوئی فکری مفاہمت اور کوئی جذباتی اشتراک ممکن نہیں ہو سکے گا لیکن آج صورت حال اس سے مختلف ہے نسلی بعد (GENERATION GAP) ہمارے دور کی ایک خصوصیت ہے مشرق ہو یا مغرب ہر جگہ نسلی بعد کا مسئلہ شدید اور سنگین ہے آج دو نسلوں کے درمیان " زمانی فاصلہ" بظاہر (۳۰) سال ہے لیکن معاشرتی تبدیلیوں کے پیمانہ سے ناپا جائے تو یہ فاصلہ کم از کم تین سو سال ہو جاتا ہے

عہد گذشتہ میں معاشرہ جامد تھا اور اس کی اقدار اور خصوصیات ایک شکل میں قائم تھیں تغیر کا عمل مفقود تھا۔ ۱۰۰، ۲۰۰، ۳۰۰ سال میں بھی کوئی خاطر خواہ تبدیلی رونما نہیں ہوتی ہر چیز اپنی جگہ ویسے ہی رہتی تھی اس معاشرتی جمود کا عالم یہ تھا کہ ذرائع پیداوار، دولت کی تقسیم، باہمی تعلقات، حکومت، دینی ادارہ، مذہبی رسوم، عادات و اطوار، مثبت اور منفی اقدار کا تصور، فن، ادب، زبان، غرض ہر شے جو دادا اور پردادا کے زمانے میں جیسی تھی۔ بیٹوں اور پوتوں کے دور میں بھی ویسی ہی رہتی

اہل و نا اہل

اس ٹھہری ہوئی دنیا میں اور جامد معاشرہ میں جہاں "زمان اجتماعی"

یعنی معاشرتی وقت حرکت نہیں کرتا۔ مرد، عورتیں اور طبقات ایک ہی وضع پر قائم رہتے ہیں ایسے معاشروں میں یہ ایک فطری بات ہے کہ بیٹی بالکل اپنی ماں سے مشابہ ہو اس کی نقل ہو اگر ماں اور بیٹی میں کوئی فرق ہوگا بھی تو اس کی نوعیت ضمنی فروعی اور ذاتی ہوگی۔ یہ اختلاف انفرادی سطح تک محدود ہوگا۔ ایسا ممکن نہیں تھا کہ یہ اختلاف اجتماعی نوعیت اختیار کر سکے اس لیے کہ معاشرتی اقدار، اخلاقی معیار اور اچھائی اور برائی کے تصورات سب ایک سے تھے تمام طبقے ان امور پر ہم رائے تھے انمیں کوئی اختلاف نہیں تھا ایسا نہیں تھا کہ معاشرے کے کسی طبقے کے نزدیک جو بات مذموم ہو دوسرا اسے اچھا سمجھے مگر آج یہی صورتحال حال ہے۔

آج کی دنیا میں ماں اور بیٹی کے درمیان اختلافات کی خلیج واضح اور نمایاں ہے۔ بیٹی کسی اخلاقی فساد اور انحراف کے بغیر ہی اپنی ماں سے مختلف اور بیگانہ نظر آتی ہے اور ان دونوں کے درمیان ۱۵، ۲۰، یا ۳۰ سال کا فرق درامل دو اجتماعی ادوار کا فرق ہے اب ماں اور بیٹی دو ایسے افراد ہیں جو دو مختلف زمانوں سے متعلق ہیں ان کی تاریخ ان کی ثقافت ان کی زبان ان کا معیار فکر و نظر سب جدا جدا ہیں یہ دو مختلف انسان ہیں جن کے درمیان اگر کوئی قدر مشترک ہے تو بس اس قدر کہ وہ ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہیں اور ان کے گھر کا پتہ ایک ہی ہے۔

دو نسلوں اور انسان کی دو قسموں کے درمیان یہ بعد اور تضاد یہ تاریخی فصل اجتماعی زندگی کے خارجی مظاہر میں بھی واضح طور پر نظر آتا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ تہران کی پختہ اور جدید سڑکوں پر ایک شخص بکریوں کا گلہ لئے گھومتا ہے اور خریداروں کی آنکھوں کے سامنے ان کے لیے دودھ دوہتا ہے اس کے ساتھ ہی کیمیائی طور پر محفوظ کیا ہوا دودھ . . . .

. . . بھی دستیاب ہے اسی طرح ہم یہ نظارہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ کوئی اونٹ

کسی نہایت جدید خود کار گاڑی کے ساتھ کھڑا ہوا ہے گویا آج کے دور میں دو نسلوں کے درمیان اسی قدر بعد، وہی تاریخی فاصلہ اور وہی معاشرتی دوری ہے جتنی دوری ہابیل اور قابیل کے عہد کو خلائی تسخیر اور جدید ترقیات کے موجودہ عہد سے الگ کرتی ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس تاریخی فاصلے کے باوجود ماں اور بیٹی شانہ بشانہ ملائے شاہراہوں پر سفر کرتی ہیں لیکن ان میں سے ایک (ماں) ایرانی ساختہ آئسکریم سے شغل کرتی ہے اور دوسری (بیٹی) راستہ چلتے ہوئے چیونگم چباتی رہتی ہے

مذہب — روایت

یہ اجتماع ضدین، یہ دو متضاد انسانی قسموں کا اجتماع کوئی فطری اور پائیدار اجتماع نہیں ہے ظاہر ہے کہ ان دو قسموں میں سے ایک قسم (TYPE) کی نمائندہ وہ ماں ہے جو اپنی زندگی کے آخری دور سے گذر رہی ہے اس کی عادات و اطوار پختہ اور راسخ ہیں اور ان عادات کے تحت وہ ایک خاص نہج پر اپنی زندگی گذار رہی ہے اور دوسری قسم کی نمائندہ وہ بیٹی ہے جو ابھی نوعمر ہے اسے اپنی زندگی کا سفر طے کرنا ہے اپنے عادات و اطوار کی تربیت کرنی ہے ماہ و سال کی گردش کے زیر اثر وہ عمر کے اعتبار سے زندگی کے اس مرحلہ میں داخل ہو جائے گی جس سے اس وقت اس کی ماں گذر رہی ہے۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ وہ اپنی ماں کے قالب میں نہیں ڈھل سکے گی آج کی یہ بیٹی جب کل ماں بنے گی تو اس کی شخصیت اپنی ماں کی شخصیت سے مختلف ہوگی لیکن اس کے بعد کی نسل کے دور میں تغیر کا یہ عمل جو اس وقت جاری ہے اپنے منطقی اور فطری انجام تک پہنچ چکا ہوگا معاشرہ میں جو بحرانی کیفیت طاری ہے وہ سکون سے بدل جائے گی پھر اس دور میں ماں اور بیٹی ایک ہی تاریخی اور سماجی دور سے متعلق ہو جائیں گی دونوں کے درمیان جو فصل ہمارے دور میں ہے۔

یہ فاصلہ یہ نسلی بعد ختم ہو جائے گا دونوں میں یگانگت اور یک رنگی قائم ہو جائے گی پھر ماں اور بیٹی میں وہی نسبت اور تعلق قائم ہو جائے گا جو عہد سابق میں تھا یعنی بیٹی اپنی ماں کی ایسی نقل ہوگی جسے مطابق اصل کہا جاسکے گا۔

عورت کا روایتی ٹائپ سے جدید ٹائپ میں بدلنے کا عمل ایک ایسی بات ہے جو قطعی اور ناگزیر ہے (خواہ یہ بات حق ہو یا باطل اچھی ہو یا بری لیکن یہ حقیقت ہے کہ تبدیلی کا یہ عمل بہرحال ہو کر رہے گا) اب اگر کوئی شخص اس حقیقت سے چشم پوشی کرتا ہے اس عمل تغیر کا مذاق اڑاتا ہے اس کی تضحیک کرتا ہے اس کے خلاف عصبیت اور حقارت کا اظہار کرتا ہے زمانہ کے دباؤ اور حالات کے جبر کا مقابلہ صرف قیل وقال سے کرنا چاہتا ہے۔ تغیر کے اس سیلاب کو روکنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا ہے تو وہ محض ایک کار عبث میں مشغول ہے وہ بے سود مشقت کر رہا ہے۔ زحمت عبث کا شکار ہے اس کی تمام زحمتوں اور کوششوں کا نتیجہ نہ صرف یہ کہ صفر بلکہ صفر سے بھی کم تر ہے بلکہ وہ اپنی اس زحمت بے سود سے تبدیلی کے عمل کو تیز کرنے اور اپنی مخالف قوتوں کو تقویت پہنچانے کا سبب بنتا ہے۔

یہی وہ حقیقت ناشناس گروہ ہے جو مفکر اور ہادی کی شکل میں ایمان عقیدہ اور مذہب کے نام پر ہر اس شے کو جو ہمیں ماضی سے ورثے میں ملی ہے اور جو ہماری عادت اور روایت کا حصہ ہے ہر اس شے کو جسے قرآنی اصطلاح میں "سنت الاولین" یا "اساطیر الاولین" سے تعبیر کیا گیا اور جس کا تعلق آباء الاولین سے قائم تھا اسی طرح برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور تغیر کے سماجی اور تاریخی عمل کی نفی کے لیے دین و مذہب کا سہارا لیتا ہے لوگوں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ ماضی کی ہر روایت، ہر سنت قدیم کی توجیہ کریں اس کو درجۂ تقدیس عطا کریں گویا ان کے خیال میں "ماضی پرستی" مذہب پرستی کے مترادف ہے۔ نتیجہ یہ کہ وہ ہر تغیر اور تبدیلی کو ماضی کی روایت سے ہر معمولی سے معمولی

انحراف کو، خواہ اس کا تعلق لباس یا آرائش گیسو ہی سے کیوں نہ ہو" کفر" گردانتے ہیں اور ماضی پرستی، جدت طرازی سے فرار، اور تغیر و تبدیلی سے بیزاری کو جو حقیقتاً" روح تسلیم کی ضد ہے اسلام کا لبادہ پہناتے ہیں اور اسی منطق کے تحت ان کا خیال ہے کہ تمام عورتیں اپنی اسی حالت پر قائم رہیں جو انہیں ماضی سے ورثہ میں ملی ہے وہ روایت سے سر مو انحراف نہ کریں اس لیے کہ اس حقیقت ناشناس گروہ کو عورتوں کی یہی وضع پسند ہے وہ انہیں روایتی قالب میں دیکھنے کے عادی ہیں اور ان کا مفاد اسی میں ہے کہ عورتیں اپنے اسی قالب میں محصور رہیں۔ ان کی کوشش ہے کہ عورتوں پر یہ جبر روایتی قالب میں قائم رہنے کا جبر، ابد تک قائم رہے اور اپنی اس کوشش کی سند اور تائید کے لیے وہ ادعا کرتے ہیں کہ اسلام عورتوں پر اس جبر کی توثیق کرتا ہے ان کا دعویٰ ہے کہ اسلام نے عورتوں کے لیئے یہی وضع اور یہی قالب پسند کیا ہے اور وہ قیامت تک اسی وضع پر قائم رہنے کے لیے مجبور ہیں دنیا بدل سکتی ہے زمین آسمان بدل سکتے ہیں ہر شئے متغیر ہو سکتی ہے یہاں تک کہ عورتوں کے شوہر اور ان کی اولاد اپنی وضع قطع بدل سکتی ہے اور اپنے قالب تبدیل کر سکتی ہے لیکن عورت کو اپنی وضع تبدیل کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ بالفاظ دیگر ان کا ادعا ہے کہ خاتم النبین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورت کیلئے اسی وضع کو پسند کیا۔ جس سے اس کا خاوند خوش رہے گویا عورت اپنے خاوند کی خوشی کی پابند اور اس کی مرضی کے قالب میں ڈھلنے پر مجبور ہے۔ یہ منفی انداز فکر ایک دعوت گمراہی ہے ایک نقصان رساں دعوت ہے اسی لئے کوئی اس آواز پر کان نہیں دھرتا بات یہ ہے کہ حرکت اور تغیر کے اصول کو سکون اور ثبات سے بدلنا ممکن نہیں ہے طبقہ نسواں اس تغیر سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ سماجی تبدیلی کے عمل سے نہیں بچ سکتا۔ خواہ کوئی پسند کرے یا نہ کرے بہر حال عورتیں تغیر کے دور سے گذر رہی ہیں۔ زمانے کی گردش اور سماجی تبدیلیوں کے زیر اثر ان کی عادات و اطوار اور

وضع قطع بدل رہی ہے زمانہ کے بدلنے کے ساتھ سماجی اداروں میں تبدیلی ناگزیر ہے اور سماجی حالات اور معاشرتی ماحول کے بدلنے سے لوگوں کے عادات و اطوار ان کی وضع قطع اور ان کے رہن سہن کے طریقے سب کچھ بدل جاتے ہیں۔

مذہب ایک حقیقت ہے جو قائم اور ثابت ہے یہ زمانے کی گردش سے متاثر نہیں ہوتی۔ سماجی تغیرات کے دباؤ سے بدل نہیں سکتی لیکن اس حقیقت کے خارجی مظاہر، اس کی ظاہری شکلیں، ہر دور اور ہر معاشرے کی ضرورت کے مطابق تبدیل ہو سکتی ہیں۔ 'خارجی اشکال' اور 'ظاہری رسوم' کو اصل حقیقت سمجھنا بہت بڑا مغالطہ ہے ماضی کی وہ سنت اور وہ طور طریقے جو دور از کار ہو جاتے ہیں۔ وہ مردہ ہو جاتے ہیں وہ عادتیں جو اپنا جواز کھو دیتی ہیں ان کا بدل جانا ضروری ہوتا ہے اگر ہم ماضی کی مردہ روایت کو مذہب کے ہم معنی سمجھتے ہیں تو یہ بہت بڑا مغالطہ ہے اگر غلط ہیں علمار مذہب کے نام پر ماضی کی روایت کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ مذہب کے ذریعہ مردہ ماضی کو زندہ نہیں رکھ سکتے البتہ مذہب اور روایت ماضی کو ایک دوسرے سے مشروط کرنے کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ ... روایت ماضی کے ساتھ مذہب کو بھی دور از کار سمجھ لیا جائے۔

مذہب اور ماضی کی روایت دو الگ الگ حقیقتیں ہیں انہیں ایک حقیقت سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے اس طرح ہم اسلام کو جو ایک قائم اور لازوال حقیقت ہے معاشرتی زندگی کے ان خارجی مظاہر اور اشکال کا نگہبان بنا دیتے ہیں جو زمانے کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں ہم موروثی عقائد، تمدنی، ثقافتی اور تاریخی آثار کو دین سمجھنے کی غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ زمانے کی گردش کو روکنا ممکن نہیں ہے زمانہ حرکت سے اور تغیر سے عبارت ہے اور اپنی راہ میں حائل تمام رکاوٹوں کو دور کرنے کی سکت اور قدرت رکھتا ہے

روایت، عادت، وضع قطع، طرز بود و باش، اجتماعی روابط اور ان کے خارجی مظاہر سب کچھ وقت کے سیلاب تغیر کی زد میں ہیں۔ ان کو مذہب کو باہم خلط ملط کرنا ایک اشتباہ ہے ایک دھوکہ ہے کیا ہم نہیں دیکھتے کہ بعض لوگ آج بھی اس اشتباہ کا شکار ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ ان کی فکر کس قدر بڑا دھوکہ کھا رہی ہے۔

سنتِ پیغمبرؐ اسلام

دین اسلام میں حضورؐ کی سنت کی بڑی زبردست اہمیت ہے سنت جن باتوں سے عبارت ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

حضورؐ کے اقوال مبارک

حضورؐ کے تعلیم کردہ قوانین

حضورؐ کا وہ سکوت جو آپؐ نے کسی عمل کو دیکھ کر اختیار فرمایا

حضورؐ نے جو عمل خود انجام دیئے اگرچہ کہ آپؐ نے دوسروں کو ان کے بارے میں حکم نہ دیا ہو۔

گویا حضور کی سنت آپؐ کا قول اور عمل ہے اس اعتبار سے احکام اسلام کو دو قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(۱) وہ احکام جو قبل از اسلام رائج تھے اور جن کی پیغمبرؐ نے تائید و توثیق فرمادی۔ یہ احکام امضائی ہیں

(۲) وہ احکام جو سابق میں موجود نہیں تھے مگر جنہیں خود پیغمبرؐ نے وضع فرمایا۔ یہ احکام تاسیسی ہیں۔

لیکن احکام کی ان دو قسموں کے علاوہ یعنی امضائی اور تاسیسی احکام یا بالفاظ دیگر قول و عمل پیغمبرؐ کے علاوہ سنت کا ایک اور رخ بھی ہے ایک تیسری جہت بھی ہے جو میرے خیال میں باقی دونوں جہتوں سے زیادہ حساس

اور اہم ہے اور وہ ہے روش کار پیغمبرؐ یعنی حضورؐ کا طریقہ کار۔ وہ طریقہ (METHOD) اور حکمت عملی و نظری (TACTIC AND STRATEGY) جو آپؐ نے پیغام رسالت کی تبلیغ میں استعمال فرمائی۔ حضورؐ نے معاشرے کی اصلاح اور اسلام کے اصولوں کی تبلیغ و نفاذ کے لیے جو مخصوص حکمت عملی اختیار کی وہ ہر دور کے فکری اور سماجی مسائل سے نمٹنے کے لیے سب سے موثر اور رہنما اصول کی حیثیت رکھتی ہے آپؐ کی یہ حکمت عملی دیگر مروجہ مکاتب فکر کے طریقہ کار سے مختلف اور اپنی جگہ منفرد اور ممتاز ہے لیکن اس بات کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم دیگر مکاتبِ فکر کا ایک اجمالی تعارف پیش کریں۔

تین مکاتبِ فکر

اجتماعی اور معاشرتی اصلاح کے تین معروف طریقے ہیں جنہیں تین معین اور واضح مکاتبِ فکر کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے۔

(۱): مکتب تحفظ روایت (TRADITIONALISM AND CONSERVATISM)

اس مکتبِ فکر میں ماضی کی ہر روایت اور تمام رسوم و شعائر کا تحفظ کیا جاتا ہے خواہ وہ اچھے ہوں یا برے۔

(۲): مکتبِ انقلابی (REVOLUTIONISM)

اس مکتبِ فکر میں ماضی کی ہر روایت کو رد کر دیا جاتا ہے انقلابی رہبر ماضی کی ہر رسم اور ہر طریقہ کو رجعت پسندی، کہنگی اور فرسودگی کی علامت سمجھتا ہے۔

(۳): مکتبِ اصلاحی و ارتقائی (REFORMISM — EVOLUTIONISM)

اس مکتبِ فکر میں ماضی کی روایتوں کو بتدریج تبدیل کیا جاتا ہے معاشرے کی ہیئت رفتہ رفتہ تبدیل ہوتی ہے اور اصلاح کا عمل ایک طویل مدت

میں مکمل ہوتا ہے یہ مکتب اوپر بیان کئے گئے دونوں مکاتیب کی درمیانی راہ ہے۔

مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان تینوں راستوں سے الگ ایک چوتھا راستہ اختیار فرمایا یعنی وہ شعائر اور وہ رسوم جن کی جڑیں معاشرہ میں بہت گہری ہیں اور جو کئی نسلوں کی میراث تھے اور جن کے لوگ اس قدر عادی ہو چکے تھے کہ ان پر عمل کرنا ان کی فطرت ثانیہ بن چکا تھا حضورؐ نے ان کو برقرار رکھا مگر اس طرح کہ ان کی ظاہری شکل تو ماضی سے مماثل رہی لیکن ان کی معنویت ۔ ان کی روح ، ان کی جہت کو یکسر تبدیل کر دیا گیا۔ گویا حضورؐ کی نگاہ ہیئت (FORM) سے زیادہ ماہیت (CONTENT) پر رہی اور آپؐ کا طریقہ کار تبدیلی ہیئت سے زیادہ قلب ماہیت کا طریقہ ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ ہر مکتب فکر اپنے حق میں کیا استدلال پیش کرتا ہے

مکتب تحفظ روایت کے علمبرداروں کا استدلال یہ ہے کہ ماضی کے شعائر اور رسوم و رواج کی جڑیں معاشرہ میں بہت گہری ہوتی ہیں اور کسی اجتماعی نظام میں ان کی حیثیت وہی ہے جو کسی جسم میں نظام اعصاب کی ہے اگر ان کو یک لخت بدلنے کی کوشش کی جائے گی تو معاشرہ کا شیرازہ بکھر جائے گا اجتماعی نظام کے تار و پود بکھرنے سے معاشرہ میں بحرانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہر بڑے انقلاب کے بعد معاشرہ میں بحران انتشار اور اضطراب کی صورت پیدا ہو جاتی ہے یا پھر کوئی ڈکٹیٹر معاشرہ پر مسلط ہو جاتا ہے اس مکتب فکر کے خیال میں ماضی کے ان آثار و شعائر کو جن کی جڑیں معاشرہ اور ثقافت میں گہری ہوں کسی تند انقلابی عمل کے ذریعہ یک لخت بدلنے کی کوشش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ ایک زبردست بحران اور ایک خلائی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے یہ معاشرتی خلا انقلاب کی ہماہمی ختم ہونے کے بعد پوری طرح ظاہر ہوتا ہے

مکتبِ انقلابی کے علمبرداروں کا استدلال یہ ہے کہ اگر ہم ماضی کے رسوم ورواج کو برقرار رکھیں گے تو اس کا مطلب معاشرے کو کہنگی، فرسودگی رجعت پسندی اور جمود کی حالت میں برقرار رکھنا ہے سچا انقلابی وہی ہے جو ماضی کی ان تمام روایتوں کو جو لوگوں کے دست و پا ان کی روح، فکر اور ان کے عزم و ارادہ کو فرسودگی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ یکسر رد کر کے لوگوں کو آزادی دلاتا ہے اور تمام پرانے رسوم ورواج کی جگہ نئے قوانین نافذ کرتا ہے کیونکہ اگر یہ ہمہ گیر انقلابی تبدیلی عمل میں نہ آئے تو انقلاب اپنی غرض وغایت کو پورا نہیں کر سکتا اور معاشرہ بدستور قدامت، فرسودگی، جمود اور رجعت پسندی کا شکار رہتا ہے۔

مکتبِ اصلاحی کے علمبرداروں کا استدلال یہ ہے کہ ان کا طریقہ باقی دو مکاتب کی کمزوریوں اور نقائص سے پاک ہے یہ ایک درمیانی راستہ ہے جس میں اصلاحی عمل رفتہ رفتہ بتدریج واقع ہوتا ہے اس مکتبِ فکر کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ معاشرہ کو ماضی کی قید وبند اور جمود سے نجات دلائی جائے لیکن یہ عمل اس قدر ناگہانی نہ ہو کہ معاشرہ یکسر درہم برہم ہو جائے بلکہ اس تبدیلی کے لیے رفتہ رفتہ زمین ہموار کی جائے آہستہ آہستہ اور تشدد سے پاک طریقوں کو کام میں لا کر یہ کوشش کی جائے کہ معاشرہ تدریجی ارتقاء کے ذریعہ اصلاح یافتہ ہو جائے یہ ایک طویل اور صبر آزما طریقہ ہے جس میں انقلابی عمل کے ذریعہ تبدیلی رونما نہیں ہوتی بلکہ ایک طویل مدت کی جدوجہد اور مرحلہ وار منصوبہ بندی کے ذریعہ تبدیلی کا عمل مکمل ہوتا ہے

لیکن اس تدریجی اصلاح کے عمل میں ایک واضح خرابی ہے اور وہ خرابی یہ ہے کہ یہ ایک ایسا عمل ہے جس کے لیے ایک طویل مدت درکار ہے اور اس طویل مدت میں منفی عوامل، رجعت پسند قوتیں اور خارجی اور داخلی دشمنوں کی ریشہ دوانیاں اس اصلاح تدریجی کی تحریک کو اس کے راستے سے ہٹا دینے میں

کامیابی حاصل کر سکتی ہیں یا پھر اس اصلاحی تحریک کو سرے سے ناکام اور نیست ونابود کر سکتی ہیں۔

مثال کے طور پر اگر ہم یہ چاہیں کہ نوجوانوں کے اخلاق کو تدریجی طور پر سدھاریں یا عوام کے افکار کی اصلاح کریں تو عین ممکن ہے کہ قبل اس کے کہ ہم اپنا ہدف حاصل کر سکیں، فساد انگیز عوامل اور عوام کو دھوکہ دینے والی قوتیں معاشرہ پر غلبہ حاصل کر کے ہماری کوششوں کو بالکل مفلوج کر دیں وہ لیڈر جو تدریجی اصلاح کے طریقہ سے معاشرہ کو سدھارنا چاہتے ہیں وہ اپنے منصوبہ پر بہت غور کرتے ہیں لیکن جو بات ان کی نظر سے اوجھل رہتی ہے وہ ان اصلاح دشمن قوتوں کا منفی اثر ہے جو معاشرے کو اصلاح و ترقی سے دور رکھنا چاہتی ہے۔ یہ قوتیں اتنی مہلت ہی کہاں دیتی ہیں کہ تدریجی اصلاح کا عمل اپنے انجام تک پہنچ سکے۔ مختصر یہ کہ تدریجی اصلاح کے ذریعہ جو مثبت تبدیلی بہت دنوں کی تدریجی کوشش کے ذریعہ عمل میں آتی ہے اسے منفی قوتوں کا متضاد اثر ذرا سی دیر میں پلٹ دیتا ہے اور یوں صورت حال پہلے ہی کی طرح یا اس سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔

لیکن پیغمبر اسلام نے ان تینوں معروف طریقوں سے ہٹ کر اپنا ایک منفرد طریقہ وضع کیا۔ معاشرتی تبدیلیوں اور اجتماعی اصلاح کے باب میں آپؐ کی روش سب سے جدا اور سب سے زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز ہے یہ طریقہ مذکورہ مروجہ طریقوں کے نقائص اور ان کے منفی اثرات سے پاک ہے یہ وہ طریقہ ہے جو منفی عوامل اور سماج دشمن قوتوں کے علی الرغم اپنے مقاصد کو بہت تیزی سے حاصل کر سکتا ہے۔ اور وہ مخصوص طریقہ اور وہ منفرد روش یہ ہے کہ حضورؐ نے ماضی کے شعائر اور رسوم کی ظاہری شکل و صورت کو تو برقرار رکھا لیکن ان کے باطن میں جو معنویت پوشیدہ تھی اسے انقلابی عمل کے ذریعہ یکسر بدل دیا بالفاظ دیگر یہ تبدیلی ہیئت سے زیادہ قلب ماہیت

کی روش ہے۔

اس بات کو چند مثالوں سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً غسل کی رسم دور جاہلیت میں بھی تھی، مگر اس دور میں لوگ یہ سمجھتے تھے کہ حالت نجاست میں ان پر شیطان کا تسلط ہو جاتا ہے ان کے جسموں میں جن اور شیطان حلول کر جاتے ہیں اس سے نجات کے لیے غسل ضروری ہے اسلام نے بھی غسل کی رسم جاری رکھی، مگر دور جاہلیت کے تصور اور اسلام کے تصور میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

اسی طرح حج کے معاملہ کو لیجئے۔ حج کی ابتدا حضرت ابراہیمؑ سے ہوئی مگر زمانہ کے تغیر کے ساتھ ساتھ اس کی معنویت مسخ ہوتی رہی۔ بعثت پیغمبرؐ کے وقت حج ایک ایسی رسم میں تبدیل ہو گیا تھا جس کا مقصد بت پرستی اور قریش کا اقتصادی فائدہ تھا مگر پیغمبرؐ کی نگاہ دیکھ رہی تھی کہ حج معاشرہ کی اصلاح میں ایک زبردست انقلابی کردار ادا کرنے کی صلاحیت اور استعداد رکھتا ہے اس لیے کہ یہ سنت حضرت ابراہیمؑ سے منسوب تھی اور دور جاہلیت میں بھی جب کعبہ بتخانہ بن گیا تھا عرب کے لوگوں نے اس بات کو فراموش نہیں کیا تھا کہ کعبہ کی بنیاد حضرت ابراہیمؑ نے رکھی تھی جو خلیل خدا تھے گویا عرب معاشرے میں حج ایک اہم تاریخی روایت کی حیثیت رکھتا تھا پیغمبرؐ نے حج کی اس اہمیت اور اثر آفرینی کی استعداد کے پیش نظر اسے ایک انقلابی اقدام کے ذریعے اپنے مکتب فکر کے مقاصد سے ہم آہنگ کر دیا اور ایک ایسی رسم کو جو دور جاہلیت میں عربوں کے متفرق قبائل کے اتحاد کی علامت اور قریش کے اقتصادی فوائد کی ضمانت بن گئی تھی ایک ایسے ادارے میں تبدیل کر دیا جو عقیدۂ توحید پر مبنی ہے وحدت بشری کی علامت ہے اور جس میں بہت گہری دور رس اور ہمہ جہت مصلحتیں پوشیدہ ہیں۔

یہ بات قابل غور ہے کہ پیغمبرؐ نے حج کو جو عربوں کے قبائلی اجتماع اور

تجارتی میلہ کی شکل اختیار کر گیا تھا اپنے انقلابی اقدام کے ذریعے ایک ایسی سنت اور ایک ایسے ادارے میں تبدیل کر دیا جس کے اغراض و مقاصد دورِ جاہلیت کے حج کے مقاصد سے بالکل مختلف بلکہ متضاد تھے لیکن یہ انقلابی تبدیلی اس خوبصورتی سے عمل میں آئی کہ عربوں میں کوئی ہیجان یا اضطراب پیدا نہیں ہوا انہیں یہ محسوس نہیں ہوا کہ ماضی سے ان کے رشتے ٹوٹ رہے ہیں یا ان کی مقدس اقدار کو تبدیل کیا جا رہا ہے بلکہ اس کے برعکس انہیں یہ احساس ہوا کہ پیغمبرؐ نے ماضی کی ایک سنت اور عظیم روایت کو جو گردشِ ایام کے ہاتھوں مسخ ہو گئی تھی آلودگی اور کثافت کا شکار ہو گئی تھی پاک صاف کر کے اس کی اصلی اور حقیقی صورت کی طرف لوٹا دیا۔ عربوں میں بت پرستی کی رسم کئی صدیوں سے جاری تھی اور در آں حالیکہ پیغمبرؐ نے بت پرستی سے توحید کا فاصلہ ایک انقلابی عمل کے ذریعہ یک لخت طے کیا لیکن عربوں کو یہ محسوس تک نہ ہوا کہ وہ اپنے ماضی سے جُدا ہو رہے ہیں یا یہ کہ ان کی صدیوں پرانی معاشرتی اور اجتماعی قدریں ٹوٹ پھوٹ کر بکھر رہی ہیں۔

پیغمبرؐ کی اس خاص حکمتِ عملی اس مخصوص طریقِ کار (TACTIC) کے متعلق ہمارا کہنا ہے کہ یہ معاشرتی اصلاح کے باب میں سب سے منفرد، اور سب سے زیادہ موثر طریقہ کار ہے اور اس طریقہ کار کو ایک جملہ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ اس طریقہ میں کسی رسم یا سنت کی ہیئت (FORM) کی صرف ضروری اور مناسب اصلاح کی ہے البتہ اس کی ماہیئت (CONTENT) کو یکسر منقلب کر دیا جاتا ہے۔

اس موقع پر ہم دیگر مکاتیبِ فکر اور مکتبِ پیغمبرؐ کے طریقِ کار کے فرق کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

ایک ایسا شخص جو قدامت پسند ہے جو ماضی کی ہر روایت کا تحفظ کرنا چاہتا ہے اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہر حال میں اور ہر قیمت پر سنتِ قدیم

کا تحفظ کرے خواہ اس کی قیمت میں اسے اپنی اور دوسروں کی قربانی پیش کرنا پڑے۔

اس کے برعکس ایک انقلابی یہ چاہتا ہے کہ ماضی کی ہر شئے کو ایک دم منقلب کردے۔ بیک قلم منسوخ کردے۔ اور ایک ایک کرکے ماضی کی تمام رسوم ورواج کو نیست ونابود کردے اور اس انقلابی جوش میں وہ اس بات کو نظرانداز کر دیتا ہے کہ معاشرہ ایسے انقلابی اقدام کے لیے آمادہ وتیار نہیں ہے اس متضاد صورتِ حال کے نتیجہ میں انقلاب کا عمل جبر وتشدد، قتل وغارت گری اور بالآخر آمریت (ڈکٹیٹرشپ) میں تبدیل ہوجاتا ہے اور اس تشدد اور قتل وغارت گری کا نشانہ صرف چند انقلاب دشمن افراد ہی نہیں رہتے بلکہ جملہ عوام اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔

جہاں تک ایسے مصلح کا تعلق ہے جو تدریجی اصلاح اور ارتقائی عمل پر یقین رکھتا ہے اس کا طریقہ کار اس قدر طولانی ہے کہ اس طویل مدت میں منفی قوتوں اور مفسدوں کو عمل کیلئے کافی اچھی طرح موقع مل جاتا ہے۔

مگر پیغمبرِ اسلام نے ان تینوں راستوں سے الگ ایک راستہ بنایا اپنی ایک مخصوص اور منفرد روش ایجاد کی اور سنتِ پیغمبرؐ کی یہی وہ مخصوص انقلابی جہت ہے جو ہر دور اور ہر معاشرے میں اصلاحی اقدام کے لیے واضح اور روشن اصول فراہم کرتی ہے ماضی کی کہنہ روایتیں ثقافت کی بے روح اقدار، مذہب کے مسخ شدہ عقائد غرض وہ تمام رجعت پسندانہ عوامل جو کسی معاشرے کو تباہی اور جمود سے دوچار کرتے ہیں ان سب سے نمٹنے کے لیے یہ مخصوص طریق کار نہایت فعال اور موثر ہے اور اگر ہم اس مخصوص طریقہ کار (TACTIC) کو سمجھ سکیں اس کا شعور حاصل کرسکیں اور اس پر عمل پیرا ہوسکیں تو معاشرے کو خرابیوں سے پاک کرسکتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ہم انقلابی عمل کی خرابیوں اور ان کے منفی اثرات سے محفوظ رہ سکتے ہیں ہم ماضی کی اقدار اور کہنہ رسوم

ورواج سے دور ہوسکتے ہیں لیکن یہ دوری عوام سے دوری نہیں ہوگی۔ کہنہ ماضی سے بے گانگی عوام سے بیگانگی نہیں بنے گی جماعت اور عوام کے درمیان کوئی خلیج حائل نہیں ہوگی مختصر یہ کہ یہ طریق کار تمام دیگر مکاتب کے منفی پہلوؤں سے پاک اور نہایت زود اثر اور ہمہ گیر ہے اس لیے کہ یہ طریقہ ایک ایسے رہبر نے تعلیم فرمایا ہے جس کی فکر کا سرچشمہ وحی تھا اور جو انسانیت کی تاریخ میں سب سے بڑا مصلح اور انقلابی ہے اور جس کا پیغام تمام انسانیت کے لیے ہر دور، ہر عہد اور ہر معاشرے کے لیے فوز وفلاح کی ضمانت اور بشارت ہے۔

مثالیت/حقیقت پسندی (IDEALISM/REALISM)

اسلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ معاشرہ کی بینی اور جبری حقیقتوں کو تسلیم کرتا ہے ان کے وجود کا اعتراف کرتا ہے اور ان کی طرف ایک مخصوص اور منفرد رویہ رکھتا ہے ان حقیقتوں کے بارے میں بھی اسلام کا انداز نظر دوسرے مکاتیب فکر کے انداز نظر سے مختلف ہے۔ مثالیت پسند ہوں یا حقیقت پسند ہوں دونوں افراط اور تفریط کا شکار ہیں مثالیت پسند صرف اعلیٰ اقدار اور مثالی اخلاق کی بات کرتے ہیں اور واقعیت اور حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں ان کی مثالیت پسندی ایک ایسا خول ہے جو انہیں ٹھوس معاشرتی اور فطری حقائق کو قبول کرنے سے باز رکھتا ہے۔ عفت، انتقام، جنسی جذبہ، مسرت اور دولت کی طلب ایسی حقیقتیں ہیں کہ جن کا انکار ممکن نہیں۔ لیکن مثالیت پسندی خواہ اخلاقی ہو (زہد) یا مذہبی (مسیحیت) ان تمام حقیقتوں سے چشم پوشی کر کے ان کا انکار کرتی ہے اور ان کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اس کے برعکس مکتب حقیقت پسندی (REALISM) ہر بات کو اس لیے قبول کر لیتا ہے کہ وہ موجود ہے گویا اس مکتب میں حقیقت/واقعیت کا وجود اس کے تسلیم کرنے کے لیے کافی ہے اسی منطق کے تحت انگلستان میں لواطت کو

جائز تسلیم کر لیا گیا ہے جبکہ دوسری طرف مسیحیت کی مثالیت پسندی طلاق کو حرام قرار دیتی ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ان کے نزدیک رشتۂ ازدواج ایک مقدس رشتہ ہے جسے توڑا نہیں جا سکتا علاوہ ازیں اس رشتہ کے ٹوٹنے سے خاندانی تنظیم قائم نہیں رہ سکتی اور خاندانی تنظیم کی حفاظت اس لیے ضروری ہے کہ یہ ایک مقدس تنظیم ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ ہر موقع اور ہر صورت میں اس مقدس رشتۂ ازدواج کو قائم رکھ سکے ہوتا یہ ہے کہ زوجین ایک عمر تک ایک دوسرے سے بے گانہ اور متنفر رہتے ہیں ان کی ازدواجی زندگی الجھنوں اور پریشانیوں کا شکار رہتی ہے وہ ایک حالت جبر میں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں ان کا تعلق مجبوری ہے سماجی اور معاشرتی جبر ہے ورنہ ان میں کوئی الفت یا یگانگت نہیں ہے ان کا باہمی ربط و تعلق عشق و محبت کے ذریعے قائم نہیں ہے شرع کی مجبوری کے ذریعہ قائم ہے یہ دو انسان، دو مجبور و درماندہ انسان جو اپنی خواہش اور پسند کے خلاف ایک دوسرے کے ساتھ رہنے پر مجبور ہیں ممکن ہے کہ کسی دوسرے انسان کی رفاقت میں مطمئن اور مسرور زندگی بسر کر سکتے یہ ازلی اور ابدی حقیقت ہر دور میں موجود رہتی ہے یہ کل بھی ایک حقیقت تھی آج بھی ایک حقیقت ہے اور آئندہ بھی ایک حقیقت رہے گی یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو متمدن، غیر متمدن، مذہبی، غیر مذہبی ہر قسم کے معاشروں میں موجود ہے لیکن مسیحیت اس واضح اور مستقل حقیقت کا انکار کرتی ہے اس لیے کہ اس کی نظر میں رشتۂ ازدواج مقدس ہے اور دو ایسے انسانوں کو جو ایک بار رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے اس رشتہ پر قائم رہنا چاہیئے خواہ ان کی زندگی جہنم کا نمونہ بن جائے خواہ وہ ایسے ماحول میں رہتے ہوں جو جرم اور فساد کا ماحول ہے مگر اس ضمن میں جو اہم بات نظر انداز کر دی جاتی ہے وہ یہ کہ طلاق کا ایک دروازہ بند کر کے اخلاقی خرابیوں کے بے شمار دروازے وا کر دیے جاتے ہیں۔

غیر شرعی ازدواج (CONCOBINAGE)

اجتماعی حقیقتیں، اگر انہیں اپنے اظہار کا مناسب راستہ نہ ملے تو خود اپنے لئے راہیں بنا لیتی ہیں ان کی مثال ایسے پرندوں کی سی ہے کہ اگر ان پر قفس کا دروازہ بند کر دیا جائے تو وہ قفس کی تیلیوں کو توڑ کر باہر آجاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ حرمت طلاق کا قانون، غیر شرعی ازدواج کو رواج دینے کا سبب بنا یعنی ایک شوہر جس کے لیے اپنی شرعی بیوی کے ساتھ زندگی گذارنا ممکن نہیں رہتا اپنی بیوی سے الگ ہو جاتا ہے مگر اسے طلاق نہیں دے سکتا یہی صورتحال بیوی کے ساتھ پیش آسکتی ہے کہ وہ شوہر کے ساتھ رہنے سے معذور ہے مگر اس سے طلاق حاصل کرنا ممکن نہیں ہے اس لیے وہ بغیر طلاق کے شوہر سے عملاً الگ ہو جاتی ہے پھر دونوں شوہر اور بیوی کسی دوسری عورت اور کسی دوسرے مرد کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہو اور بغیر کسی نکاح کے ازدواجی زندگی بسر کرتے ہیں یہ ایک سنگین اور وحشناک صورت حال ہے ایسے جوڑوں کی اولاد اکثر و بیشتر نفسیاتی بیماریوں اور ذہنی الجھنوں کا شکار ہوتی ہے ان میں شدید مجرمانہ رجحانات پائے جاتے ہیں اور وہ معاشرے کے امن و سکون کو غارت کرنے کا سبب بنتے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ شوہر اور بیوی جن کے درمیان اختلاف اور تضاد پایا جائے اور وہ دونوں ایک دوسرے سے بیگانہ ہوتے جائیں یہاں تک کہ وہ اس نتیجہ پر پہنچیں کہ ان کے لیے اپنے اختلافات کو حل کرنا اور محبت اور یگانگت کے ساتھ رہنا ممکن نہیں ہے تو پھر اس مسئلہ کا فطری حل یہی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔ (اور اس علیحدگی کی قانونی شکل طلاق ہے)

اس طرح مرد آزاد ہو کر گھر سے باہر قدم رکھتا ہے اور زندگی کی وسیع اور کشادہ فضا میں اپنی پسند کی عورت کو تلاش کر لیتا ہے جو صحیح معنوں میں اس کے لیے رفیقہ حیات ثابت ہوتی ہے پھر وہ دونوں مل کر ایک نیا گھر بساتے

ہیں اور ایک خوش گوار زندگی گزارتے ہیں۔ یہی صورت عورت کے ساتھ بھی پیش آتی ہے یعنی عورت طلاق کے نتیجہ میں آزاد ہونے کے بعد اپنے لیے نیا ساتھی تلاش کرلیتی ہے اور جائز طور پر نیا گھر لبا لیتی ہے اس طرح ایک گھر کی شکست وریخت دو نئے گھرانوں کی تعمیر کا سبب بنتی ہے۔ پہلا گھر ایک ناپائیدار اور غیر مربوط اکائی تھا اب جو دو گھر بنے ہیں وہ پائیدار اور مربوط اکائیاں ہیں مگر مسیحیت کی مثالیت پسند روش اس حقیقت کو جو معاشرے میں ایک ناقابلِ انکار وجود رکھتی ہے۔ جس کی واقعیت سے انکار کرنے کی سکت کسی میں بھی نہیں ہے تسلیم نہیں کرتی۔ اس کی طرف سے آنکھیں بند کرلیتی ہے نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس گھر کو تو تسلیم کرتی ہے جس کا وجود صرف رسمی اور خیالی ہے اور جو حقیقی اور خارجی دنیا میں کوئی وجود نہیں رکھتا جس کا سامانِ تعمیر دوسرے گھروں کی تعمیر میں صرف ہوچکا ہے مگر وہ دو خاندان حقیقت کی دنیا میں جن کا وجود مسلّم ہے ان کا انکار کرکے حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کرلیتی ہے اور یہی وہ موقع ہے جہاں ہم شریعت قانونِ فطرت اور سماجی حقیقت میں تضاد اور تفاوت کو ابھرتا ہوا دیکھ سکتے ہیں یعنی ایک خاندان جو حقیقتاً موجود نہیں ہے اسے رسمی سطح پر موجود مانا جاتا ہے جبکہ دو ایسے خاندان جو واقعی موجود ہیں جن کا وجود حقیقی دنیا میں مسلم ہے انہیں تسلیم نہیں کیا جاتا اور ان کی شرعی حیثیت کا انکار کرکے انہیں فحشاء وگناہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

دراصل مسیحیت کا حقیقت سے انکار اس بات کا سبب بنا کہ دو ایسے خاندان جو حقیقی دنیا میں وجود میں آچکے ہیں شریعت کی سند اور جواز سے محروم ہیں اور وہ بچے جو مرد اور عورت کے اس فطری اور طبعی تعلق کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں جو واقعی محبت اور یگانگت کا تعلق ہے انہیں جائز اولاد تسلیم نہیں کیا جاتا اور معاشرہ انہیں نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے یہ بچے جو خاندان کی پاکیزگی اور معاشرے کے التفات سے محروم رہتے ہیں اور معاشرہ انہیں قبول نہیں کرتا

اس لیے کہ وہ فرزاندانِ گناہ ہیں ناجائز بچے ہیں اپنے حالات اور معاشرے کے رویے کے تحت گونا گوں ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں ان کی شخصیت میں ایسی گرہیں پڑ جاتی ہیں جو ہزارہا خرابیوں اور جرائم کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں یہ بچے بڑے ہو کر معاشرے سے اپنی محرومیوں کا ایسا سنگین انتقام لیتے ہیں جس کی ہولناکیاں ناقابلِ تصور ہیں۔

یورپ اور خصوصاً امریکہ کے معاشروں میں جو کجیاں اور جرائم ظاہر ہوتے ہیں پسماندہ اور غیر متمدن معاشروں میں ان کی مثال نہیں ملتی ان کا سبب یہ ہے کہ اگرچہ مغربی معاشرے ترقی یافتہ ہیں ان کی ثقافت اور تمدن، ان کے ذہنی اور اخلاقی تربیت کے معیار اور انفرادی اور اجتماعی آزادی کا تصور ان کی ترقی کی دلیل ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود ان کی نئی نسل الجھنوں اور پیچیدگیوں کا شکار ہے نوجوان نسل داخلی طور پر جرم اور گناہ کے احساس میں گرفتار ہے۔ یہی داخلی الجھنیں ان سنگین جرائم کو جنم دیتی ہیں جنہوں نے آج مغربی معاشروں کو تباہ کر رکھا ہے دراصل جرائم کی یہ بہتات احساس جرم و گناہ میں پرورش پانے والی نسل کا اپنے معاشرے سے ایک سنگین اور خوفناک انتقام ہے۔

میں آپ کو انگلستان کا ایک واقعہ سناتا ہوں ایک نوجوان نے ایک ایسا ہتھیار بنایا جسے ہم بہت چھوٹے تیر اور کمان سے تشبیہ دے سکتے ہیں اس حربہ کو اس نے ایک ایسے تختہ کے نیچے پوشیدہ طور پر نصب کر لیا جس تختہ پر وہ سگریٹ سجا کر فروخت کرتا تھا اس نے یہ طریقہ بنالیا تھا کہ وہ شاہراہوں اور سینما گھروں میں جہاں لوگوں کا ہجوم ہوتا گھوم پھر کر سگریٹ بیچا کرتا اور اس آڑ میں وہ لوگوں کو زہریلے تیروں کا نشانہ بنایا کرتا جو لوگ ان تیروں کا نشانہ بنتے وہ یا تو مر جاتے یا کم از کم اندھے ہو جاتے پولیس قاتل کو تلاش کرنے میں ناکام رہی اس لیے کہ وہ قاتل کو تلاش کرنے کے لیے قاتل اور مقتولین کے درمیان عداوت اور دشمنی کی کڑیاں تلاش کرتی رہی لیکن یہ کڑیاں پولیس کے ہاتھ نہیں آسکیں اس لیے

کہ سبب قتل، قاتل اور مقتولین کے درمیان کوئی ذاتی عداوت نہیں تھا بلکہ وہ خلش تھی جو قاتل کے ذہن میں اس لیے پیدا ہوئی کہ مقتول اس معاشرے کا ایک فرد تھا جس نے قاتل کو مردود اور ناپسندیدہ قرار دیا تھا گویا قتل کی یہ تمام واردتیں قاتل کے جذبۂ انتقام کی تسکین کا ذریعہ تھیں اور یہ ذریعۂ انتقام ایسا شدید اور سنگین تھا جس کی تسکین کسی صورت ممکن نہیں تھی۔

اس طرح کے جرائم معاشرتی حالات سے جنم لیتے ہیں اور معاشرتی حالات میں یہ پیچیدگیاں اس لیے پیدا ہوتی ہیں کہ کلیسا نے حقیقت اور واقعیت کی طرف سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ خوش قسمتی سے ہمارے معاشرے ان مسائل سے پاک ہیں ہمارے معاشرے میں چونکہ طلاق کی اجازت ہے اس لیے ناجائز خاندان (خانوادۂ نامشروع) وجود میں نہیں آتے اسی طرح ہم نے چونکہ طلاق کو معدوم نہیں کیا ہے تو ہمارے یہاں ”خانوادۂ معدوم“ کا کوئی وجود نہیں ہے یعنی ہمارے یہاں ایسے گھر نہیں پائے جاتے جہاں اس گھر کے مکین ایک جبر، زبردستی اور قانونی اور شرعی مجبوری کے تحت رہتے ہیں۔

میں آپ کے سامنے مثال پیش کرتا ہوں۔ ایک بچہ ہے جو کمرے سے باہر جانا چاہتا ہے مگر سماور، چائے دانی اور دوسرے ظروف زمین پر بکھرے ہوئے ہیں جنہوں نے اس کا راستہ مسدود کر دیا ہے وہ بچہ آنکھیں بند کر لیتا ہے اور چاہتا ہے کہ راستے سے گزر جائے آنکھیں بند کر کے وہ یہ سمجھتا ہے کہ راستے کی تمام رکاوٹیں خود بخود دور ہو گئی ہیں مثالیت پسند (آئیڈیلیسٹ) کی مثال اسی نادان بچے کی سی ہے۔ وہ حقیقت کو نہیں دیکھتا اس لیے کہ وہ حقیقت کو دیکھنا نہیں چاہتا وہ جن چیزوں کو پسند نہیں کرتا ان کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ کیونکہ وہ ان حقیقتوں کو نہیں دیکھ رہا اس لیے واقعی وہ حقیقتیں موجود نہیں ہیں۔

اس کے برعکس ایک حقیقت پسند ہے (ریالسٹ) جو ہر اس شے کو جو خارجی

وجود رکھتی ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی گھناؤنی اور بری ہو محض اس لیے قبول کر لیتا ہے کہ واقعیت کی دنیا میں موجود ہے اور نہ صرف ان موجود حقیقتوں کو قبول کر لیتا ہے بلکہ انہیں اپنا عقیدہ اور ایمان بنا لیتا ہے اس کے برعکس ہر وہ بات، خواہ وہ کسی قدر حسین اور اعلیٰ ہو جو خارجی دنیا میں موجود نہیں ہے اس کے نزدیک ناقابلِ قبول ہے۔ وہ ایسے تمام اعلیٰ اصولوں اور حسین قدروں کا انکار کر دیتا محض اس لیے کہ اس کے نزدیک وہ مثالی (آئیڈیل) ہیں اور ان کا حقیقت کی دنیا میں وجود نہیں ہے۔

میرا ایک شاگرد تھا جس کا تعلق اس ملک کے دانشور نما، طبقہ سے تھا میں اس سے خواہ کچھ بھی گفتگو کروں وہ صرف ایک ہی بات جانتا تھا کہ وہ مارکس کی مادی جدلیات کے عقیدہ کا طرفدار ہے اور میں ایک مذہبی آدمی ہوں جو اسلام پر عقیدہ رکھتا ہے اس وجہ سے اس نے اپنا یہ فرض سمجھ لیا تھا کہ میں جو بات بھی کہوں وہ اسے رد کرے یہاں تک کہ اگر میں کوئی ایسی حقیقت بیان کروں جو مارکس کے نزدیک بھی پسندیدہ ہو اور میں اس بات کا ذکر نہ کروں تو بھی وہ ہمیشہ کی طرح میری بات کی مخالفت کا فرض پورے جوش و خروش سے انجام دیتا تھا۔

ایک دن موضوع گفتگو تاریخ اسلام میں بنی امیہ کا عہد تھا۔ اس عہد میں طبقاتی تقسیم اور سیاسی آمریت کو مذہبی جواز عطا کرنے کے لیے مذہب کی صحیح روش سے انحراف کر کے عقیدۂ جبر کو وضع کیا گیا تاکہ لوگ بنی امیہ کی حکومت کو خدا کی مرضی سمجھ لیں اور وضع موجود کو جبر الٰہی ثابت کیا جا سکے میں نے اس ضمن میں ان لوگوں کا بھی ذکر کیا جو حکومت کی اس سازش کے خلاف مزاحمت کر رہے تھے۔

اس مرحلہ پر میں نے دیکھا کہ میرا وہ طالب علم کبیدہ خاطر ہو گیا ہے۔ میں نے مزید وضاحت کی کہ میں بنی امیہ کا ذکر کر رہا ہوں اور ان کے مقابلے میں فاطمہؑ، علیؑ، ابوذرؓ، حجرؓ اور حسینؑ جیسی ہستیوں کا ذکر کر رہا ہوں

جو تحریک عدل و آزادی کی رہبر اور ظلم و جہالت کے خلاف جہاد کی علامت ہیں اور پھر یہ کہ ان کا جہاد محض زبانی، نظری یا مابعد الطبیعاتی سطح تک محدود نہیں تھا بلکہ وہ ایک ایسا عملی جہاد تھا جس کی اساس سماجیات کے محکم علمی اصولوں پر تھی جو ایک ایسی آیڈیولوجی پر منحصر تھا جو طبقاتی تقسیم کے خلاف اور عوامی ترقی کی علمبردار ہے لیکن ہمارے اس طالب علم نے جس کا تعلق خود ساختہ دانشوروں کے طبقہ سے ہے میری ان معروضات کو اپنے مخصوص نکتہ نظر سے دیکھا کیا آپ جانتے ہیں کہ اس نے ان خیالات کی کس طرح پذیرائی کی۔ اس نے کہا جناب یہ جبر تاریخ ہے مارکس کا فلسفۂ تاریخ یہی ہے کہ معاشرہ اپنے ارتقائی سفر میں اپنے تضاد اور تصادم کے مراحل سے گزرتا ہے۔ معاشرے کے ارتقائی سفر کو روکا نہیں جا سکتا یہ ایک معروضی اور تاریخی حقیقت تھی۔ علیؑ، حسینؑ اور ابوذرؓ (آیڈیلسٹ) مثالیت پسند تھے وہ جبرِ تاریخ کے خلاف صف آرا تھے۔

میں نے اس طالب علم کی اس منطق کو سن کر کہا کہ اگر روشن فکری کا طرز فکر یہی ہے تو خدا رحم کرے اس موقع پر میں نے اپنے اس خیال کی صداقت کو بڑی شدت سے محسوس کیا کہ جب کسی معاشرے کی سطحِ فکر و نظر پست ہو جاتی ہے تو پھر مذہبی اور غیر مذہبی، ترقی پسند اور رجعت پسند، عالم اور جاہل کا فرق بھی ختم ہو جاتا ہے اور سب کے سب اس تنزل اور پستی کا شکار نظر آتے ہیں جب مذہب کا دور دورہ ہوتا ہے تو لوگ قضا و قدر کے مفہوم کو سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں اور قضا و قدر کو جبر الٰہی سمجھتے ہیں وہ اس بات پر اعتقاد رکھتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اللہ کی مشیت اور اس کی مرضی کے مطابق ہے (یعنی انسان ان حالات کو قبول کرنے میں مجبور اور بدلنے سے معذور ہے) اور جب مارکسزم کے اثرات غالب ہوتے ہیں تو جبر الٰہی کا عقیدہ جبرِ تاریخ کے تصور سے بدل جاتا ہے پھر یوں کہا جاتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اسباب و علل کا ایک منطقی اور علمی نتیجہ ہے اور علت اور معلول کی اس زنجیر کو توڑنا انسان کے عزم و ارادے کے

دائرے سے باہر ہے انسان حقیقت اور واقعیت کو قبول کرنے پر مجبور ہے۔

کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ تاریخ اسلام میں بنی امیہ نے اپنے اعمال کو دینی جواز فراہم کرنے کے لیے جو عقیدۂ جبر وضع کیا تھا آج کے دور میں ہمارے خود ساختہ دانشور مارکسزم کے فلسفہ کی رو سے اس عقیدۂ جبر الٰہی کی نئی توجیہ کر رہے ہیں اور اسے جبر تاریخ کا نام دے رہے ہیں۔

مگر اس دانشورانہ منطق کے جواب میں مجھے صرف اس قدر کہنا ہے کہ "جناب! یہ جبر تاریخ نہیں ہے یہ جبر شمشیر ہے"

بدقسمتی سے ہمارے اکثر و بیشتر نیم دانشور، طاقت کے جبر اور حالات یا تاریخ کے جبر کو ایک ہی بات سمجھ لیتے ہیں حقیقت پسند حضرات ایک قدم آگے بڑھا کر جو کچھ ہے اور جو ہونا چاہیئے کا فرق بھی ختم کر دیتے ہیں ان کے خیال میں جو بات جیسی کچھ بھی ہے ویسی ہی ہونی چاہیئے تھی ان کے خیال میں کسی بات کے متعلق یہ کہنا کہ اسے یوں ہونا چاہیئے تھا ایک مثالیت پسندانہ طرز فکر ہے جس کا تعلق حقیقی دنیا سے بہت موہوم ہے اس منطق کی رو سے انگلستان کے اراکین پارلیمنٹ کا یہ استدلال ہے کہ ہمارے معاشرے میں 'لواطت' ایک موجود حقیقت ہے اس لیے اسے قانونی جواز فراہم کر دینا چاہیئے اس حقیقت موجود کی مخالفت ایک طرح سے خیالی دنیا کی باتیں کرنا ہے آیئڈیلزم ہے۔

کیا آپ نے ایسے سیاستدانوں اور جھوٹے دانشوروں کو نہیں دیکھا کہ جو یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ اسرائیل ایک ایسی حقیقت اور واقعیت ہے جو موجود ہے اس کے برعکس فلسطین میں ان فلسطینیوں کی آباد کاری جنہیں اسرائیل نے دھونس اور دھاندلی کے ذریعہ ان کی اپنی زمین سے نکال دیا ہے خواب و خیال کی باتیں ہیں آیئڈیل کی پرستش کرنا ہے اسرائیلی اقدام ظلم ہے قتل و غارت گری ہے۔ انسانیت دشمنی ہے لیکن اس سب کے باوجود ایک واقعیت ہے ایک حقیقت ہے جسے قبول کرنا ضروری ہے۔

مجلہ "این ہفتہ" جو حال ہی میں نوجوانوں کے لیے جاری کیا ہے اس رسالے کے تمام مضامین، خبریں، فیچر تصاویر، غرض اس کا تمام مواد درحقیقت صرف دو یا تین شخص لکھتے ہیں مگر ان کی تحریریں مختلف قلمی ناموں سے شائع ہوتی ہیں یہ قلمکار تنقید کی آڑ میں، فحاشی کے اڈوں کی کہانیاں تمام جزئیات اور تشریحات کے ساتھ تحریر کرتے ہیں اور پھر یہ رنگین تحریریں اور تصویریں ہماری نئی نسل کی معلومات اور دلچسپی کے لیے شائع کی جاتی ہیں ایک مضمون جو درحقیقت ایک چوٹی کے قلمکار نے تحریر کیا ہے اور یہ قلمکار ایک علمی اور سیاسی شخصیت اور اسلامی ثقافت کا علمبردار ہے اس مضمون میں ان خواتین کو جو اپنے جسم کی فربہی سے پریشان ہیں مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ موٹاپے سے نجات پانے اور اپنے جسم کو سڈول اور دلکش بنانے کے لیے کوئی عاشق، فاسق تلاش کرلیں غالباً محترم لکھنے والوں نے ان ترکیبوں کو پہلے خود آزمایا ہوگا اور پھر اپنے عملی تجربات نوجوانوں کے فائدے کے لیے بیان کئے ہیں۔

سیاسی استعمار اقتصادی استحصال اور طبقاتی تضاد بھی ایک واقعیت ہے حقیقت پسند ان حقیقتوں کو واضح اور روشن طور پر دیکھتا ہے وہ ان کے بارے میں کوئی تردد یا تفکر نہیں کرتا حقیقتیں جو عینی اور خارجی وجود رکھتی ہیں جو دیکھی اور محسوس کی جاسکتی ہیں انہیں وہ بلا تامل قبول کرلیتا ہے وہ اپنے آپ کو آئیڈیل (مثالیت پسندی) کے تصور میں نہیں الجھاتا ایک آئیڈیلسٹ ایک مثالیت پسند مفکر جو معاشرے کی اصلاح اور ترقی کا خواہشمند ہے اس کی نگاہ ہمیشہ بلند اصولوں، اعلیٰ اخلاقی اقدار اور مثالی امکانات پر ہوتی ہے اور وہ ناپسندیدہ حقائق جو اس مثالیہ کی راہ میں حائل ہوتے ہیں اور جو حقیقت کی دنیا میں اس طرح موجود ہیں کہ ان کا انکار ممکن نہیں ہے اس کی آنکھوں سے اوجھل رہتے ہیں وہ ان حقیقتوں سے آنکھیں چار نہیں کرتا جو باتیں اسے ناپسند ہیں ان سے کنارہ کشی اختیار کرکے خود کو ایک مثالی، حسین مگر خیالی دنیا میں محصور

کرلیتا ہے اور اس بات کا احساس نہیں کرتا کہ وہ جس دنیا میں موجود ہے وہ یہ خیالی اور مثالی دنیا نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی دنیا میں رہتا ہے جس کے حالات اور ماحول مثالی نہیں ہے لیکن وہ اس دنیا کے حقائق کے بارے میں کوئی غور وفکر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا گویا اس کے نزدیک یہ حقیقتیں کوئی وجود نہیں رکھتیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ عملاً ایسی دنیا میں رہتا ہے جو موجود ہے۔

مگر سوچتا ہے اس دنیا کے متعلق جو "موہوم" اور غیر موجود ہے وہ گفتار میں سب سے آگے مگر عمل میں سب سے پیچھے ہے وہ ایک ایسے معاشرے کی تعمیر کرتا ہے جو مثالی ہے نقائص سے پاک ہے لیکن یہ جیتے جاگتے انسانوں کا معاشرہ نہیں ہے۔ لفظوں کا معاشرہ ہے یہ ایک خیالی دنیا ہے ایک یوٹوپیا ہے "مدینۂ افلاطون" ہے جو مدینۂ محمدؐ سے مختلف ہے۔

اس کے برعکس حقیقت پسند (ریالسٹ) فکر کی پرواز، قلب ونظر کی ترقی اور تلاشِ کمال کے جذبہ کو آدمی سے چھین لیتا ہے اسے "عالمِ موجود" کے حلقہ میں بند اور اقتدار و وضع موجود کے حصار میں قید کردیتا ہے۔ انسانوں خلاقیت اور بغاوت کی استعداد سے محروم کرکے اس کی ان تمام صلاحیتوں کو مفلوج کردیتا ہے جو زندگی میں کوئی گہری تبدیلی لانے اور جبر تاریخ اور جبر معاشرت کے خلاف جدوجہد پہ آمادہ کرنے کا سبب بنتی ہے وہ انسانوں کو خوب سے خوب تر کی تلاش سے روک دیتا ہے ان کی فکری اور عملی صلاحیتوں اور وضع موجود کو بہتر بنانے کی خواہش اور تمنا کو دبا اور مٹا کر انہیں اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ واقعیت کو تسلیم کرلیں اور جو کچھ بھی اور جیسا کچھ بھی ہے اس کے آگے سر جھکادیں

گویا حقیقت پسندی اگر بھوکے کی شخصیت کو مسموم کرتی ہے تو مثالیت پسندی اس کی بھوک کی حقیقت ہی سے انکار کردیتی ہے

نہ صرف مثالیت پسندی نہ صرف حقیقت پسندی بلکہ دونوں

اسلام وہ چراغ ہدایت ہے جو نہ شرقی ہے نہ غربی ہے[1] یہ وہ کلمہ طیبہ ہے جس کی مثال ایک ایسے پاکیزہ درخت (شجر طیبہ) سے دی گئی ہے جس کی جڑیں زمین میں ہیں اور جس کی شاخیں آسمان میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اسلام ان حقیقتوں کو جو زندگی میں روح و جسم میں معاشرتی روابط میں، معاشرہ کی بنیاد میں حرکتِ تاریخ میں موجود ہیں تسلیم کرتا ہے اسلام کی یہ روش مثالیت پسندی کی ضد ہے اور حقیقت پسندی کی روش کے مماثل ہے لیکن اسلام حقیقت پسندانہ مکتبِ فکر کے برخلاف ان حقیقتوں کو تسلیم کرنے کے باوجود قبول نہیں کرتا بلکہ ان کو بدلتا ہے ان کی ماہیت کو اپنی انقلابی روش کے ذریعہ منقلب کرتا ہے انہیں اپنے آئیڈیل کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے ان موجود حقیقتوں کو اپنے اعلیٰ مقاصد کے حصول کا ذریعہ بناتا ہے جو حقیقت پسندوں کی طرح حقیقتِ موجود کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرتا بلکہ موجود حقیقت کو اپنی حقیقتِ مقصود کے تابع کر لیتا ہے اسلام مثالیت پسندوں کی طرح حقیقت سے گریز نہیں کرتا ان کا سراغ لگاتا ہے ان کو لگام دیتا ہے انہیں رام کرتا ہے اور اس طرح وہ حقیقتیں جو مثالیت پسندوں کی راہ کا پتھر تھیں اسلام انہیں اپنا مرکب بنا لیتا ہے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے ان سے سواریوں کا کام لیتا ہے

مثلاً غیر شرعی ازدواج (CONCOBINES) کے مسئلہ کو لیجیے جو یورپ میں ایک غیر قانونی، ناپاک اور قابلِ نفرت حقیقت سمجھے جانے کے باوجود پوری قوت کے ساتھ موجود ہے اور یورپی ممالک کے علاوہ امریکہ اور بہت سے دیگر مذہبی ممالک اور مذہبی گروہوں میں نہ صرف رائج ہے بلکہ مزید پھیلتا جا رہا ہے اسلام نے مخصوص حالات اور شرائط کے تحت طلاق اور اس کے بعد دوسری شادی

---

[1] سورہ نور، آیہ ۳۵ کی طرف اشارہ ہے۔

کی اجازت دیکر ایک حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ حقیقت کو تسلیم نہ کرنے سے حقیقت مٹ نہیں سکتی بلکہ اپنی جگہ موجود رہتی ہے اور اس کے ساتھ ہی آپ کے دسترس اور قابو سے باہر ہو جاتی ہے اسلام نے اس حقیقت کو تسلیم کر کے اس پر تسلط حاصل کر لیا اسے قانونی اور شرعی جواز عطا کر کے اسے اپنی شریعت اور قانون کا پابند کر دیا طرفین کو اپنے مقررہ اصول و شرائط کا پابند کر کے انہیں احساس جرم وگناہ سے نجات دی اور خلق خدا کی نگاہوں میں مردود و مجرم ہونے سے محفوظ رکھا ہے بعد از طلاق شادی کو اخلاقی اور مذہبی تحفظ فراہم کر کے ان کی اولاد کے لیے پاک و پاکیزہ اور فطری ماحول فراہم کیا اور ان بچوں کو معاشرے کی نظر میں، حقیر، ناپاک، نجس، ناجائز اور مردود ہونے سے نجات دی۔

اسلام ان تمام حقیقتوں کو قبول کرتا ہے جو انفرادی اور اجتماعی سطح پر بطور ایک واقعیت موجود ہیں ان حقیقتوں کا اعتراف کر کے اسلام انہیں اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور نتیجتاً ان کے نتائج اور عواقب کو بدلنے کی قدرت حاصل کر لیتا ہے اسلام ان حقیقتوں کی شکل میں ضروری اصلاح کر کے انہیں مذہبی اور اخلاقی سانچے میں ڈھال دیتا ہے نتیجہ یہ کہ حقیقت کی ہیئت اور ماہیت دونوں کی اصلاح ممکن ہو جاتی ہے یہ حقیقت موجود کا اعتراف ہے جو ہمیں یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ ہم ان موجود حقیقتوں کی اصلاح کر سکیں ان پر قابو حاصل کر سکیں ان پر تسلط پا سکیں حقیقت موجود کا انکار کر کے ہم حقیقتوں کو خود پر مسلط کر لیتے ہیں پھر بجائے اس کے کہ ہم ان حقائق کو اپنی مرضی اور ارادے کے مطابق بدل سکیں یہ حقائق ہمیں اپنی مرضی اور ارادے پر چلاتے ہیں جدھر چاہتے ہیں بہائے جاتے ہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک حقیقت پسند کے مقابلہ میں جو ہر حقیقت موجود کو خواہ وہ اچھی ہو یا بری قبول کر لیتا ہے ایک مثالیت پسند جو ہمیشہ حقیقت سے چشم پوشی کر کے خیالی اور مثالی باتوں کے متعلق سوچتا ہے اپنی عملی زندگی میں ان موجود حقیقتوں کے آگے زیادہ مجبور اور بے بس نظر آتا ہے اس کی وجہ یہی ہے

کہ حقیقت پسند تو حقیقتوں کو جانتا اور پہچانتا ہے لیکن مثالیت پسند ان کی طرف سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہے اور جب وہ عملی زندگی میں ان حقیقتوں سے دوچار ہوتا ہے تو بری طرح مغلوب ہو جاتا ہے۔

کیا ہم نہیں دیکھتے کہ وہ لڑکیاں جو قدامت پسند ماحول میں پرورش پاتی ہیں اور جو اپنے گھر کے پائیں باغ میں سیر کرتے اور حوض کا نظارہ کرتے وقت بھی اپنے چہروں کو نقاب سے چھپائے رکھتی ہیں کہ کہیں حوض کی نر مچھلیاں ان کے چہرے کو نہ دیکھ پائیں وہ جب عملی زندگی میں قدم رکھتی ہیں تو انہیں کس قدر دشواریاں پیش آتی ہیں کیونکہ وہ اپنے دست وبازو سے کام لینے اور وقت کے دریا میں تیرنے کی صلاحیت سے محروم ہوتی ہیں اس لیے وقت کے سیلاب کی تند موجیں انہیں غرق کر دیتی ہیں یہی حال ان نوجوانوں کا ہے جنہیں روایت پسندی اور قدامت پسندی کے حصار میں مقید رکھا جاتا ہے وہ قرون وسطیٰ کے ماحول میں پرورش پاتے ہیں سائنسی علوم ان کے لیے شجرِ ممنوعہ ہیں یونیورسٹی اور کالج کی تعلیم کے دروازے ان کے لیے بند ہیں ان کی وضع قطع ان کی ہیئت ان کی شکل وصورت ان کا لباس ان کا رہن سہن طرزِ گفتگو، آدابِ نشست و برخاست سب اسی قدیم وضع پر قائم ہیں وہ ٹیکسی کے بدلے گھوڑا گاڑی میں سفر کرتے ہیں لاؤڈ اسپیکر اور ریڈیو کے استعمال سے ناواقف ہوتے ہیں جدید دنیا کے حقائق ومسائل سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ پھر جب انہیں عملی زندگی کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو ان کی کیا حالت ہوتی ہے وہ جدید تہذیب وتمدن کی چکا چوند سے کس قدر متاثر ومغلوب ہو جاتے ہیں۔ جدید تہذیب وثقافت کی نقالی وہ اس بھونڈے طریقے سے کرتے ہیں اور اس قدر بے اعتدالی اور فضول خرچی کا مظاہرہ فرماتے ہیں کہ خود جدید تہذیب کے علمبردار، مغربی دنیا کے لوگ ان پر ہنستے ہیں ان کا مذاق اڑاتے ہیں ان کو حیرانی اور تعجب کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اس لیے کہ مغربی دنیا کے باشندوں کے لیے جدید تہذیب وثقافت ایک حقیقی واقعیت ہے جسے انہوں نے فطری

طور پر قبول کیا ہے وہ ان کے لیے ایک فطری اور طبعی حقیقت ہے جبکہ ہمارے لیے صورتِ حال اس کے برعکس ہے ایک طرف تو ہم ان واقعیتوں کا انکار اور ان سے اغماض کرتے ہیں ان سے اپنا دامن کھینچتے ہیں دوسری طرف جب وقت اور حالات ہمیں ان موجود حقیقتوں کے روبرو کر دیتے ہیں تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کیا کریں چونکہ ہم پہلے سے ان مسائل سے واقفیت نہیں رکھتے اس اس لیے ہم ان میں اچھی اور بری حقیقتوں کا انتخاب نہیں کر سکتے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بجائے اس کے کہ ہم ان حقیقتوں کو اپنے طور پر چنتے اور یہ موجود حقیقتیں ہمیں اپنے لیے چن لیتی ہیں۔

ہماری دنیا پر تمدن جدید کا حملہ بڑا ہمہ گیر اور ہمہ جہتی حملہ ہے ماضی کے تمام سرچشمے خشک ہو گئے تمام مینار منہدم ہو گئے تمام آثار مٹ گئے نشاۃ ثانیہ قرونِ جدید کا ظہور فکر و نظر میں روشن فکری کی انقلابی تحریک فرانس کا صنعتی انقلاب ایسے پے درپے عوامل ہیں جنہوں نے دنیا کے نقشہ کو بدل دیا فکری اور نظری ماحول میں عوامی انقلاب برپا کر دیا ہمارے ملک کا اس تغیر و تبدیلی سے متاثر ہونا ناگزیر ہے ایک جبری اور فطری عمل ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو جلد یا بدیر واقع ہو کر رہے گی۔ برق، مشین، پریس، یونیورسٹی، جمہوریت، ریڈیو، ٹیلیویژن، سینما، اخبار مطبوعات، مغربی تعلیم بیرونی درس گاہوں کی تعلیم، جدید علوم، جدید ٹیکنک آزادی، حقوق انسانی کا تصور، عورتوں اور مردوں کی مساوات کا نعرہ اور تمدن جدید کے دوسرے مظاہرے ہمارے انفرادی اور اجتماعی معاملات پر اثرانداز ہو کر رہیں گے جس کے نتیجے میں ہماری فکر، ہماری سوچ، ہماری رسوم درواج ہمارے اجتماعی روابط، ہمارا معاشرتی اور اقتصادی ڈھانچہ ہماری سیاسی ہیئت غرض ہماری زندگی کے تمام انفرادی اور اجتماعی شعبوں میں انقلابی تبدیلیوں کا رونما ہونا ایک بدیہی اور فطری حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں ہے۔

اور تمدن جدید کے اس تند و تیز حملے سے نمٹنے کے لیے ہم کیا کر رہے ہیں ہمارے رہبرانِ عوام وہ لوگ جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے محافظ اور نگہبان اور اس کی اصلاح و ہدایت کے ذمہ دار ہیں انھوں نے ان واقعیتوں کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں انھوں نے اپنے آپ کو محض خیالی اور مثالی باتوں کے لیے وقف کر دیا ہے وہ قدیم افکار و مسائل میں غرق ہے نہ صرف یہ بلکہ ان کی ذہنیت قدامت پسندانہ ہے وہ ٹیکسی کے مقابلہ میں بگھی کو تحفظ دیتے ہیں برق کی روشنی میں چراغ جلاتے ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ جدید تمدن کفار سے منسوب ہے جبکہ قدیم آثار، قدماء کی نشانی ہیں ان کا خیال ہے کہ ہمارا ماضی سے تعلق (فکری، ثقافتی اور روحانی) صرف اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے جب ہم وضع قدیم پر قائم رہیں لکیر کے فقیر بنے رہیں اور کسی بھی نئی تبدیلی کو قبول نہ کریں۔

اس مرحلہ پر یہ نہ بھول لیجیے کہ یہ کوئی بے خبر اور بے نظر افراد نہیں ہیں یہ وہ صاحبانِ فکر و نظر ہیں جو حالات کا صحیح اندازہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں یہ، درست طور پر اس بات کی پیش بینی کرتے ہیں کہ تمدن جدید کا سیلاب ہمارے معاشرے کو فکری اور اخلاقی اعتبار سے پستی کی طرف لے جائے گا۔ یہ جدید حقیقتیں اور یہ تازہ واقعات جو ظہور میں آئے ہیں ہماری ثقافت، ہماری اقدار، ہماری روحانی پاکیزگی، ہمارے ایمان و تقویٰ ہمارے معتقدات، ہمارے ایمان غرض ہماری تمام فکری اور ثقافتی زندگی پر منفی اثرات مرتب کریں گے انہیں آلودہ کثیف اور غیر صحت بخش بنادیں گے لیکن حالات کے اس نہایت طاقتور سیلاب کے مقابلہ میں کوئی موثر بند نہیں باندھا جا رہا جدید مغربی تہذیب اپنے اثرات کے لحاظ سے ساحرانہ قدرت رکھتی ہے وہ انتہائی دور افتادہ اور پسماندہ معاشروں کو یہاں تک کہ صحرانشین بدوی قبائل تک کو متاثر کر سکتی ہے۔ لیکن اس کے ان ہمہ گیر اثرات کو روکنے کے لیے ہمارے یہ مقدس رہنما کیا کر رہے ہے

ہیں وہ فقط اور فقط ایک جملہ بول دیتے ہیں " حرام است"

ریڈیو مت خریدو، فلم ! مت دیکھو، ٹیلیویژن ! مت سنو ! لاؤڈ اسپیکر ! مت استعمال کرو، یونیورسٹی ! مت داخلہ لو، علوم جدید مت حاصل کرو، روزنامہ ! مت پڑھو، ووٹ ! مت استعمال کرو، اداروں میں کام ! مت کرو اور عورت ! خبردار عورت کا نام کبھی زبان پر مت لاؤ

اس طاقتور صنعتی انقلاب کے مقابلے میں جس نے تمام دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا ہے اور اس زبردست سرمایہ دارانہ تہذیب کے مقابلے میں جو پتھر میں جونک لگانے کی صلاحیت رکھتی ہے ہمارے یہ فکری قائدین ایک خاموش تماشائی کی طرح کھڑے ہوئے اس بات کی توقع کر رہے ہیں کہ وہ اس انقلابی سیلاب کو پوری طرح اثر انداز ہونے سے روک دیں گے وہ ماضی کو جوں کا توں برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن اس فکری اور ثقافتی جنگ میں اس صنعتی یلغار سے دفاع کے لیے ان کی تمام فوج اور تمام حربے صرف دو چیزوں پر مشتمل ہیں ۔

ایک کلمہ اور ایک حرف اور بس

کلمہ ۔ حرام !

حرف نہ (نہیں)

نتیجہ صاف ظاہر ہے یہ انقلابی عوامل ، جدید تمدن کی حقیقتیں ہر چیز کو توڑ پھوڑ دیتی ہیں ۔ ماضی کے تمام اقدار و آثار معدوم ہو رہے ہیں اور ہم اس حملہ سے اپنا دفاع کرنے کی بجائے اس سے غفلت برت کر حملہ آور کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں ، اس کے غلبہ کے لیے راہ ہموار کر رہے ہیں یہ سیلاب ہر چیز کو تباہ کر رہا ہے ، برباد کر رہا ہے جیسے مکار لومڑیوں کے غول ، بھیڑیوں کے جھنڈ ، گدھوں کی فوج اور ایسے خونخوار کتوں کی ٹولیاں جن کی زنجیریں کھول دی گئی ہوں آبادیوں میں گھس آئیں اور انہیں تاخت و تاراج کر دیں

وہ چوہے کہ جو چوری چھپے غلہ کے ڈھیر کو تباہ کر دیتے ہیں رفتہ رفتہ ہماری دولت کو خون کی طرح چوسے جا رہے ہیں ان تباہ کن عوامل سے کوئی چیز محفوظ نہیں ہے۔ شہر، آبادی، بازار، مسجد، دکانیں یہاں تک کہ ہمارے گھر تک اس تباہی کی زد پر ہیں سیلاب تباہی نے ہر چیز کو اپنی پیٹ میں لے لیا ہے۔ چنگیزی لشکر کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ طوفان بلا کی طرح آیا، لوٹ مار، قتل و غارت آتش زدگی کا بازار گرم کیا ہر چیز کو تاخت و تاراج کیا اور پھر واپس چلا گیا۔ مگر یہ لشکر بے اماں وہ ہے جو واپس جانے کے لیے تیار نہیں ہے کیوں؟ اس لیے کہ یہ دشمن ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہے ہمارے میدانوں کے نگہبان اور ہماری چوکیوں کے محافظ اس سے اس قدر بیزار اور متنفر ہیں کہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا پسند نہیں کرتے ان حقیقتوں کو سمجھنے اور انہیں خوب و بد کی کسوٹی پر پرکھنے کی زحمت نہیں فرماتے ان کی اصلاح کر کے ان کو ہمارے ماحول ہماری وضع و معیار اور ہمارے لوگوں کے مزاج کے مطابق ڈھال کر ان کو ایسی سواریوں میں تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے جو ہمارے سفر ترقی میں ہمارے کام آسکیں اس کے برخلاف ہم نے انہیں بے قید اور بے لگام چھوڑ دیا ہے یہ تیز رفتار سواریاں بغیر کسی ڈرائیور کے پوری رفتار سے دوڑ رہی ہیں اور ہم ان کی راہ میں سڑک کے عین وسط میں آنکھیں بند کئے کھڑے ہیں تاکہ یہ تندرو سواریاں ہمیں روندتی اور کچلتی ہوئی گذر جائیں۔

اور ہمارے اس رویہ کا یہ نتیجہ ہے کہ آج پردہ نشین عورتیں وضع حمل کے موقع پر احتجاج کرتی ہیں کہ "مرد ڈاکٹر کیوں! عورتوں کے لیے خواتین ڈاکٹر کیوں نہیں ہیں؟"

پھر جب وہ اپنے بچوں کو کالج اور یونیورسٹی میں تعلیم کے لیے بھیجتی ہیں تو ان کی احتجاجی آواز اور بلند ہو جاتی ہے "یہ درسگاہ فون ہے یا فیشن شو" کیا یہ کسی اسلامی معاشرے کا تعلیمی ادارہ ہے"۔" اس

مدرسہ سے تو اسلام اور اس کے اخلاق و اقدار کی کوئی مہک نہیں آتی"۔ یہ کیسی مذہبی مملکت کا ریڈیو ہے؟ یہ ٹیلیویژن، یہ مطبوعات یہ مجلسِ قانون ساز اور اس کے وضع کئے ہوئے قوانین۔ یہ بینک جو قانونی طور پر سود کا کاروبار کرتے ہیں یہ کس تمدن کی غمازی ہے۔ یہ فلم یہ ترجمے یہ فن، یہ صنعت و حرفت یہ سب کیا ہے ان کے پسِ پردہ کیا ہے افسوس یہ کیسا تمدن ہے اور یہ کس کا تمدن ہے۔

ہر چند کہ یہ سب اعتراضات درست ہیں لیکن ان سب اعتراضات کے جواب میں ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں اعتراض کا حق نہیں ہے اس لیے کہ بقول حافظ۔

"چو قسمتِ ازلی بے حضورِ ما کردند
گر اندکی نہ بہ وفقِ رضاست خوردہ مگیر"

لیکن ہم جس صورتِ حال سے دوچار ہیں اس کے متعلق حافظ کے قول کو تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ یوں کہا جا سکتا ہے کہ" اگر سب کچھ ہماری مرضی کے خلاف ہے تو بھی پرواہ نہ کرو"

جس وقت واقعیتیں ظہور پذیر ہوتی ہیں اپنے پاؤں جماتی ہیں اپنے کام کا آغاز کرتی ہیں اس وقت تم غائب ہو جاتے ہو میدان سے بھاگ جاتے ہو تم کہ صاحبِ تقویٰ و مذہب و اخلاق و اسلام ہو تم کہ عوام کے غمگسار معاشرے کی روحانی اور فکری قدروں کے ذمہ دار اور تمدن و ثقافتِ اسلام کے محافظ ہو تم اس میدانِ نبرد کو چھوڑ کر گوشہ نشینی اختیار کر لیتے ہو اس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ صنعتی تمدن اور علمِ جدید معاشرہ پر اپنا تسلط جما لیتا ہے

حالات کا دھارا جس رخ پر بہہ رہا ہے اس کو روکنے اور صنعتی تمدن کے سیلاب کی راہ میں بند باندھنے کے لیے بڑی زبردست جد و جہد اور احساسِ ذمہ داری اور آگاہی کی ضرورت ہے یہ راہ پرخطر راہ ہے

یہ ذمہ داری کمر توڑنے والی اور یہ مسئولیت ایثار طلب ہے۔

وہ لوگ جو عوام کو جھوٹی تسلیاں دے رہے ہیں انہیں صبر و سکون کی تلقین کر رہے ہیں ان کو ان چیزوں کی بقاء اور تحفظ کی آس دلا رہے ہیں جن کا باقی رہنا ممکن نہیں ہے اس بیمار کی صحت کے بارے میں تسلی دے رہے ہیں جو مرنے والا ہے جو لوگوں کو حقیقی خطرات سے آگاہ نہیں کر رہے ہیں وہ اس معاشرہ کو ان خیالی اور فرضی باتوں کو قبول کرنے کے لیے آمادہ کر رہے ہیں جو قبول کیے جانے کے قابل نہیں ہیں وہ لوگوں کو غفلت کا شکار کر رہے ہیں وہ معاشرے کو کمزور، جامد اور غیر فعال بنانے کے ذمہ دار ہیں۔

وہ لوگ جو چاہتے ہیں کہ معاشرہ فعال اور متحرک ہو وہ ان دو راز کار چیزوں کا دفاع نہیں کرتے جو اس قابل نہیں ہیں کہ ان کا دفاع کیا جائے وہ دھوکے کے ذریعہ عوامی مقبولیت حاصل نہیں کرتے وہ مذموم باتوں کی مدح و ثنا نہیں کرتے وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے والے اور حقیقت کے آگے سے فرار کرنے والے نہیں ہیں وہ موجود حقیقتوں کو، ان واقعیتوں کو جو ہمارے معاشرہ پر اثر انداز ہو رہی ہیں نظر انداز نہیں کرتے ان کا اعتراف کرتے ہیں ان کے اثرات کا جائزہ لیتے ہیں اور معاشرے کو ان کے مضر اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے پوری قوت اور شدت سے جد و جہد کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو اس حقیقت کو سمجھتے ہیں کہ زمانہ ساکن نہیں ہے متحرک ہے معاشرہ ہمیشہ ایک ہی ڈگر پر قائم نہیں رہتا بلکہ اپنے پیرہن تبدیل کرتا رہتا ہے۔ انہیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ دنیا کے طاقتور ترین انقلابی عمل کا رخ ہماری طرف ہے اور وہ ہمارے معاشرے میں انقلاب برپا کرنے کا قصد کیے ہوئے ہے

یہ وہ لوگ نہ اسقدر بے حس اور بے درد ہیں کہ حالات کو ایک خاموش تماشائی کی طرح دیکھتے رہیں۔ نہ اتنے بے شرم اور بے غیرت ہیں کہ کسی

بھی ہاتھ میں کھلونا بن جائیں اور نہ اسقدر بے شعور ہیں کہ جب یہ دیکھیں کہ سیلابِ بلا شہر کو اپنی زد میں لیے ہوئے ہے۔ اپنے گھر کے دروازے بند کر کے بیٹھے رہیں اور یہ سمجھ لیں کہ اس طرح وہ اور ان کے بیوی بچے" تباہی سے محفوظ رہ سکیں گے وہ اس قدر نافہم اور غلط بین نہیں ہیں کہ حال اور ماضی کے فرق کو نہ سمجھ سکیں یہ نہ سمجھ سکیں کہ آج صورتحال ماضی سے یکسر مختلف ہے آج کے دور میں کوئی خاندان معاشرے سے الگ ہو کر اپنے حصار میں بند نہیں رہ سکتا۔ آپ اپنی بیٹی کو خواہ گھر کے عقبی حصّہ میں بند کر دیں مگر ٹیلیوژن اس کا تعاقب کرے گا اس تک رسائی حاصل کر لے گا ٹیلیوژن کے پروگراموں کے ذریعے وہ قومی اور بین الاقوامی رجحانات سے مربوط رہے گی۔ اور تمدنِ جدید کی دلفریبیوں اور رنگینیوں سے متاثر ہوتی رہے گی۔

باب پنجم

تعمیر شخصیت کے دو قالب

ہمارے معاشرے میں اس وقت دو قالب ہیں جن میں انسان خود کو ڈھال سکتے ہیں دو سانچے ہیں جن کے مطابق اپنی شخصیت کی تعمیر کر سکتے ہیں اس طرح ہمارا معاشرہ انسانوں کی دو قسموں (TYPES) میں بٹا ہوا ہے ان میں سے ایک قسم وہ ہے کہ جو اس روایت کہنہ پر قائم ہے جسے مذہب اور اخلاق کا نام دے دیا گیا ہے یہ گروہ چاہتا ہے کہ زمانہ کے رجحانات اور دباؤ کے علی الرغم اپنی وضع قدیم اور روایت کہنہ کو معاشرہ میں نافذ کرے حالانکہ اس روایت میں نفوذ کی صلاحیت ختم ہو چکی ہے اس بات کو جاننے کے باوجود کہ یہ روایت کہنہ اپنی توانائی کھو چکی ہے یہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ نئی نسل بھی ان کے قالب میں ڈھل جائے ان کا عکس اور ان کا نمونہ بن جائے

دوسری طرف لوگوں کی وہ قسم ہے جو دانشوری جدت اور ترقی پسندی کے نام پر انسانی آزادی کے نام پر جدید نسل کو بالکل آزاد چھوڑ دیتی ہے۔ دراصل یہ لوگ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اگر وہ نئی نسل کے معاملات میں مداخلت کریں گے ان پر کوئی حکم چلائیں گے ان کو نیک اور بد کی امر اور نہی کریں گے تو انہیں قدامت، مشرقیت اور پسماندگی کا طعنہ دیا جائے گا انہیں مذہبی اور مومن کہہ کر ان کا مذاق اڑایا جائے گا اس لیے وہ سماجی حالات کے تغیر اور اپنے بیٹے اور بیٹیوں کی ترقی پسندانہ روش کو ایک خاموش تماشائی بنے دیکھتے رہتے ہیں وہ ترقی پسندی کے اس کھیل میں ایک نقش کا کردار ادا کرتے

ہیں لیعنی۔ ان کی اولاد ترقی پسندی کے امکانات پر عمل کرتی ہے اور ماں باپ اپنی اولاد کے لیے یہ امکانات فراہم کرتے ہیں۔ تاکہ انہیں (ان ماں باپ کو) دانشور، روشن فکر کہا جائے لیکن اپنی اولاد کی روش کے بارے میں ان کا سکوت اور رضامندی کا اظہار کسی دانشوری کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس کے پس پردہ یہ خوف اور اندیشہ کارفرما ہے کہ اگر ہم نے نئی نسل کو ٹوکنے یا ان کی راہ میں حائل ہونے کی کوشش کی تو ہماری عزت و احترام کا ظاہری پردہ بھی چاک ہو جائے گا۔ اور ہم حقیقتاً جس ضعف اور بیچارگی کا شکار ہیں وہ پوری طرح آشکار ہو جائے گی اور ہماری اولاد ہماری ہر بات کو حقارت سے رد کردیگی

یہ دو قالب ہیں۔ دو سانچے ہیں جن میں انسان ڈھل سکتے ہیں یہ دو قسمیں ہیں جن میں انسان بٹے ہوئے ہیں ان میں سے ایک قسم ماضی کی، روایت سے اس طرح چپٹی ہوئی ہے کہ وہ کسی تغیر یا تبدیلی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اور دوسری قسم جدید تہذیب و ثقافت کی اندھا دھند نقالی پر اس طرح کمر باندھے ہوئے ہے کہ اس نے برے بھلے کی تمیز کو ختم کر دیا ہے یہ دو قسمیں ہیں لیکن دونوں غلط ہیں یہ دو راستے ہیں مگر دونوں گمراہی کے راستے ہیں اس لیے کہ ان میں سے ایک گروہ حقیقت اور واقعیت کے سیلاب کو روکنا چاہتا ہے مگر اس سیلاب کو روکنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے وہ آہ و زاری نالہ و فریاد طعن و تشنیع اور لعنت و ملامت کے ذریعے اس سیلاب کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے اور انسانوں کی دوسری قسم وہ ہے جس نے خود کو اس سیلاب کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے یہ وہ زندہ ہیں جو زندگی کی حرارت اور توانائی سے محروم ہیں اور جنہیں سیلاب کی موجیں جس طرف چاہتی ہیں بہا لے جاتی ہیں یہ نعش کی طرح ہیں ان کی کوئی شخصیت نہیں ہے ان کے تمام اخلاق و اقدار مردہ ہو چکے ہیں۔ یہ صبح سے شام تک محض دولت کمانے کے چکر میں پھنسے رہتے ہیں۔ محنت کرتے ہیں، کام کرتے ہیں ہر غلط طریقہ

اپناتے ہیں ہر ناجائز راستے پر چلتے ہیں اپنی عزت کو داؤں پر لگا کر لوگوں کی خوشامد کر کے، جھوٹ بول کر دھوکہ دہی کے ذریعہ غرض جس طرح بھی ممکن ہو اپنی جیبوں کو نوٹوں سے بھرتے ہیں مگر کس لیے؟ اس لیے کہ وہ اس دولت سے بیرونی اشیاء خرید سکیں گویا اپنی دولت کو مغربی سرمایہ داروں کی جیب میں منتقل کر دیں۔

انسانوں کی یہ دونوں قسمیں بظاہر مختلف اور اپنے طریقہ کار کے لحاظ سے متضاد ہیں لیکن ان کے متضاد طریقہ کار اور جدید تمدن کے سیلاب کے مقابلہ میں ان کے مختلف ردعمل کا نتیجہ ایک ہی ہے اور یہ کہ یہ سیلاب بے روک ٹوک بہہ رہا ہے اور اپنے اس تند بہاؤ کے نتیجہ میں ہر چیز کو تباہ و برباد کر رہا ہے ہماری تمام دیواریں گر رہی ہیں اور ان دیواروں کا ملبہ دونوں قسم کے انسانوں کے سروں کو آلودہ اور زخمی کر رہا ہے ہمارے شہر قبرستان بن گئے ہیں۔ یہ مردوں کی بستیاں ہیں جن سے تعفن اٹھ رہا ہے

مغربی عورت/ حقیقت اور غلط فہمی

مغربی عورت کا وہ تصور جو ایران میں پایا جاتا ہے وہ غلط ہے اور حقیقی مغربی عورت سے مختلف ہے ہم مغربی عورت کی جو تصویر دیکھ رہے ہیں در حقیقت مغرب میں ایسی عورت کا کوئی وجود نہیں ہے ایسی عورتیں صرف ایران میں پائی جاتی ہیں اور وہ بھی بازاروں اور شاہراہوں میں نہیں بلکہ ان کا وجود ریڈیو، ٹیلیویژن اور عورتوں کے بعض مخصوص رسالوں تک محدود ہے گویا ہم ایران میں مغربی عورت کا جو روپ دیکھ رہے ہیں وہ ساختہ ایران ہے۔ مغربی عورت کا ایرانی ایڈیشن ہے یہ مغرب کی آوارہ اور آبرو باختہ عورتوں کی تصویر ہے لیکن اس قسم کی عورتیں صرف یورپ

کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں یہ ایران میں بھی پائی جا سکتی ہیں یہ دنیا کے کسی بھی ملک میں مل سکتی ہیں یہ عورتوں کی ایک بین الاقوامی قسم ہے

ہم جس عورت کو پہچانتے ہیں اس کا تعلق عورتوں کے ایک مخصوص اور محدود طبقہ سے ہے لیکن ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہمیں ہمیشہ مغربی عورت کا وہی روپ دکھایا جاتا ہے دراصل ہمارا مغربی عورت سے تعارف صرف فلم، ٹیلیویژن اور جنسی رسالوں کے ذریعہ ہے ہمارے سامنے عورت کے اس مخصوص روپ کو تمام مغربی عورتوں کی نمائندہ قسم بناکر بناکر پیش کیا گیا ہے۔ ہمیں اس مغربی عورت کو جاننے کا حق نہیں دیا گیا جو عنفوان شباب میں صحرائے نوبی، افریقہ یا الجزائر اور آسٹریلیا کے ریگستانوں میں چلی جاتی ہے اور اپنی تمام زندگی اس پر خطر اور وحشتناک ماحول میں بیماری اور موت کے حصار میں وحشی قبائل کے درمیان گذار دیتی ہے اور اپنی زندگی کے تمام روز و شب اپنی جوانی، اپنا کمال اور اپنی ضعیفی تحقیقی اور سائنسی کاموں کے لیے وقف کر دیتی ہے۔ وہ چیونٹیوں کی آوازوں اور ان کے طریق پیغام رسانی کا مطالعہ کرتی ہے ان موجوں پر تحقیق کرتی ہے جو چیونٹیوں کے مورچہ سے ایک دوسرے انٹینا پر موصول کی جاتی ہیں پھر جب اس کی عمر تمام ہو جاتی ہے تو اس کی بیٹی اسکے تحقیقاتی کام کو آگے بڑھاتی ہے یہاں تک کہ یہ دختر فرنگ طویل علمی سائنسی اور تحقیقاتی کام کی تکمیل کے بعد ۵۰ سال کے سن میں یورپ واپس پہنچتی ہے اور فرانس کی یونیورسٹی میں اپنے تحقیقاتی مطالعہ کی کامیابی کے متعلق یہ بیان دیتی ہے کہ میں نے چیونٹیوں کی بولی کو سمجھ لیا ہے اور ان کے طریقہ ابلاغ کے بعض علائم کو دریافت کر لیا ہے۔"

ہمیں اس بات کا حق نہیں دیا گیا کہ ہم مادام "گواشن" کے متعلق جان سکیں۔ اس عظیم خاتون نے اپنی تمام عمر بوعلی سینا، ابن رشد،

ملا صدرا اور حاجی ملا ہادی سبزواری جیسے اکابر فلاسفہ کے افکار و خیالات کے مطالعہ میں صرف کردی ان کے فلسفوں کا تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ کیا اور یونانی فکر اور ارسطو کے خیالات کا ان کے خیالات سے موازنہ اور مقابلہ کر کے اس بات کی نشاندہی کی کہ ہمارے حکماء نے یونانی فکر سے کسقدر اور کس نوعیت کا استفادہ کیا ہے مزید یہ کہ فکر یونان کے وہ کون کون سے مقامات ہیں جنہیں ہمارے مفکرین نے غلط سمجھا مادام گواشن نے ان غلطیوں کی نشاندہی کی جنہیں ہم اپنے ہزار سالہ دور تمدن میں دریافت کرنے سے قاصر رہے تھے۔

ہمیں یہ موقع نہیں دیا گیا کہ ہم اٹلی کی مادام "دولا و یدا" (DELAVIDA) کو جان سکیں ان کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے قدیم یونانی زبان میں لکھے گئے ارسطو کے رسالہ نفس کی روشنی میں حکیم بو علی سینا کی کتاب نفسیات کی تصیح و تکمیل کی۔

ہمیں مادام کیوری (CURE) کے متعلق بھی کچھ نہیں بتایا جاتا کہ جنہوں نے کوانتوم اور تابکاری (QUANTUM, RADIOACTIVITY) جیسے مسائل پر تحقیقی کام کیا۔

ہم نے سوئیڈش نژاد رزاس دولاشاپل (RESESS DULA-CHAPPELLO) کا نام تک نہیں سنا جو حضرت علیؑ کے بارے میں علماء اسلام شیعیت کے علمبرداروں اور معرفت علیؑ کے دعویداروں سے زیادہ بہتر علم رکھتی ہے یہ سوئیڈش نژاد آزاد لڑکی ایک ایسے علاقہ سے تعلق رکھتی ہے جو اسلامی ثقافت کے اثرات سے بہت دور ہے اور جہاں تک شیعہ اعتقادات اور خیالات کا کوئی اثر نہیں ہے اس نے عنفوان شباب سے اپنی تمام زندگی حضرت علیؑ کی شخصیت ان کے افکار و خیالات کے مطالعہ کے لیے وقف کر دی اس نے اپنی تمام صلاحیتوں کو اس عظیم ہستی کی شناخت

کے لیے وقف کر دیا جسے اسلامی معاشرے میں نظر انداز کر دیا گیا اس نے اس شخصیت کو تلاش کیا جسے غیروں کے تعصب اور عداوت اور اپنوں کی بے معنی مدح و ستایش کے حجابات نے چھپا رکھا تھا اس نے علیؑ کے بارے میں درست ترین حقائق کے چہرے سے نقاب ہٹائی ان کی روح کی لطیف ترین امواج، ان کے احساس کے بلند ترین ابعاد اوران کی فکر کے عمیق ترین گوشوں کی نشاندہی کی اس نے پہلی بار ان کے رنج و غم، احساس تنہائی و بے چارگی اوران کی امیدوں اور آرزوؤں کے حوالے سے ان کی شخصیت کا مطالعہ کیا اور اس علیؑ کو دریافت کیا جو صرف بدر واحد وحنین کے معرکوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ محراب عبادت میں سجدہ ریز اور رات کی تنہائیوں میں مدینہ کے باہر ایک کنوئیں میں فریاد کناں بھی نظر آتا ہے

اس کے ساتھ ہی اس دختر فرنگ نے علیؑ کی نہج البلاغۃ کو مرتب اور مدون کیا عرب مسلمان اس عظیم کتاب سے مفتی محمد عبدہٗ مفتیٔ اعظم اہل السنن کے ادبی منتخبات کی حد تک واقف ہیں جہاں تک شیعوں کا تعلق ہے شیعہ اس کتاب سے یا تو سخنان جواد فاضل "منسوب بہ علیؑ" کے حوالے سے واقف ہیں یا پھر ان کی آگاہی کا دائرہ اس ترجمہ فیض تک محدود ہے جسے عربی متن کی مدد کے بغیر نہیں پڑھا جا سکتا مگر اس دختر فرنگ نے جو کافر ہے اس لیے اسے جہنمی سمجھا جائے گا حضرت علیؑ کے تمام اقوال وارشادات کو جو مختلف کتابوں میں بکھرے ہوئے اور مختلف قلمی نسخوں میں پوشیدہ ہیں بڑی کاوش اور تحقیق کے ساتھ دریافت کیا ان کا مطالعہ کیا۔ ان کے ترجمہ اور تشریح کا کام انجام دیا اور حضرت علیؑ کی شخصیت پر وہ خوبصورت ترین اور عمیق ترین نوشتہ تحریر کیا جس کی مثال ملنا مشکل ہے اس کام میں اسے ۴۲ سال لگے اور اس مدت کا ہر لمحہ غور و فکر، تفکر و تامل اور تحقیق و شناخت میں صرف کیا گیا ہے

ہم اس دختر میشی سے بھی ناواقف ہیں جس نے یہودی ہونے کے باوجود نازیت کے خلاف جدوجہد میں حصہ لیا جس نے ہٹلر کی نوجوں کو ایسی زک پہنچائی کہ اسے اس کی عدم موجودگی میں دوبار سزائے موت کا مجرم قرار دیا گیا وہ یہودی ہے مگر کیونکہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں اور آزادی کی روح کو سمجھتی ہے اس لیے فلسطینیوں کے دوش بدوش یہودیوں کے خلاف سرگرم عمل ہے۔

ہمیں یہ بھی حق نہیں ہے کہ ہم ان فرانسیسی نژاد نوجوان لڑکیوں کے متعلق جان سکیں جو الجزائری مجاہدین کے دوش بدوش کسی نام و نمود کسی دنیاوی یا اخروی فائدے کی تمنا کے بغیر خفیہ دستوں، چھاپہ مار گروہوں اور زیر زمین تحریکوں میں مصروف کار ہیں اور پیرس کی فضائے شہوت و شراب میں غرق ہونے کی بجائے الجزائر کی جنگ آزادی میں ہر طرح کی قربانیاں پیش کر رہی ہیں وہ ایک ایسے ملک کی جنگ آزادی کی راہ میں آلام و مصائب برداشت کر رہی ہیں جو ان کا اپنا ملک نہیں ہے جبکہ وہ جس ملک کے استعمار اور استبداد کے خلاف سرگرم عمل ہیں وہ ان کا اپنا ملک ہے یعنی فرانس۔

ہمیں یہ بھی حق نہیں ہے کہ ہم "آنجلا" کے متعلق جان سکیں جو ایک مجاہدۂ آزادی ہے۔ جس کا تعلق امریکہ یا آئرلینڈ سے ہے

تمام دنیا کے آزادی پسند انسان اور ظلم و استبداد تعصب اور استحصال کی ماری ہوئی انسانیت جو مغرب کی علم دوست، آزادی پسند اور انقلابی عورتوں سے واقف ہے اس بات کو بخوبی سمجھتی ہے کہ مغرب کی نمائندہ عورت وہ نہیں ہے جو فحش رسالوں یا عریاں فلموں کے ذریعے ہم سے متعارف کرائی جاتی ہے مغرب کی نمائندہ عورت وہ نہیں ہے جو ڈان ژوان جیسے مردوں کا کھلونا ہے جو مال و دولت اور زر و جواہر کی دیوانی ہے۔ جو ایک ایسی "موڈرن" کنیز ہے جو

ہوس کاروں اور شہوت پرستوں کے لیے کھلونا بنی رہتی ہے یہاں تک کہ جب ان کا دل بھر جاتا ہے تو وہ اسے کوئی بے کار شئے سمجھ کر پھینک دیتے ہیں۔ ایسی عورت مغرب کی نمائندگی کا حق نہیں رکھتی بلکہ مغربی عورت تو درحقیقت انسانی ترقی کی ان حدوں کو چھو رہی ہے کہ جہاں وہ اپنی ملت کی بلندی کا آئیڈیل اور اپنی نسل کی آزادی اور افتخار کا مظہر نظر آتی ہے۔

لیکن ہم صرف مادام "ٹوئیگی" (TWIGGY) سے واقف ہیں جسے ۱۷ء میں حسینۂ عالم منتخب کیا گیا تھا۔ ہمیں یہ تاثر دیا گیا ہے کہ وہ اور اسی قبیل کی عورتیں جدید اور متمدن مغربی عورت کا آئیڈیل ہیں۔ جیسے جیکولین اوناسس جو ہر معاملہ کو دولت کی ترازو میں تولتی ہے یا فلم اسٹار ب ب B.B یا ملکۂ مونا کو یا وہ سات عورتیں جو جیمز بانڈ کی باڈی گارڈز ہیں بالفاظِ دیگر ہمارے سامنے جن عورتوں کو یورپ کی نمائندہ عورتیں بنا کر پیش کیا جاتا ہے وہ سب عورتیں وہ ہیں جو مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام میں افزائش زر کا ایک ذریعہ ان کی مصنوعات کے لیے اشتہار، سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں ایک کھلونا اور نودولتی طبقہ کے عشرت کدوں کے لیے کنیزان تمدنِ جدید کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ وہ عورتیں ہیں جن کے لیے تہذیب و تمدن کے معنی صرف لباس اور جسم کی آرائش ہے اور جن کے نزدیک اعلیٰ ترین اقدار اپنے جسم کے اسفل حصوں کی نمائش ہے۔

ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ ہمیں ان نوجوان لڑکیوں کے متعلق بھی کچھ بتایا جائے جو کیمبرج، سوربورن یا ہارورڈ جیسی یونیورسٹیوں میں زیرِ تعلیم ہیں اور جو صبح سے رات تک لائبریری میں بیٹھ کر مطالعہ اور تحقیق میں منہمک رہتی ہیں ان کا موضوع مطالعہ کوئی چودھویں یا پندرھویں صدی عیسوی کا قدیم نسخہ یا ڈھائی تین ہزار سال پرانی الواح جو چین سے برآمد ہوئی ہیں یا کوئی نسخہ قرآن یا پھر لاطینی، یونانی یا سنسکرت کا کوئی قدیم مخطوطہ ہوتا ہے وہ صبح سے رات تک ان کتابوں پر اس طرح نظر جمائے رکھتی ہیں کہ ایک لحظہ کے لیے بھی ان کی

نگاہ ادھر ادھر نہیں بھٹکتی اور وہ اس محنتِ شاقہ سے کوئی تھکاوٹ بھی محسوس نہیں کرتیں وہ مسلسل اپنے مطالعہ اور تحقیق میں مصروف رہتی ہیں یہاں تک کہ لائبریری کا وقت ختم ہو جاتا ہے لائبریرین وقت ختم ہونے کی وجہ سے ان سے معذرت کے ساتھ کتاب واپس لے لیتا ہے ان کے شب و روز اسی طرح کے علمی اور تحقیقی کاموں میں صرف ہوتے ہیں مگر ہم کو مغربی عورت کے نام پر جس عورت سے متعارف کرایا جاتا ہے وہ محض "زنِ بازار" ہے وہ بازاری عورت ہے جو سڑکوں پر آوارہ گردی کرتی ہے اور ہوٹلوں، تفریح گاہوں اور کلبوں میں لوگوں کے لیے تفریح اور دلبستگی کا سامان فراہم کرتی ہے مگر یہ مغرب کی نمائندہ عورت نہیں ہے۔ یہ نمائندہ ٹائپ نہیں ہے بلکہ یہ ایک مخصوص ٹائپ ہے

رجعت پسندی اور استعمار کا گٹھ جوڑ

مغرب زدہ عورت کی یہ نئی قسم (TYPE) رجعت پسند گروہ اور نئے سرمایہ دار طبقہ کے اشتراکِ عمل کا نتیجہ ہے قدامت پرست گروہ اخلاق و مذہب کے نام پر اور جدید سرمایہ دارانہ طبقہ آزادی اور ترقی کے نام پر عورت کے ساتھ جو عملی رویہ برتتا ہے ان دونوں کا مشترکہ اثر عورت کی اس نئی قسم کو وجود میں لانے کا سبب بنا ہے۔

قدامت پرست طبقہ عورت کو ابھی تک جہالت اور قدامت کی لاٹھی سے ہانک رہا ہے عورتوں کے ساتھ ان کا رویہ سخت اور درشت ہے وہ ان کے حصارِ ظلم میں آب و غذا کے لیے بھی محتاج ہے اس سختی اور درشتی کے نتیجہ میں عورت اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتی ہے اور بے سوچے سمجھے، ایک دیوانگی کے عالم میں، آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو اس رجعت پسندی کے حصار سے نکال کر ان لوگوں کا دامن تھام لیتی ہے جو متجدد ہیں۔ جن کا تعلق جدید، سرمایہ دارانہ طبقہ سے ہے یہ وہ لوگ ہیں جن کے سروں پر اونچے ہیٹ اور جن کی

داڑھیاں چھکی ہیں یہ اپنے آغوش کو ایسی عورتوں کے لیے خوش دلی سے کشادہ کر دیتے ہیں ان کے احترام میں اپنے ہیٹ اتار کر اپنا سر خم کرتے ہیں ان سے ایک مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ بات کرتے ہیں غرض ہر طرح ان کے ساتھ ایک جنٹلمین (GENTLEMAN) کا سا سلوک کرتے ہیں

مغربی عورت کے جس تصوّر سے ہم آشنا ہیں وہ عصرِ جدید کی پیداوار ہے لیکن یہ زنِ عصرِ جدید اقرونِ وسطیٰ کے بطن سے پیدا ہوئی ہے اس لیے کہ یہ اس غیر انسانی، رجعت پسندانہ اور خشونت آمیز رویے کا جو قرونِ وسطیٰ میں عورتوں کے ساتھ روا رکھا گیا ردعمل ہے۔ زنِ جدید، زنِ قدیم کے خلاف ردعمل کے طور پر وجود میں آئی ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں مسیحیت نے مذہب اور روحانیت کے نام پر عورت کو ہر طرح کی ذلت اور رسوائی کا نشانہ بنایا اسے آزادی اور انفرادیت سے محروم کیا اس کی حیثیت ایک قیدی اور ایک غلام کی سی تھی اسے کسی طرح کا حق ملکیت حاصل نہیں تھا اسے نہ اپنی دولت پر اختیار حاصل تھا اور نہ اولاد پر۔ حتیٰ کہ اس کا نام بھی اس کے باپ یا شوہر کے حوالے سے پہچانا جاتا تھا اس دور میں عورت کو خدا کی ناراضگی کی نشانی اور تمام برائیوں اور فساد کی جڑ سمجھا جاتا تھا اس دور کی روحانیت اولادِ آدم کو جنت سے نکلوانے کا اصلی مجرم عورت کو گردانتی تھی

اگر قرونِ وسطیٰ میں کسی پادری سے سوال کیا جاتا کہ کیا کسی ایسے گھر میں جہاں عورت موجود ہے کوئی نامحرم مرد داخل ہو سکتا ہے تو جواب ملتا کہ نہیں، ہرگز نہیں۔ کیونکہ اگر کسی گھر میں نامحرم مرد داخل ہوا اور اگرچہ عورت اسے نہ بھی دیکھے تو بھی وہ مرد گناہ گار ہو جاتا ہے گویا اگر کوئی نامحرم مرد کسی مکان کی بالائی منزل پر ہے اور اس گھر کے تہہ خانہ میں بھی کوئی عورت ہے تب بھی مرد گناہ گار ہونے سے نہیں بچ سکتا۔ گویا عورت کا وجود ہی گناہ ہے اور جس جگہ وہ موجود ہے اس کی فضا کو گناہ سے آلودہ کر دیتی ہے۔

سینٹ تھامس ڈیکن (ST. THOMAS DAKIN) کا فرمانا ہے کہ اگر خداوند کسی مرد کے چہرے پر عورت کے لیے محبت کا جذبہ دیکھتا ہے خواہ وہ عورت اس کی بیوی ہی کیوں نہ ہو، تو غضبناک ہو جاتا ہے اس لیے کہ وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ کسی مرد کے دل میں خداوند کی محبت کے علاوہ اور کوئی محبت جگہ بنا سکے مسیح نے تمام عمر بغیر شادی کے بسر کی اس لیے جو چاہتا ہے کہ سچا مسیحی بنے اسے چاہیئے کہ عورت کے سائے سے بھی دور رہے یہی وجہ ہے کہ عیسائیت کا روحانی طبقہ تمام برادران، پدران، و خواہران (BROTHERS, FATHERS & SISTERS) تمام عمر شادی نہیں کرتے کیونکہ شادی کا بندھن خداوند کے غضب کا موجب بنتا ہے خداوند سے تعلق اور توسل صرف عیسیٰؑ مسیح کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ چونکہ ایک دل میں دو محبتیں جگہ نہیں پا سکتیں لہٰذا روحانی یعنی حامل روح القدس صرف وہی ہو سکتے ہیں جو مجرد زندگی گذارتے ہوں

عیسائیت میں گناہِ اوّلی (ORIGINAL SIN) کا عقیدہ پایا جاتا ہے اس عقیدہ کے مطابق یہ اولین گناہ دراصل عورت کا گناہ تھا اس لحاظ سے ان کا کہنا یہ ہے کہ جب بھی کوئی ابن آدم عورت کی طرف رجوع کرتا ہے خواہ وہ عورت اس کی زوجہ ہی کیوں نہ ہو جیسے کہ جناب حواؑ حضرت آدمؑ کی زوجہ تھیں تو گویا وہ اس گناہِ اولیٰ کی تکرار کرتا ہے جو تمام برائیوں کی جڑ ہے اور اپنے اس عمل کے ذریعہ خداوند کے حضور گناہِ آدمؑ کی یاد کو تازہ کرنے کا سبب بنتا ہے پس انسان کو وہ کام کرنا چاہیئے کہ خداوند گناہِ آدمؑ کو بھولا رہے اسی لیے قرونِ وسطیٰ کا اندازِ فکر یہ تھا کہ عورت کا وجود قابل نفرت ہے۔ اسے عاجز و محروم بنا کر رکھا جائے وہ ہر قسم کے حقِ ملکیت سے محروم تھی یہاں تک کہ اگر کوئی عورت صاحبِ دولت و ثروت ہوتی اس کی کوئی جایئداد ہوتی تو جیسے ہی وہ اپنے شوہر کے گھر میں قدم رکھتی اس کا حقِ ملکیت سلب ہو جاتا۔ وہ تمام چیزیں جو اس کی ملکیت ہوتیں خود بخود اس

کے شوہر کی ملک قرار پا جاتیں قرون وسطیٰ کی اس روایت کی جڑیں اسقدر گہری تھیں کہ ان کے اثرات آج کے ترقی پسند یوروپی معاشرے میں بھی کسی حد تک موجود ہیں مثلاً آج بھی جب مغربی معاشرے میں کوئی عورت شادی کرتی ہے تو اسے اپنا نام تبدیل کرانا پڑتا ہے اور نام کی یہ تبدیلی محض خانگی حدود یا غیر سرکاری امور تک محدود نہیں رہتی بلکہ اسے تمام اندراجات، تعلیمی اسناد، شناختی کارڈ پاسپورٹ وغیرہ۔ میں اپنے باپ کے نام کی جگہ اپنے شوہر کا نام درج کرانا پڑتا ہے گویا یہ عورت بذاتِ خود کچھ نہیں ہے اپنی جگہ کوئی وجود نہیں رکھتی اصل بات تو نام ہے اس کا وجود خود بے معنی ہے قائم بہ غیر ہے جب تک باپ کے گھر رہتی ہے باپ کے نام کے حوالے سے پہچانی جاتی ہے اور جب پرانے مالک کا گھر چھوڑ کر نئے آقا یعنی شوہر کے گھر چلی جاتی ہے تو پھر اس کا تشخص شوہر کے حوالے سے قائم ہوتا ہے مغربی معاشرے کی نظر میں اس کی اتنی قدر و قیمت بھی نہیں ہے کہ وہ حوالہ غیر کے بغیر خود اپنا نام رکھ سکے یہ طریقہ اب ایرانی اور دوسرے مشرقی بھی اپنا رہے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ طریقہ چونکہ مغرب کا طریقہ ہے اس لیے ہمارے اپنے طور طریقہ سے بہتر ہے خواہ یہ طریقہ دورِ غلامی کی یادگار ہو۔ خواہ یہ لغو، بیہودہ اور قابل نفرت طریقہ ہو مگر چونکہ اس پر مغرب کی چھاپ لگی ہے اس لیے ہمارے وہ جدت پسند جو مغرب کے مقلد ہیں آنکھ بند کر کے اس کی تقلید کرتے ہیں۔

مقلد خواہ قدیم ہوں یا جدید، محض نقال ہیں ان کے اندر شعور و ارادہ، انتخاب اور فیصلہ کی قوت نیک و بد اور حق و باطل میں امتیاز کرنے کی صلاحیت معطل ہو جاتی ہے ان کا کام صرف نقالی کرنا ہے وہ آنکھیں بند کر کے نقالی کرتے ہیں اور کبھی کبھی نقل اصل کے مقابلہ میں مضحکہ خیز حد تک بڑھ جاتی ہے۔

یوروپ میں جہاں کہیں سرکاری یا قانونی کاغذات میں کسی شادی شدہ

عورت کا نام درج کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے اس کا نام دوبار اور دو طریقے سے لکھا جاتا ہے یعنی وہ نام جو اس نے شادی کے بعد اختیار کیا اور جو اس کے شوہر کا خاندانی نام ہے اور وہ نام جو زمانۂ دوشیزگی میں شادی سے قبل تھا اور یہ اس کے باپ کا خاندانی نام ہوتا ہے یعنی عورت کا نام اس کا اپنا نام نہیں ہے بلکہ اس کے صاحبِ خانہ کا نام ہے اور عورت اگرچہ کہ وہ گھر کی مالک ہو مگر چونکہ عورت ہے اس لیے صاحبِ خانہ نہیں ہو سکتی وہ اپنی ذات کے حوالے سے نہیں پہچانی جاتی وہ آزادانہ اپنا نام نہیں رکھ سکتی یہی وجہ ہے کہ وہ شادی کے بعد سرکاری اور خانگی ہر دو سطح پر اپنا نام تبدیل کر لیتی ہے یہ تبدیلی اس کی مجبوری ہے۔

ہماری جدت پسند خواتین جو مغرب کی اس رسم سے حال ہی میں متعارف ہوئی ہیں شادی کے بعد نہ صرف خاندانی نام بدلتی ہیں بلکہ اپنا اصلی نام بھی تبدیل کر لیتی ہیں۔ گویا وہ مغرب کی نقالی میں خود مغرب سے بھی دو ہاتھ آگے نکل جاتی ہے یہ بھونڈی اور بے سوچی سمجھی نقالی ہے جو حد درجہ مضحکہ خیز ہے ہمارا مغرب زدہ طبقہ یورپی نسل کو خود سے برتر مانتا ہے اور ان سے اس درجہ مرعوب ہے کہ ہر بات میں ان کی نقالی کرتا ہے یہ سوچے سمجھے بغیر کہ جس بات کی وہ نقالی کر رہا ہے اس کی علت، معنویت، افادیت یا قدر و قیمت کیا ہے یہ اندھی تقلید عقل و شعور سے عاری ہے ہمارے جدت پسند اس راہ پر آنکھیں بند کر کے دوڑ رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں مغرب کی نقالی کے ایسے نمونے موجود ہیں جن کی مثال خود مغرب کے معاشرے میں نہیں مل سکتی۔

آج بھی فرانس کے مروجہ قانون کی رو سے کوئی عورت اپنے شوہر سے جدائی کے بعد اپنی اولاد پر کسی قسم کا معمولی سا حق بھی نہیں رکھتی جبکہ اسلام میں (خالص اور اصلی اسلام میں نہ کہ موجودہ دور کے نقلی اور غیر خالص اسلام میں)

عورت شخصیت اور حقوق کے اعتبار سے ایک آزاد اور مستقل حیثیت رکھتی ہے حتیٰ کہ وہ شوہر سے بچوں کو دودھ پلانے کی اجرت طلب کرسکتی ہے وہ شوہر کی دخل اندازی کے بغیر کاروبار اور تجارت کرسکتی ہے معاشی پیداوار کے عمل میں آزادانہ حصہ لے سکتی ہے غرض ہر طرح اسے وہ تمام حقوق اور اختیارات حاصل ہیں جو کسی بھی معاشرے میں ایک آزاد فرد کو حاصل ہوسکتے ہیں۔ اس کی حیثیت ذیلی اور طفیلی نہیں ہے بلکہ وہ ایک آزاد اور مستقل حیثیت کی مالک ہے۔

یورپ نے ماضی میں عورت کے ساتھ غیر انسانی سلوک کیا اور دین ومذہب کے نام پر اس کی جو تحقیر اور تذلیل کی گئی آج کی مغربی عورت اس سلوک کے ردعمل کی مظہر ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں عورت کے متعلق جو اندازِ نظر اختیار کیا گیا تھا اس کی جڑیں اس قدر گہری تھیں کہ آج بھی مغرب کی متمدن عورت اپنی فکر اور سوچ کو اس سے پوری طرح آزاد نہیں کرسکی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اٹلی اور اسپین میں جہاں آج بھی مذہبی عنصر غالب ہے آزادی اور حقوق بشری کے تمام بڑے بڑے دعوؤں کے باوجود عورت بہت سے انسانی اور بنیادی حقوق سے اب بھی محروم ہے

میں دراصل انسانی آزادی اور اجتماعی اور سماجی حقوق کی بات کر رہا ہوں۔ یہ آزادی اس جنسی آزادی سے یکسر مختلف ہے جو نہ صرف مغرب میں پائی جاتی ہے بلکہ جو بڑی تیزی سے مشرقی معاشروں میں بھی پھیل رہی ہے آج جو صورتِ حال ہم دیکھ رہے ہیں وہ یہ ہے کہ مغرب اپنی صنعتوں کے لیے خام مواد جیسے پیٹرول، ہیرے، تانبا، لوہا چاندی قہوہ، یورونیم دوسری دنیا (سابقہ تیسری دنیا) کے ملکوں سے نہایت سستے داموں خرید تا ہے اور ان بھوکے ننگے ملکوں کو جو یورپ کے ممالک کے لیے لوٹ کھسوٹ کا بازار ہیں، نہایت فیاضی اور خوش دلی کے ساتھ آزادی، اخلاق، تیکنک، ثقافت

فن اور ادب کے نام پر جنسی آزادی اور بے راہ روی کا تحفہ فراہم کر رہا ہے اور پسماندہ ملکوں کے تمام وسائل ابلاغ، نشر و اشاعت کے تمام ذرائع اس مغربی روش کی ترویج، توجیہہ اور توسیع میں منہمک ہیں جنسی آزادی حقیقی آزادی نہیں ہے اس کا حقوق انسانی سے کوئی تعلق نہیں ہے، دراصل جنسی آزادی ایک فریب ہے، ایک دھوکہ ہے، استعمار جدید نے اس طرح کے بہت سے فریب ایجاد کئے ہیں تاکہ مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام اپنی ظالمانہ لوٹ کھسوٹ کو جاری رکھ سکے اور مشرقی ممالک جو مغرب کے استعمار کا شکار ہیں اپنے حالات کے خلاف بغاوت نہ کر سکیں وہ مغرب کے اقتصادی استحصال کو آزادی اور ترقی پسندی کے نام پر قبول کئے رہیں مغرب کے سرمایہ دار اور صنعت کار مشرق کے عوام کو اقتصادی اور سیاسی طور پر غلام بنائے رکھنے کے لیے انہیں جنسی آزادی کے دام میں پھنسائے ہوئے ہیں خصوصاً نوجوان نسل جو بغاوت اور سرکشی کا فطری میلان رکھتی ہے جو مذہب کی قیود اور روایت قدیم کی پابندی سے آزاد ہونا چاہتی ہے جو کسی بھی وقت شورش اور بغاوت کر کے مغرب کے استحصال اور استعمار کے لیے سنگین خطرہ بن سکتی ہے اسے جنسی آزادی کے سیلاب میں اس طرح غرق کر دیا گیا ہے کہ انہیں دنیا اور مافیہا کا کوئی ہوش ہی نہیں ہے وہ ایک غفلت اور بے حسی کا شکار ہیں ان پر مدہوشی کی کیفیت طاری ہے وہ مغرب کی جنسی آزادی کے سحر سے مسحور ہو گئے ہیں وہ اپنے حالات، اپنی عزت اور سیاسی اور اقتصادی غلامی کے احساس سے بے خبر ہیں یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ممالک میں خود وہاں کے جدت پسند طبقے مغرب کے مفادات کے لیے راہ ہموار کرتے ہیں داخلی استبداد کے ذریعہ نوآبادیاتی نظام کو تقویت پہنچاتے ہیں اور جنسی آزادی کے دام میں پھنس کر اپنے مغربی آقاؤں کے تسلط کو مستحکم کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔

اس مرحلہ پر ہم معمولی سے غور و فکر کے ذریعے اس طوفان جنسیت کے پس پردہ چھپے ہوئے شیطانی وجود کو شناخت کر سکتے ہیں یہ شیطانی وجود ایک ایسا بت ہے جس کے تین چہرے ہیں اور ان تینوں چہروں کے جدید نام "استثمار" "استعمار" اور "استبداد" ہیں[1] عصر جدید کے اس مذہب کا پیغمبر فرائڈ (FREUD) ہے اس کا علمی اور مذہبی سرمایہ فرائڈزم FREUDISM ہے اس مذہب میں انسانی حقوق کی بنیاد جنسیت ہے اور اس میں اخلاقی قدر جنسی آزادی اور بے راہ روی ہے اس مذہب کا معبد "شہوت پرستی" ہے اور اس معبد میں جس شے کو سب سے پہلے قربان کیا جاتا ہے وہ 'عورت' ہے

عورت - عصر جدید کے ثقافتی اور سماجی تناظر میں

یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے بعد پندرھویں اور سولھویں صدی میں قدیم روایتی اور مذہبی عہد ختم ہو گیا اور اس کے نتیجہ میں زندگی کی تمام قدریں اور تصوّرات یکسر منقلب ہو گئے اب فطری شعور اور مذہبی احساس کی جگہ ڈیکارٹ (DESCARTES) کے عقلی شعور اور تجزیاتی منطق نے لے لی اجتماعیت کی جگہ انفرادیت کا تصور ابھرا معاشرتی اکائیوں (خاندان، قبیلہ، ملت) کی جگہ فرد کی اکائی کی آزاد اور مستقل حیثیت نمایاں ہوئی۔ اجتماعی مفاد کی جگہ انفرادی مفاد پر زور دیا جانے لگا۔ دورکیم (DURKHEIM) کے الفاظ میں، اجتماعیت (SOCIALISM) کی جگہ انفرادیت (INDIVIDUALISM) نے لے لی۔ زندگی کے متعلق بنیادی تصور میں تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ "اقدار"

---

[1] استثمار - معاشی استحصال کا سرمایہ دارانہ نظام
استعمار - مغرب کا نوآبادیاتی نظام
استبداد - مشرق میں غیر جمہوری اور ظالمانہ حکومتوں کا نظام

افادیت سے بدل گئیں مثالیت پسندی (IDEALISM) کی جگہ واقعیت (REALISM) نے لے لی۔ روحانی عاطفہ کی جگہ فطری جبلت کو دیدی گئی زندگی کا کمال روحانی ترقی، تقوی، اور استغنار نہیں رہا بلکہ مادی آرام و آسائش کو زندگی کا مقصد سمجھا جانے لگا۔ وہ مقدس روحانی اور ثقافتی اقدار جن کی جڑیں انسانی فطرت میں بہت گہری ہیں جن کی منطقی تحلیل ممکن نہیں ہے مگر جو ابدی سکون اور راحت کی ضمانت ہیں اب دو راز کار سمجھی جانے لگیں اور ان کی جگہ ان اقدار نے لے لی جنہیں عقل منطق کی کسوٹی پر پرکھ کر منتخب کر سکتی ہے

مختصر یہ کہ وہ تمام قدریں جو عقل منطق کے ذریعہ معلوم کی جا سکتی ہیں جو مصلحتِ وقت کے تقاضوں پر پوری اترتی ہیں جن میں افادیت کا عنصر نمایاں ہے جن کا منطقی تجزیہ اور تحلیل ممکن ہے جن کو علت اور معلول کے سلسلہ میں دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ یعنی وہ تمام قدریں جو زمینی ہیں، مادی ہیں، تغیر پذیر ہیں۔ انہی پر ہماری تمام زندگی، تمام تہذیب و ثقافت تمام سماجی اور معاشرتی روابط منحصر ہیں۔ یہی قدریں روحِ عصر کی علامت ہیں اب ہمارا ان اقدار سے کوئی علاقہ باقی نہیں رہا جو الہامی اقدار کہلاتی ہیں۔ جو ناقابل تغیر ہیں۔ جن کا تعلق ایک ایسی حقیقت سے ہے جو ہمارے عقل و ارادہ کی سطح سے بلند ہے جسے منطق کی کسوٹی پر پرکھنا ممکن نہیں ہے۔ یہ اقدار عقل کی اس سطح سے تعلق رکھتی ہیں جو تحلیل و تجزیہ کی سطح سے ماورا ہے ان کا تعلق اس حقیقت سے ہے جو غیبی ہے جو علت اور معلول کے سلسلہ سے بلند ہے ان اقدار کی جڑیں انسانی وجود میں بہت گہری ہیں اس لئے کہ یہ ابتدائے آفرینش سے آج تک موجود ہیں۔ ان اقدار کا سرچشمہ مادی اور زمینی نہیں ہے بلکہ ان کا تعلق ایک جہانِ دیگر سے ہے اور ان کا سرچشمہ ایک ایسی حقیقت سے ہے، جو ثابت، قدیم، مطلق اور کامل و اکمل ہے۔

روحانی ناقابل تغیر اور اعلیٰ اقدار سے منہ موڑ کر زمینی، مادی، تغیر

پذیر اور مصلحت آمیز اقدار سے رشتہ جوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ مابعد الطبیعات سے ہمارا تعلق ٹوٹ گیا۔ اور جب ہم مابعد الطبیعاتی سطح سے کٹ کر طبیعاتی سطح تک محدود ہو گئے تو پھر الہام کی جگہ سائنسی علوم نے لے لی! عفت کا تصور لذت سے بدل گیا۔ طلب کمال، طلب مال میں ڈھل گئی۔ تقویٰ کا تصور مادی آسائش و آسائش کے تصور سے بدل گیا۔ بقول فرانسیس بیکن اب "حقیقت کی جگہ طاقت نے سنبھال لی ہے۔"

اس روحانی اور فکری انقلاب پیمانۂ اقدار میں اس گہری تبدیلی اور تہذیب وثقافت اور تصور حیات کی بنیادی جہت میں تغیر نے زندگی اس کے تمام تصورات تمام مظاہر اور تمام اداروں پر انقلابی اثرات مرتب کئے ہیں، جذبۂ عشق، تصور خاندان، اور عورت اور مرد کے تعلقات کی نوعیت اور اس کی سطح ہر چیز بدل گئی معاشرے میں عورت کا مقام و مرتبہ، مرد کے مقابلے میں اس کی حیثیت اور زندگی، فن، ادب، اور ثقافت میں اس کی جگہ تبدیل ہو گئی۔ زندگی اور اس کی قدروں میں اس ہمہ گیر تبدیلی کی علمی بنیاد ڈیکارٹ کی منطق ہے جس کی رو سے ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا اور منطق کے تجزیاتی اصولوں پہ جانچا جا سکتا ہے اس نکتۂ نظر کی رو سے ہر چیز یہاں تک کہ وہ مقدس قدریں اور اخلاقی اصول جن کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ عقل برہانی کی حد سے ماوراء اور الٰہی صفات کا پرتو ہیں اب تجزیاتی منطق کی سطح پر پرکھے جانے لگے اور ان کو بھی دیگر مادی اشیاء کی طرح قابل تحلیل و تجزیہ سمجھا جانے لگا۔ عورت اور محبت جن کے گرد ایک ایسا پراسرار، مقدس، روحانی، خیالی اور شاعرانہ ہالہ تھا جس تک رسائی ممکن نہیں تھی اب وہ تشریح و تجزیہ و تحلیل کی زد میں آ گئے اب انہیں ایک حسابی مسئلہ کی طرح حل کیا جانے لگا۔

فکر و نظر کی اس تبدیلی کے ذمہ داروں میں ایک نام کلوبرنارڈ (CLAUDE BERNARD) کا ہے جس کے خیال میں انسان ایک ایسی لاش

ہے جو بے روح ہے، فرائڈ کا خیال ہے کہ روح ایک (خوک بیمار، مریض سور) ہے ان دونوں تصوّرات کا سروں پر سایہ فگن وہ بورژوائی ذہنیت ہے جس کے نزدیک زندگی کے معنی دولت اور سرمائے کے ہیں ان تحقیقات اور تصوّرات سے جو نتیجہ برآمد ہو سکتا تھا وہ ہم سب دیکھ رہے ہیں۔

ایک طرف اس طرح کے مفکرین تھے اور دوسری طرف مسیحی ملا ایک طرف جدید تجربہ گاہیں تھیں اور دوسری طرف کلیسا۔ ان جدید تصوّرات کے مقابلہ میں بجز فتویٰ کفر اور کچھ کہنے کو نہیں تھا اور اس کفر کے فتویٰ سے خوفزدہ ہونے کو اب کوئی تیار نہیں تھا۔ ان جدید مفکرین کے مقابلہ میں جو استدلال اور مثال پیش کرتے تھے مسیحی ملائیت صرف ہائے مذہب (وامذہبا) کا نعرہ بلند کرتی کفر کے فتوے صادر کرتی اور لوگوں کو آتشِ جہنم سے ڈراتی تھی لیکن ان کی یہ تمام ہاؤ ہو بے سود اور بے اثر تھی عورت جو عہد گذشتہ میں ایک خاندان کا حصّہ تھی اور اگرچہ کہ اس کی مستقل اور آزاد شخصیت نہیں تھی بلکہ وہ خاندان میں جو ایک اکائی کی طرح تھا، پوری طرح گھل مل کر اسی کا ایک حصّہ بن جاتی تھی رفتہ رفتہ اسے اقتصادی آزادی حاصل ہونے لگی۔ اب اسے گھر کے باہر کی فضا میں کام کرنے کے مواقع ملنے لگے صنعتی دور کی متحرک اور پیچیدہ زندگی اور اس کے روز افزوں مسائل اور مشاغل نے عورت کو گھر کی چار دیواری کے حصار سے باہر نکال کر اقتصادی مشاغل میں مصروف کر دیا۔

اقتصادی آزادی کے نتیجہ میں عورت کو سماجی آزادی بھی حاصل ہو گئی اپنے شوہر اور بچوں کے تناظر میں بھی اس کا ایک آزاد اور مستقل بالذات وجود تسلیم کر لیا گیا۔ آج کی عورت شادی سے قبل بھی اپنا وجود رکھتی ہے وہ عقلی اور منطقی اعتبار سے ترقی کر چکی ہے لہٰذا دوسروں کے ساتھ اس کے روابط کی نوعیت بدل گئی ہے۔ اب ان تعلقات کی بنیاد فطری جذبات و احساسات یا ماورائے منطق روحانی تصوّرات پر نہیں ہے۔ بلکہ عورت اب اپنے تمام تعلقات کو عقل

معاش کی کسوٹی پر پرکھتی ہے اور مفاد و مصلحت ذات کی ترازو میں تولتی ہے اس انداز نظر نے جو سائنسی، مادی، تجزیاتی، مصلحت آمیز اور واقعیت پر مبنی ہے اور جس کا پیمانہ صرف اپنی ذات کا مفاد، اپنی جبلتوں کی تسکین اور اپنے لئے عیش و آرام کے اسباب مہیا کرنا ہیں، عورتوں کو خاندانی، اجتماعی اور مذہبی قیود سے بڑی حد تک آزاد کر دیا ہے اس آزادی کا مطلب یہ بھی ہے کہ عورتیں ان تمام گہرے اور لطیف جذبات و احساسات سے بڑی حد تک محروم ہو گئیں جن کا تعلق روحانیت سے ہے اس لیے کہ تہذیب جدید میں عورتوں کی آزادی کا یہ ایک لازمی نتیجہ ہے

دورکیم اس بات کی تائید کرتا ہے کہ عہد گذشتہ میں روحِ اجتماعی طاقتور تھی اجتماعیت کا جذبہ قوی اور غالب تھا لیکن جب جدید تعقل، اقتصاد اور انفرادیت کا رجحان بڑھا اور اقتصادی اور معاشی عناصر نے اس رجحان کو تقویت عطا کی تو فرد نے ان تمام رشتوں کو جن کی بنیاد فطری اور روحانی تقاضوں پر تھی اور جو مذہب اور روایت قدیم کے حوالے سے استوار کئے جاتے تھے توڑنا شروع کر دیا اجتماعی روابط کی اس شکست و ریخت کے نتیجہ میں فرد کو وہ آزادی حاصل ہو گئی ہے جو تہذیب جدید کا ایک طرۂ امتیاز ہے یہاں تک کہ آج ایک ۱۸ سالہ دوشیزہ کسی دوسرے کی اعانت اور سرپرستی کے بغیر آزادانہ طور پر کسی مکان میں رہ سکتی ہے اب ایک عورت کو اپنے خاندان میں خود مختار اور آزاد حیثیت حاصل ہے۔ عورت چونکہ معاشی طور پر خود کفیل ہے اس لیے اسے یہ حق حاصل ہے کہ اگر اس کے لیے خاندانی زندگی ناخوشگوار اور تکلیف دہ بن جائے تو وہ اس بندھن سے آزادی حاصل کر لے۔ اب عورت کو چونکہ انفرادی حقوق حاصل ہیں۔ چونکہ وہ اقتصادی طور پر آزاد ہے چونکہ وہ تمام معاملات کو عقل کی ترازو میں تولنے کی عادی ہے اور چونکہ عقل کا فتویٰ یہ ہے کہ انسان محض اپنے مفاد و آسائش کا خیال رکھے دوسروں کے لیے دکھ نہ سہے تو اب عورت اس بات پر مجبور نہیں ہے کہ وہ قربانی دے، ایثار کرے، اپنے آرام و آسائش اور اپنے

جذبات و احساسات کو کسی مرد کی محبت کی خاطر نظر انداز کر دے ۔ عشق، وفا پیمان، شریعت اور رشتۂ ازدواج کے نام پر اپنی ذات اور اس کے مسائل اور معاملات کی طرف سے آنکھیں بند کر لے ۔ اب ایسا ممکن نہیں ہے اس لیے کہ عشق وفا، فداکاری، ایثار روحانی اور اخلاقی قدریں ہیں جن کی عقلی اور منطقی تحلیل ممکن نہیں ہے ۔

دوسروں کی خاطر اپنی زندگی کو قربان کرنا، دوسرے کے آرام کی خاطر رنج اور تکلیف برداشت کرنا ۔ یہ وہ باتیں ہیں جو عصر حاضر کی منطق پر کسی حساب سے پوری نہیں اترتیں مجھے جس سے کوئی تعلق خاطر نہیں ہے میں اس کی خاطر کوئی قربانی کیوں پیش کروں ۔ مجھے جس سے محبت نہیں ہے میں اس سے عہد وفا کیوں نبھاؤں؟ کوئی عورت کسی ضعیف و بدہیئت شخص سے اپنی قسمت کو وابستہ کیوں رکھے وہ اس پیمان کو اس عہد اور تعلق کو کیوں نبھائے جو اس وقت کیا گیا تھا جب یہ مرد قوی اور حسین تھا جب وہ اس عورت کے لیے واحد ممکن سہارا تھا مگر اب یہ شخص ضعیف و نحیف ہو چکا ہے اب اس کی قوت ضعف سے اور اس کی رعنائی و زیبائی بدہیئتی اور بد صورتی سے بدل چکی ہے اب کوئی عورت کسی ایسے مرد سے تعلق کو کیوں برقرار رکھے اور اس کی وجہ سے ایک ایسے دوسرے مرد سے چشم پوشی کرے جو طاقت ور اور حسین ہے اور جو اس کے طبعی اور فطری جذبات اور تقاضوں کا گرم جوشی سے جواب دے سکتا ہے ۔

سارتر جو عصر حاضر کے ایک عظیم فلسفی مانے جاتے ہیں ایک سوال پیش کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ایک عورت کسی ایسے شخص کی بیوی ہے جس میں کوئی خوبی نہیں ہے ۔ کوئی کشش نہیں ہے اس کے برعکس ایک ایسا شخص ہے جس کی شخصیت ہر اعتبار سے پر کشش ہے اور وہ اس عورت سے عشق بھی کرتا ہے ۔ عقل کی روشنی میں دیکھیے تو حساب بالکل صاف ہے دونوں مردوں کو اس عورت کی ضرورت ہے ایک کا اس سے تعلق زوجیت کا ہے اور دوسرے کا

تعلق عشق کا ہے لیکن عورت کو اپنے شوہر سے کوئی تعلق خاطر نہیں ہے اس کے برعکس وہ اپنے عاشق سے محبت کرتی ہے اگر وہ عورت اپنے شوہر سے وفادار رہتی ہے تو اس طرح وہ ایک محبت (اپنے شوہر کی محبت) کی خاطر دو محبتوں (اپنی اور اپنے عاشق کی محبت) کو قربان کرتی ہے اور اگر وہ اپنے شوہر سے قطع تعلق کر لیتی ہے تو اس طرح وہ دو محبتوں کی خاطر صرف ایک محبت کو قربان کرتی ہے اس عورت کے لیے مسئلہ بالکل واضح ہے اس باب میں عقل کا فیصلہ دوٹوک اور قطعی ہے یہ ایک ریاضی کا مسئلہ ہے ایک محبت کے لیے دو محبتوں کو قربان کرنا کسی طرح بھی قرین عقل نہیں ہے ڈیکارٹ کی منطق ہو یا فرائڈ کا نظریہ کوئی اس بات کو عقل کے مطابق تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے ایک جدید اور باشعور عورت منطقی عقل کی روشنی میں فیصلہ کرتی ہے وہ اس مسئلہ کو ریاضی کے مسئلہ کی طرح حل کرتی ہے معاشی آزادی اور اجتماعی حقوق اسے یہ فیصلہ کرنے میں پوری طرح مدد دیتے ہیں چنانچہ وہ یہ فیصلہ کر لیتی ہے۔

اسی طرح اولاد کا معاملہ ہے بچہ پیدا ہوتا ہے ایک چھوٹا سا بچہ، ایک ننھا وجود اپنی ماں اور باپ کی آزادی پر قدغن لگا دیتا ہے عقل اس بات کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہے کہ ایک بچے کی خاطر دو انسان اپنی آزادی اور اپنے آرام و آسائش کو قربان کر دیں نتیجہ یہ ہے کہ یا تو ایسے طریقے اختیار کئے جائیں کہ بچہ پیدا نہ ہو یا اگر پیدا ہو ہی گیا تو اسے کسی دایہ کے سپرد کر دیا جائے یا پھر کسی ادارے کی سرپرستی میں دے دیا جائے وہ تمام جذباتی رشتے جو منطق کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے اور عملی لحاظ سے غیر مفید ہیں توڑ دیے گئے وہ تمام اخلاقی، روایتی، ثقافتی، روحانی اور وجدانی قدریں جو نسوانیت زن کی نگہبان تھیں اور جو عورت کی انفرادیت کو خاندان کی اجتماعیت سے مربوط کرتی تھیں ان سب سے آزادی حاصل کر لی گئی ہے ایسے تمام روابط کو جو عورت کو اپنے شوہر، اپنے بچوں، اپنے خاندان اور اپنے قرابت داروں کے ساتھ

وفاداری، ایثار، محبت، قربانی، ہمدردی اور غم گساری پر آمادہ کرتے تھے۔ انہیں غیر عقلی اور دور از کار قرار دے دیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ معاشی اور سماجی آزادی، جذبات پر منطق اور حقیقت جوئی پر واقعیت بینی کے غلبہ نے روح اجتماعی کو ضعیف و کمزور کر دیا ہے۔ انفرادیت کا تصور حاوی ہو گیا ہے گویا اس آزادی نے عورت کو دوسروں سے غیر متعلق کر دیا ہے اجتماعیت سے رشتہ اس کا بالکل ٹوٹ گیا ہے نتیجہ یہ کہ وہ تنہائی کا شکار ہو گئی ہے

تنہائی

تنہائی اس صدی کا سب سے سنگین المیہ ہے، ہالبواکس اور دورکیم نے خودکشی کے عنوان سے کتابیں لکھیں ہیں جن میں سماجیاتی تناظر میں یورپ میں خودکشی کے مسئلہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔

خودکشی مشرق میں خال خال واقع ہونے والا حادثہ ہے جبکہ یورپ میں یہ کوئی استثنائی حادثہ نہیں ہے بلکہ ایک سنگین اجتماعی مسئلہ ہے کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہے بلکہ ایک ایسی واقعیت ہے جس کا گراف روز بروز اوپر جارہا ہے ترقی یافتہ ممالک میں خودکشی کی شرح روز بروز ترقی کر رہی ہے جو ملک جس قدر ترقی یافتہ ہے وہاں خودکشی کا رجحان اسی حد تک غالب ہے یورپ میں ہسپانیہ نسبتاً کم ترقی یافتہ ملک ہے اس لیے وہاں خودکشی کا اوسط دوسرے یوروپی ملکوں کے مقابلہ میں کم ہے اس کے برعکس شمالی یورپ کے علاقوں میں خودکشی کا تناسب زیادہ ہے اور شمالی امریکہ میں یہ شرح ہر جگہ سے بڑھ کر پائی جاتی ہے اسی اعتبار سے خودکشی کا رجحان اور تناسب ان تمام ممالک میں پایا جاتا ہے جو دیہات اور شہروں کے درمیان آباد ہیں۔ ان تمام شہروں میں پایا جاتا ہے جو ترقی یافتہ اور پسماندہ ملکوں کی درمیانی سرحدوں پر واقع ہیں ان تمام معاشروں میں پایا جاتا ہے جن میں مذہبی اور روایتی اور غیر مذہبی اور جدید دونوں طبقات پائے جاتے

ہیں ایسا کیوں ہے ۔خودکشی کے رجحان کا سبب کیا ہے ؟ فرد کی تنہائی ۔
مذہب افراد کو ایک دوسرے سے مربوط کر کے ان میں ایک اجتماعی روح بیدار کرتا ہے اس کے ساتھ ہی مذہب ہر فرد اور اس کے خدا کو مربوط کر کے خدا کو انسان کا ہمدم بنا دیتا ہے دور گذشتہ میں فرد اور اجتماع کے درمیان صد ہا روابط تھے فرد اپنے خاندان، قبیلہ اور قوم کے ساتھ باطنی رشتوں کے ذریعہ مربوط تھا یہ اقتصادی اور اجتماعی آزادی کا دور ہے اس آزادی نے ہر فرد کو دوسرے سے بے نیاز کر دیا ہے اب فرد خاندان، ہمسایہ، ماں باپ، اولاد، دوست اور اعزا سے بے تعلق ہو گیا ہے اور اپنی مادی اور روحانی احتیاجات کی تکمیل کے لیے براہ راست معاشرے سے مربوط ہے عقلی اور منطقی انداز نظر نے روحانی، مذہبی اور روایتی روابط کو توڑ دیا ہے اور ریاضیاتی منطق اور مادی تصورات نے تمام روحانی اور وجدانی بنیادوں کو متزلزل کر دیا ہے فرد آزاد ہو گیا ہے، خودنگر اور خودکفیل ہو گیا ہے ۔ دوسروں سے بے نیاز ہو گیا ہے مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ تنہائی کا شکار بھی ہو گیا ہے کیونکہ دوسرے افراد بھی اس کی طرح آزاد اور اس سے بے نیاز ہیں۔ ہر شخص دوسرے شخص سے کسی مصلحت یا مفاد کے تحت تعلق رکھتا ہے ۔نتیجہ یہ کہ فرد اپنی ذات کے جزیرہ میں محصور ہے ۔ وہ تنہا ہے اور اس تنہائی کے کرب کی حالت میں اس پر خودکشی کا خیال حملہ آور ہوتا ہے دراصل تنہائی اور خودکشی ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ملے ہوئے ہیں جیسے کہ دو ہمسائے جن کے گھروں کی دیوار متصل ہو
آج کے معاشرے میں عورت اپنے لیے مرد کا انتخاب کرتی ہے ۔مرد اپنے لیے عورت کو چنتا ہے ۔ مگر دونوں اپنی جگہ ایک آزاد اور مستقل حیثیت رکھتے ہیں دونوں ایک دوسرے سے بے نیاز ہیں ۔ پھر کون سی قوت ان کو ایک دوسرے سے مربوط کرتی ہے ۔ یہ باہمی تعلق، جنسی، جذباتی، عشق و محبت یا دوستی اور رفاقت کا تعلق نہیں ہے یہ ایک دوسرے سے ہمدردی اور نیازمندی

اور غم گساری کا رشتہ بھی نہیں ہے پھر وہ کون سی بنیاد ہے جو ان دو آزاد اور بے نیاز افراد کو باہم مربوط کرتی ہے آج کے دور میں مرد اور عورت کے تعلق کی واحد بنیاد محض ایک قانونی ضرورت ہے جس کا تعلق منطقی اور افادی عقل سے ہے جس میں کوئی جوش یا حرارت نہیں پائی جاتی بلکہ جس کا سرچشمہ، سست اور بے نور محاسبۂ عقل ہے۔

جنسی آزادی کا تصور ویسے تو بلوغت کی ابتدا ہی میں سر اٹھاتا ہے مگر عملاً کوئی مرد یا عورت جب چاہے اس تصور اور آزادی پر عمل کر سکتی ہے جو شخص ایسی آزادی کا تصور رکھتا ہے وہ گویا اس بات کا قائل ہے کہ جنسی جذبہ کی تسکین کے لیے فقط ایک ہی شرط ہے اور وہ خود جنسی جذبہ کی بیداری ہے اگر کسی میں یہ جذبہ ضعیف ہے تو اس ضعف اور اس کمی کو سرمایہ کی قوت سے پورا کیا جا سکتا ہے محض روپیہ چاہیئے پھر انسان جس سطح پر بھی چاہے روپیہ خرچ کر کے اپنے جنسی جذبات کی تسکین کر سکتا ہے وہ زندگی کے ہر دور میں عمر کے ہر حصہ میں یا ڈان ژوان بن سکتا ہے یا اوناسیس امریکہ کی خاتونِ اول تک کو دولت کے بل پر خریدا جا سکتا ہے۔ اس میں اور بازاری عورت میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف نرخ کا فرق ہے[۱]

ایسے معاشرہ میں جہاں لڑکا اور لڑکی دونوں آزاد ہیں اور دونوں کو اپنے جنسی تقاضے پورا کرنے کی آزادی حاصل ہے کوئی شخص اس بات کو قرینِ مصلحت نہیں سمجھتا کہ وہ اپنی اس آزادی کو ازدواجی بندھن سے بدل دے اپنے آپ کو تمام عمر کے لیے مقید کرے۔ منطق، عقل، ریاضیاتی اقدار انفرادیت اور واقعیت کا تصور کوئی اس بات کا فتویٰ نہیں دیتا کہ فرد اپنی متنوع اور لامحدود آزادی کو جو اسے ہر طرح کے جنسی تجربات کی اجازت دیتی ہے۔ تج کر

۱؎ اوناسیس اور جیکولن کینیڈی کی طرف اشارہ ہے۔

خود کو محض ایک فرد کے ساتھ مقید کرلے

خاندان کی تشکیل

مرد ہو یا عورت جب تک ان کے جنسی جذبات پر شباب رہتا ہے ، رقص گاہوں ، ریسٹورانٹ ، گذر گاہوں اور ایسی صحبتوں میں جہاں جنسی جذبات کی تسکین پر کوئی قدغن نہ ہو غرق رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایسا وقت آتا ہے جب عورت کا جوش ٹھنڈا پڑجاتا ہے اسے ہوش آتا ہے اب وہ اپنے آپ کا جائزہ لیتی ہے اپنے گردوپیش کو دیکھتی ہے اب اسے کوئی شخص اپنی تلاش میں نظر نہیں آتا اور اگر کوئی اسکی طرف متوجہ ہوتا بھی ہے تو محض ماضی کی یاد کو تازہ کرنے کی خاطر۔ دوسری طرف مرد جنسی آزادی کے نام پر بے شمار تجربات کرتا ہے۔ وہ ہر باغ سے گل اور ہر گل سے خوشبو کو چنتا ہے اس کی زندگی ایک بے محابا لذت جوئی میں گزرتی ہے یہاں تک کہ جنسی جذبہ ضعیف پڑجاتا ہے مرد اپنی زندگی کے ایک ایسے دور میں داخل ہوجاتا ہے جہاں حب جاہ ومال شہرت اور مرتبہ کی طلب جنسیت کی جگہ لے لیتی ہے اور اس کے ذہن میں گھر آباد کرنے اور خاندان تشکیل دینے کا خیال سر ابھارنے لگتا ہے۔

جب عورت کو اس خطرے کا احساس ہوتا ہے کہ اس کے حسن وشباب کا دور ڈھل چکا ہے اب اس میں اتنی کشش نہیں رہی کہ جو مرد کو اس کی طرف متوجہ کرسکے اور جب مرد اپنی جنسی آزادی اور اپنے متنوع اور بے پایاں تجربات سے نڈھال ہوجاتا ہے تو ایسی عورت اور ایسا مرد ایک طویل اور تھکا دینے والے جنسی آزادی کے سفر کے بعد ایک دوسرے سے مل کر خاندان بنانے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔

خاندان تشکیل پاتا ہے مگر قوتِ محرکہ جو ایسے خاندان کی تشکیل کا سبب بنتی ہے عورت کا احساس زوال وشکست اور مرد کا احساس خستگی اور جنسی آزادی

سے فرار کا جذبہ ہے۔ ظاہر میں ایک خاندان بن گیا۔ مگر یہ خاندان بے روح اور بے کیف ہے یہاں نہ محبت کا جوش ہے۔ نہ کسی آئیڈیل کی تلاش دو افراد ایک دوسرے سے مل گئے ہیں مگر ان کے درمیان نہ کوئی جوش ہے نہ جذبہ، یہ دونوں مل کر کوئی اعلیٰ اور پرشکوہ خاندانی وحدت نہیں بناتے اس کے برعکس ان دونوں کے ملاپ کا نتیجہ خستگی اور بیزاری کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان، دونوں کو ایک دوسرے سے مل کر کوئی نیا جذبہ یا تجربہ حاصل نہیں ہوتا اس لیے کہ یہ ایسے تمام تجربات سے گذر چکے ہیں ان کے لیے اب کوئی چیز نئی نہیں ہے کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے ان کے دلوں میں کوئی جوش و جذبہ بیدار ہو سکے دونوں کو معلوم ہے کہ وہ ایک دوسرے سے کیوں مربوط ہوئے ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے کسقدر بے نیاز ہیں۔ دونوں اچھی طرح سوچ سمجھ کر تمام معاملات اور حالات کا جائزہ لے کر اپنی اپنی مصلحتوں کے تحت ایک دوسرے کا ہاتھ تھامتے ہیں۔ اور ہر فریق اچھی طرح سمجھتا ہے کہ اس کا مفاد اور اس کی ضرورت کیا ہے اب اگر وہ ایک دوسرے سے اظہار عشق کریں ایک دوسرے کے لیے قربانی اور فدا کاری کے جذبہ کا اظہار کریں تو یہ اظہار عشق محض دکھاوا بلکہ ایک طرح کی عیاری کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا

یہی وجہ ہے کہ ان کی شادی کی رسم کلیسا کے بجائے سٹی ہال میں انجام پاتی ہے۔ کلیسا ایسا جوڑوں کو خوش آمدید نہیں کہتا اس لیے ایسے دونوں میں جو اس کام کے لیے مخصوص ہوتے ہیں سٹی ہال کھچا کھچ بھرا رہتا ہے سٹی ہال کا کوئی کارندہ اپنے سینہ پر اپنے عہدہ کا بیج سجائے نظر آتا ہے (یہ ایک شہری ادارہ کا کاروباری نمائندہ ہے۔ کلیسا کا نمائندہ نہیں ہے۔ جو روحانیت، حرمت اور تقدس کی علامت سمجھا جاتا ہے) یہ نمائندہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے والے جوڑوں کے نام پکارتا جاتا ہے ان ناموں کی ایک طویل فہرست ہوتی ہے ہر مرد اور عورت جس کا نام پکارا جاتا ہے۔ نہایت میکانکی اور بے روح انداز

ہیں "ہاں" کہہ کر ازدواج کو قبول کرتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شوہر اور بیوی کے ہاں کہنے سے قبل ہی ان کے پیچھے کھڑے ہوئے بچے "ہاں" کا نعرہ بلند کر دیتے ہیں گویا اپنے ماں باپ کو رشتۂ ازدواج قبول کرنے پر آمادہ یا مجبور کر دیتے ہیں، عورتیں اور مرد فیس کی رقم ادا کرتے ہیں شادی کے رجسٹر پر دستخط کرتے ہیں اور تقریب شادی ختم ہو جاتی ہے اور پھر لوگ اپنے اپنے حول میں واپس چلے جاتے ہیں اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دو، تین سو عورتوں میں صرف بیس یا تیس عورتیں ایسی ہوتی ہیں جو اس تقریب کے موقع پر لباس عروسی پہنتی ہیں۔ ورنہ اکثر عورتیں یہی کہتی ہیں کہ اس عمر میں اور اس حالت میں ہم لباس عروسی پہن کر کیا کریں گے یہ تو خود اپنا مضحکہ اڑانا ہو گا۔

پھر عورت اپنے کام کی طرف لوٹ جاتی ہے اور مرد اپنے کاموں میں معروف ہو جاتا ہے کبھی کبھی یہ لوگ دوپہر کا کھانا کسی ریسٹورانٹ میں اپنے دوستوں کے ساتھ کھاتے ہیں مگر یہ اسی صورت میں ہوتا ہے جبکہ شادی ان کے اندر کوئی جوش و جذبہ بیدار کر سکے ورنہ اکثر جوڑے تو یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ کیا ہوا تھا وہ اس قصہ کو ہی فراموش کر دیتے ہیں جیسے کوئی بات ہوئی ہی نہ ہو رسمی کارروائی ختم ہونے کے بعد جب عورت اور مرد سٹی ہال کے دروازے سے برآمد ہوتے ہیں تو نہایت سرد مہری سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ یہ لوگ جو اس سے قبل خاصی مدت تک ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گذار چکے ہیں نہ صرف ایک دوسرے کے ساتھ بلکہ ان میں سے ہر فریق مختلف اور متعدد لوگوں کے ساتھ زندگی گذار چکا ہے اس لیے اب ان کے لیے شادی کوئی نیا اور دلچسپ تجربہ نہیں رہا یہی سبب ہے کہ زن و شوہر ایک رسمی تقریب کے بعد نہایت سرد مہری سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ جیسے کہہ رہے ہوں کہ آخر یہ سب کیا ہے یہ شادی مگر اس میں آخر کیا رکھا ہے۔ ہم کہاں

جائیں۔ کیا تفریح کے لیے جائیں۔ مگر تفریح پر تو ہم اس سے قبل ہی ہزار بار جا چکے ہیں۔ پھر کیا ہم آغوش کے کیف سے لطف اندوز ہوں مگر اس کا مزا بھی ہم ہزار بار چکھ چکے ہیں پھر کیا گھر کی طرف رخ کریں مگر ہم تو گھر ہی سے آئے ہیں۔ کون سی ایسی چیز ہے جو ان لوگوں کے لیے جذب و کشش کا باعث بن سکے جو ان کے خیال اور احساس کو تحریک دے سکے؟ ایسی کوئی چیز نہیں ہے پس یہی بہتر ہے کہ ہر دو فریق ہمیشہ کی طرح روز کی طرح اپنے معمول کے کاموں میں مشغول ہو جائیں تو گویا خاندان اس طرح تشکیل پاتے ہیں ہر دو فریق، مرد اور عورت، نہایت دقیق غور و فکر اور احتساب کے بعد ایک دوسرے کو قبول کرتے ہیں۔ یہ خاندان ایک معاشی شراکت ہے یا پھر قانون کا جبر اور دباؤ ہے۔ بچہ پیدا ہو گیا اور اس کی وجہ سے عورت اور مرد ایک دوسرے سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے پر مجبور ہو گئے لیکن یہ بندھن مجبوری کے طور پر قبول کیا گیا ہے اس میں کسی فریق کی خوشی، جوش یا جذبہ شامل نہیں ہے اس لیے نہ ان کا دل دھڑکتا ہے اور نہ ان کے خیال میں کوئی نئی لہر دوڑتی ہے حتیٰ کہ ان کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی نمودار نہیں ہوتی۔

اس خاندان کی بنیاد کمزور ہے اس لیے یہ خاندان سست اور کمزور خاندان ہے۔ بچے اس گھر میں کوئی جوش، جذبہ یا حرارت محسوس نہیں کرتے اور ان کے ماں باپ چونکہ بچوں کے لیے اپنی آزادی کو قربان کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے وہ بچوں کی پرورش کے لیے صرف روپیہ مہیا کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرتے ان کی آزادی میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ ان کی سرگرمیاں معمول کے مطابق جاری رہتی ہیں اور اس کے باوجود کہ وہ مصلحت کے تقاضوں اور قانون کے دباؤ کے نتیجہ میں ایک دوسرے سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو چکے ہوتے ہیں وہ رسمی طور پر ایک خاندان تشکیل دے چکے ہوتے ہیں مگر وہ ایک دوسرے سے عملاً جدا اور بیگانہ رہتے ہیں ان کی زندگی ماضی کی روش پر چلتی رہتی ہے وہ قانونی

اور رسمی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ ہیں مگر حقیقتاً اور عملاً جدا جدا ہیں انہوں نے ایک خاندان بنایا ہے مگر ان کے رویے نے اس خاندان کو پارہ پارہ کر دیا مرد جو صدہا جوان اور پرجوش عورتوں کی ہم آغوشی کا مزا چکھ چکا ہے ایک ایسی عورت سے جو خستگی اور درماندگی کا شکار ہے اور جس کا جنسی رویہ مرد کو متنفر کرنے کا سبب بنتا ہے کس طرح خوش اور مطمئن رہ سکتا ہے اسی طرح وہ عورت جو اس سے قبل بہت سے جنسی تجربات سے گذر چکی ہے اپنے شوہر کی سرد آغوش اور اس کے افسردہ رویہ کا جب اپنے سابقہ تجربات سے موازنہ کرتی ہے تو اسے سوائے کوفت اور مایوسی کے کچھ اور حاصل نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ کہ وہ ایک ایسے گھر سے جو جوش اور جذبہ کی حرارت سے خالی ہے فرار حاصل کرنے کے لیے شبل، سابق ہوٹلوں، کلبوں، تفریح گاہوں اور اسی طرح کے دیگر مقامات کی رنگینیوں اور سرمستیوں کی تلاش میں منہمک ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ یہ گھر جو دو افراد کے ایک ایسے معاہدہ کے نتیجہ میں بنا تھا جس کی اساس عقل و منطق پر رکھی گئی ہے عملی اعتبار سے اپنا عقلی جواز اور سند کھو بیٹھتا ہے

سرمایہ دارانہ معاشرہ میں عورت کی حیثیت

جنسیت بجائے عشق

ایک ایسے معاشرہ میں جس کا تمام انحصار 'پیداوار اور کھپت' اور کھپت اور پیداوار کے معاملہ پر ہو اور جہاں اقتصادی مفاد کے علاوہ اور کوئی بات سوچنا عملاً ممکن نہ ہو عورت کو ایک ایسی ہستی نہیں سمجھا جا سکتا جس کا وجود خیال انگیز پاکیزہ احساسات کا مرکز اور گہرے اور بے لوث عشق کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے جس کی ہستی کو محترم اور جس سے تعلق کو مقدس مانا جاتا ہے۔ جو ماں ہے شریک حیات ہے مونس و ہمدم ہے جو الہام و صداقت کا آئینہ ہے بلکہ اس نظام میں عورت کی صرف ایک ہی حیثیت ہے اور وہ یہ کہ وہ ایک ایسی جنسی، اقتصادی

ہے جسے اس کی جنسیت کی ترازو میں تولا جاتا ہے۔

سرمایہ دارانہ معاشرہ میں عورت سے دو کام لیے جاتے ہیں اوّل یہ کہ معاشرے کو اس طرح مصروف رکھا جائے کہ کسی شخص کو یہ سوچنے کا موقع نہ مل سکے کہ بورژوائی نظامِ معیشت میں وہ کن مظالم اور مصائب کا شکار ہے۔ کوئی یہ نہ سوچ سکے کہ وہ کس کے لیے محنت کرتا ہے کیوں مشقت جھیلتا ہے کس طرح کی بے مقصد اور بے ہدف زندگی گذار رہا ہے اس کی زندگی میں مصائب کا ذمہ دار کون ہے اور وہ آخر کیوں یہ آلام و مصائب جھیل رہا ہے۔

سرمایہ دار عورت کی جنسی کشش کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتا ہے وہ چاہتا ہے کہ مزدور کارکن، دانشور کسی کو سوچنے سمجھنے کی فرصت ہی نہ ملے تاکہ معاشرہ میں طبقاتی نظام اور سرمایہ دارانہ استحصال کے خلاف کوئی تحریک سر نہ اٹھا سکے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ عورت کی جنسیت کا استحصال کرتا ہے وہ، معاشرے میں ایسی اجتماعی اور تفریحی سرگرمیوں کو فروغ دیتا ہے جس میں عورت کی جنسی کشش لوگوں کے ذہنوں کو مسحور اور مفلوج کر دے اور معاشرہ اوقاتِ فرصت کو محض ان تفریحی اور عیاشانہ سرگرمیوں کے لیے وقف کر دے تمام فنونِ لطیفہ پر پوری شدت سے قبضہ کر لیا گیا ہے اور سرمایہ دارانہ اور بورژوائی نظام کے مفادات کے تابع بنا دیا گیا ہے۔ فنون جو ہمیشہ حسن، عشق، جذبات کی پاکیزگی اور روح کی بالیدگی کا ذریعہ رہے ہیں اب محض جنسیت کا آئینہ بن گئے ہیں۔ فرائڈازم نے گھٹیا اور بازاری جنس پرستی کو ایک علمی فلسفہ کا رنگ دید یا ہے انسان اپنے ابتذال اور اخلاق باختگی کو جدت، روشن خیالی اور واقعیت پسندی کا نام دینے لگا ہے اب بلند اور پاکیزہ خیالی کو آئیڈیلزم کہہ کر دور از کار گردانا جاتا ہے اور اس کی جگہ ادب، شعر، اور دیگر فنونِ لطیفہ پر جنسیت نے قبضہ جما لیا ہے یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج مصوری، نقاشی، شاعری، سینما تھیٹر افسانہ، ناول، غرض ہر فن جنسیت کے گرد چکر لگا رہا ہے اور اس جنسیت کا محور

عورت ہے۔ وہ عورت جسے سرمایہ دارانہ نظام نے اپنے مفادات کے تحت ایک قالب خاص میں ڈھال دیا ہے۔

گویا سرمایہ دارانہ نظام میں عورت کی ایک حیثیت تو یہ ہے کہ اس کی جنسیت کا استحصال کر کے اسے معاشرے کی تفریح اور ہوس رانی کا ذریعہ بنا دیا جائے تاکہ لوگ اصل مسائل پر توجہ نہ دے سکیں اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف کوئی تحریک سر نہ اٹھا سکے اور اس معاشرے میں عورت سے جو دوسرا کام لیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ سرمایہ دار اپنی مصنوعات کی زیادہ سے زیادہ کھپت کرنے کے لیے عورت کو اپنی مصنوعات کے اشتہار کا ذریعہ بناتے ہیں سرمایہ داروں کا مفاد اسی میں ہے کہ ان کی مصنوعات کی مانگ زیادہ سے زیادہ بڑھے اور وہ زیادہ سے زیادہ منافع پر اپنی اشیاء کو فروخت کر کے اپنے سرمایہ میں اضافہ کر سکیں۔ ان کی نظر میں عورت کی صرف ایک ہی افادیت ہے اور وہ یہ کہ وہ ایسی مخلوق ہے جو اپنی جنسی کشش کے ذریعے لوگوں کے جذبات کو برانگیختہ کر سکتی ہے۔ گویا سرمایہ دارانہ نظام میں عورت صرف ایک جہت رکھتی ہے وہ یک بعدی مخلوق ہے سرمایہ دار عورت کی اس خصوصیت کو جو اس کی جنس سے عبارت ہے اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتا ہے وہ عورت کو اشتہاری جنس بنا کر معاشرے میں نئے اخلاقی اقدار اور نئی حیات کو اجاگر کرتا ہے وہ معاشرے میں اپنی اشیاء کی مانگ بڑھانے کے لیے مصنوعی زندگی اور معیار زندگی کا راگ الاپتا ہے وہ عورت کو معاشرے میں ایک مصنوعی اور جنس زدہ فضا پیدا کرنے کے مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے اور جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں اس طرح وہ معاشرے کی توجہ اصل مسائل سے ہٹا دیتا ہے یعنی لوگ اس ظلم اور استحصال کو محسوس نہیں کرتے جو سرمایہ داری کے ہاتھوں ان کی تقدیر بنا ہوا ہے۔

اب عشق کی جگہ جنسیت نے لے لی ہے۔ عورت جو پہلے محبوبہ تھی۔ اب ہوس کا کھلونا ہے۔ وہ پہلے حصارِ محبت میں اسیر تھی اب خود اپنی بے محابہ آزادی میں

گزشتہ سابقہ تاریخ اور تمدن اور مذاہب میں اگرچہ عورت کو آج کی طرح سماجی اور اقتصادی آزادی حاصل نہیں تھی مگر الہام، احساس، اور خصوصیات روحانی کے نقطۂ نظر کے اعتبار سے اسے ایک نہایت بلند اور محترم مقام حاصل تھا اور اسے پاکیزہ احساسات اور عشق و محبت کا سرچشمہ سمجھا جاتا تھا۔ مگر آج کے سرمایہ دارانہ نظام میں اسے محض سرمایہ داری کے مفادات کے تحفظ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اسے معاشرے کی ہیئت اور کیفیت کو بدلنے اور سرمایہ داری کے اقتصادی اور سماجی ہدف کو حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے اب عورت اعلیٰ اخلاقی اور روحانی اقدار کا سرچشمہ نہیں رہی بلکہ اس کے برعکس اب عورت ایسی تمام اقدار کو نیست و نابود کرنے کا وسیلہ بن گئی اب وہ ایک روایتی اخلاقی یا مذہبی معاشرہ کو مصرف معاشرہ میں بدلنے کا کام انجام دیتی ہے فنون لطیفہ پہلے فکر بشر میں تجلی الہٰی کا پر تو سمجھے جاتے تھے اب عورت کی جنسیت کا استعمال کرکے سرمایہ داری نے فنون کو جنسیت زدہ کر دیا ہے تاکہ ان کے ذریعہ لوگوں کے فکر و احساس کو مفلوج اور دگرگوں کیا جاسکے۔

مشرق کا معاشرہ اور عورت

اس سیلاب کا رخ مشرق کی طرف ہے۔ جنسیت کے طوفان نے ہمیں بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ ہمارے معاشروں میں یہ کام بہت آسان ہے اس کے لیے بہت زیادہ سازگار حالات مہیا تھے۔ مغرب میں خصوصاً سویڈن، ناروے یہاں تک کہ فرانس اور جرمنی جیسے ممالک میں لڑکوں کے جنسی جذبات دیر میں بیدار ہوتے ہیں، ۱۷، ۱۸ سال کی عمر کے لڑکوں میں جنس مخالف کی طرف کوئی کشش یا میلان نظر نہیں آتا جبکہ اسی سن و سال کی لڑکیوں میں جنسی جذبات اور جنس مخالف کی طلب کا جذبہ پورے عروج پر ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان معاشروں میں لڑکے، لڑکیوں سے دور بھاگتے ہیں جبکہ لڑکیاں لڑکوں کو گھیرنے کی فکر میں

رہتی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان معاشروں میں لڑکوں کے اندر ایک منفی اور غیر صحت مند جنسی رویہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ آخر عمر تک پیچھا نہیں چھڑا سکتے خاندانی زندگی کا ان حالات سے متاثر ہونا بالکل فطری اور ناگزیر ہے۔

اور یہی وہ صورتِ حال ہے جس کے پیشِ نظر شمالی یورپ کے ماہرینِ عمرانیات ولفسیات نے بہت سارے ایسے طریقے ایجاد کئے ہیں جن کے ذریعے لڑکوں میں جنسی جذبہ کو بیدار کیا جا سکے ان طریقوں میں مصنوعی تحریکات بھی شامل ہیں اور وہ فطری میلانات بھی ہیں جنہیں عورت کے وسیلہ سے بیدار کیا جاتا ہے۔

لیکن مشرق میں ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مشرق میں نوجوان لڑکے بلوغت کے سن تک پہنچنے سے قبل ہی جنسی طور پر بیدار ہو جاتے ہیں اور یہی بات یعنی جنسی بلوغت کی زودرسی۔ وہ مسئلہ ہے جس سے مشرق کے معاشروں کا مطالعہ کرنے والے ماہرینِ سماجیات اور ماہرینِ نفسیات کے لیے بہت سے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں لیکن اصل بات یہ ہے کہ کوئی حقیقی مسئلہ پر غور نہیں کرتا۔ اس کے برعکس لوگ ضمنی اور غیر ضروری مسائل کو اہمیت دیتے ہیں مشرق میں صورت یہ ہے کہ لوگ نوجوان نسل کے حقیقی مسائل کو پس پشت ڈال کر طرزِ آرائش ولباس، عادات و اطوار اور سلیقہ وآداب جیسی بحثوں میں الجھے ہوئے ہیں یہ بحثیں دو گروہوں کے درمیان ہیں جن میں سے ایک اپنے آپ کو روایت پسند اور دوسرا جدت پسند کہتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ ان دونوں مکاتبِ فکر میں سے کوئی مکتبِ فکر دوسرے پر غالب آئے مگر اس سے اصل مسائل کے حل میں کسی طرح کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا ان میں سے ایک مکتبِ فکر خود کو متمدن کہتا ہے اور دوسرا متدین، لیکن حقیقت میں دونوں کا دعویٰ غلط ہے ان میں سے کسی کا نہ تمدن سے کوئی ربط ہے اور نہ تدین سے۔ ایک مکتبِ فکر کا دعویٰ ہے کہ اس کے نزدیک عورت کا مثالی نمونہ جناب فاطمہؑ اور جنابِ زینبؑ ہیں اور دوسرے گروہ کا دعویٰ ہے کہ وہ مغربی عورت کو آئیڈیل عورت سمجھتا ہے لیکن دونوں کا دعویٰ جھوٹا

ہے یا تو وہ دونوں دانستہ غلط بیانی کرتے ہیں یا پھر اپنے اپنے مثالیوں سے ناواقف ہیں۔

یورپ والوں کی خواہش ہے کہ مشرقی معاشروں کے مزاج کو بدل دیں۔ ہماری دولت کو لوٹ لیں۔ ہمارے فکر واحساس پر مسلط ہو جائیں۔ ہماری روٹی ہم سے چھین لیں اور ہمارے شعور، ہماری شناخت، ہمارے ارادے ہماری اصل اور اساس اور ہماری اقدار کو غارت کر دیں اس لیے کہ اس کے بغیر ان کے لیے ہمارے منہ سے لقمہ چھیننا اور ہماری دولت کو اپنی تجوریوں میں بھرنا ممکن نہ ہو سکے گا۔

اس معاشرتی تبدیلی کے عمل کی پہلی ضرورت تخلیہ ہے۔ تخلیہ کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے ذہن و شعور کو بالکل خالی کر لیں۔ اپنی انسانیت کو فراموش کر دیں اپنی قدروں کو بھلا دیں اور اپنی تمام روایات کو جو ہمیں خود اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے قابل بناتی ہیں۔ یکسر نظر انداز کر دیں ہم اپنے وجود کو خود شکستہ کر لیں اپنے فکر و شعور کو بالکل خالی کر لیں گویا ہماری مثال ایک ایسی خالی ٹوکری کی سی ہو جائے جس میں جب چاہو کوڑا کرکٹ بھر لو اور جب چاہو اسے پھر خالی کر لو

مشرق کی فکر اور مشرق کی روح کے ساتھ یہ کھیل کھیلا جا رہا ہے جب لوگ داخلی طور پر خود کو خالی کر لیتے ہیں ایمان و اقدار سے اپنا رشتہ توڑ لیتے ہیں جب وہ اپنی شناخت کھو دیتے ہیں ان کے نزدیک کوئی شے ایسی باقی نہیں رہتی جس پر وہ تکیہ کر سکیں کوئی شخصیت ایسی نہیں رہتی جسے وہ اپنا ہیرو سمجھ سکیں وہ اپنے ماضی کو ننگ وعار کا نمونہ سمجھتے ہیں ان کے خیال میں مذہب خرافات بن جاتا ہے وہ مذہب کو قدامت پرستی اور رجعت پسندی کے مترادف خیال کرتے ہیں اور مذہبی زندگی کو قابل نفرت گردانتے ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ خود اپنے وجود کو اپنی اصل اور نسل کو اور اپنی زندگی کے مقصد اور معنویت کو یا تو بالکل نہیں سمجھتے یا اگر سمجھتے ہیں تو غلط سمجھتے ہیں وہ اندرونی طور پر ایک

ایسے خلار کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جسے استعمار جس طرح چاہے پر کر سکتا ہے۔ ان کی مثال خالی مشک کی سی ہو جاتی ہے۔ وہ شدت تشنگی کا شکار ہو کر اپنے اندرونی خلار کو پر کرنا چاہتے ہیں اور یہی وہ مرحلہ ہے جہاں انہیں مغربی استعمار کے اشاروں پر چلنا پڑتا ہے۔

صورت یہ ہے کہ مشرق کو تباہ کرنے کے لیے ہر ایک کو خود سے بیگانہ کیا جارہا ہے، مسلمان، بدھ، ہندو، ایرانی، ترک، عرب، سیاہ، سفید غرض ہر ایک کے لیے ایک سی وضع تشکیل دی جارہی ہے۔ ہر ایک کو یکساں سانچے میں ڈھالا جارہا ہے، ہر مذہب، ہر قوم، ہر رنگ اور ہر نسل کے شخص کو ایک ہی شکل میں ڈھال کر یک بعدی شخص بنایا جارہا ہے یعنی ایسا فرد جو مغرب کے فکری اور اقتصادی مفاد کی خدمت کر سکے اور اپنے بارے میں نہ کچھ سوچے اور نہ اپنے مسائل پر غور کر سکے۔

عصبیت، انسانی اقدار، روایات، اور مذہب وہ موانعات ہیں جو مغرب کی یلغار کو روکتی ہیں اور اس یلغار کے مقابلہ میں مشرق کی حفاظت کرتی ہیں۔ عصبیت ایک مستحکم فصیل کی طرح ہے جو اسلام اور آزادی کی حفاظت کرتی ہے اور مغرب کے اثر و نفوذ کی راہ میں ایک سنگ گراں کی حیثیت رکھتی ہے۔ مسلمان اپنے دین پر فخر کرتا ہے اپنی زندگی کی معنویت اور اپنی اقدار کو برتر سمجھتا ہے اسلام کی تاریخ اس کا تمدن اس کی شخصیات اور اس کے ایمان اور مذہب کے اصول انسان کو آزادی، عظمت اور سربلندی کا احساس عطا کرتے ہیں۔ اپنی عصبیت کے حوالے سے مسلمان جب مغرب پر نگاہ ڈالتا ہے تو وہ اسے نو دولتیا اور تمدنی اعتبار سے اس کی عمر بہت کم پاتا ہے وہ مغرب پر تنقید کرتا ہے اسے اپنے مقابلہ میں حقیر گردانتا ہے۔ مغرب اس عظیم حفاظتی فصیل، عصبیت، پر بڑی عیاری سے حملہ کرتا ہے وہ اس فصیل میں رخنہ پیدا کرتا ہے اور لوگوں کے ذہنوں کو مفلوج کر کے ان کو فکری خلار سے دوچار کر دیتا ہے رفتہ

رفتہ وہ لوگ جو مغربی حملوں کی یلغار کا پامردی اور توانائی سے مقابلہ کرنے کی ہمت رکھتے ہیں نیست ونابود ہوتے چلے جاتے ہیں اور ان کی جگہ وہ لوگ لے لیتے ہیں جو اندرونی خلار کا شکار ہیں جن میں مغرب سے مقاومت کی تاب نہیں ہے۔ یہ کمزور اور حقیر اور بے مایہ لوگ جو مغرب چاہتا ہے وہ کرتے ہیں جو مغرب سے ملتا ہے اسے قبول کرتے ہیں مختصر یہ کہ وہ اس قالب میں ڈھل جاتے ہیں جس میں انہیں مغرب ڈھالنا چاہتا ہے۔

مشرقی معاشروں کی تبدیلی میں عورت کا کردار

تمام مسلمان ملکوں میں عورتوں کی حیثیت ایک ایسے طاقتور عامل کی ہے جو معاشرے کو بدلنے کی صلاحیت رکھتی ہے وہ قدیم روایات، آداب واخلاق، اجتماعی روابط معنوی اقدار غرض ہر شے کو بدلنے پر قادر ہے سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ ضروریاتِ زندگی کا پیمانہ بدل کر مغربی مال کے لیے زیادہ سے زیادہ کھپت کے مواقع فراہم کر سکتی ہے (یہاں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ اگر عورت معاشرے کو بدلنے پر قادر ہے تو وہ اس کی اقدار، روح اور معنویت کے تحفظ کی قدرت بھی رکھتی ہے) مگر ایسا کیوں ہے؟ بات یہ ہے کہ عورت ایک حساس روح رکھتی ہے خصوصاً مشرقی عورت کی حساسیت بہت شدید ہے اس لیے وہ نئی تہذیب و تمدن کی چمک دمک اور اس کے ظاہری حسن سے بہت جلد اور بہت زیادہ متاثر ہو جاتی ہے۔ بالخصوص جب اسے اس مغربی تمدن کے جلووں کے مقابلہ میں دوسری طرف صرف تاریکی اور بدصورتی نظر آئے۔ جب افریقی ممالک میں مغربی استعمار کا دور شروع ہوا تو یورپ کے عیار لوگ افریقی قبائل میں گھوم پھر کر رنگین شیشہ اور نقلی ہیرے جو اصلی ہیروں اور قدرتی جواہر کے مقابلہ میں بہت زیادہ شوخ رنگ اور زرق برق اور چمکدار نظر آتے ہیں فروخت کرنے لگے ماہرین نفسیات کے نزدیک یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ سادہ طبیعت بدوی عموماً ظاہر کی چمک دمک

سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور کسی شے کی اصل قدر و قیمت کے مقابلے میں اس کے ظاہری رنگ و روپ کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں (اگرچہ کہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے دوسرے طبقات بھی اس ظاہری اور مصنوعی چمک دمک کے سحر میں گرفتار ہیں جیسے عرب شیوخ، افریقی قبائل کے سردار، فلم اسٹار وغیرہ)

نتیجہ یہ ہوا کہ روٴسائے قبائل، بڑے امراء اور صاحبِ جاگیر لوگ اس سحر میں گرفتار ہو گئے اور اجتماعی تقریبات اور شادی بیاہ کے مواقع پر ان رنگین، شیشوں اور نقلی ہیروں کے زیورات کی نمائش ثروت مندی اور برتری کا نشان سمجھی جانے لگی مغرب کے عیار تاجران بے قیمت شیشوں کے عوض منہ مانگے دام وصول کرتے تھے جیسے بھیڑ بکریوں کا گلہ، یا کوئی زرخیز قطعۂ زمین یا کوئی ایسا علاقہ جہاں سے اصلی ہیروں کی کان کنی کی جا سکے یا جہاں قہوہ کاشت ہو سکے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ افریقہ کی حالت کو بدلنے میں وہاں کے بدوی قبائل کی سادہ لوح عورتوں نے تجدد پسندی کے جال میں پھنس کر کس قدر زبردست کردار ادا کیا ہے اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مشرقی معاشرے میں عورت کی حالت کس قدر قابلِ رحم ہے اور مذہب اور روایت کے نام پر اس کے لیے جو رسوم اور شعائر وضع کیے گئے ہیں وہ مذہب کی حقیقی روح سے کس قدر مختلف ہیں۔ عورت کو حصولِ علم، خواندگی اور بہت سے دوسرے انسانی حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے اجتماعی زندگی میں اس کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے اسے ترقی اور کمال کی طرف جانے کا کوئی راستہ نہیں ملتا، وہ اپنی عقل، فکر، احساس اور روح کی تربیت اور نشو و نما کے مواقع سے محروم ہے۔ حد یہ ہے کہ اسلام نے عورت کو جو مقام و مرتبہ دیا ہے اور بحیثیت عورت اس کے جو حقوق و فرائض معین کیے ہیں۔ ہم نے خود اسلام کے نام پر ان کی نفی کر دی ہے اور وہ تمام حقوق عورتوں سے چھین لیے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں عورت کی حیثیت محض ایک کپڑے دھونے کی مشین کی سی ہے۔ اس کی تمام قدر و قیمت یہ ہے کہ وہ بچوں کی ماں ہے۔ ہم نے عورت کو اس کے نام سے

محروم کر دیا ہے۔ ہمیں عورت کا نام زبان پر لاتے ہوئے عار محسوس ہوتا ہے اور ہم عورت کو اس طرح موسوم کرتے ہیں کہ یہ فلاں کی ماں ہے "

ستم گر اور ستم پذیر

حضرت علیؑ کا ارشاد ہے کہ اگر کسی جگہ ظلم ہو رہا ہے تو اس کی ذمہ داری دو فریقوں پر عائد ہوتی ہے ایک وہ جو ظالم ہے اور دوسرا وہ جو ظلم کو قبول کر رہا ہے (یعنی اس کے خلاف کوئی احتجاج یا مزاحمت نہیں کرتا) ان دو فریقوں کے تعاون اور اشتراک کے نتیجہ میں ظلم وجود میں آتا ہے ورنہ ظلم کا وجود ممکن نہیں ہے ظلم ہوا میں ظلم کے پاؤں نہیں جما سکتا۔ یہ دو طرفہ عمل ہے ایک شخص ظلم کرتا ہے اور دوسرا اس ظلم کو قبول کرتا ہے ظلم کے لیے یہ دونوں شخص ذمہ دار ہیں۔ دونوں مسؤل ہیں۔ ظلم کی ذمہ داری تنہا ظالم پر عائد نہیں ہوتی۔ اگر کوئی معاشرہ شکست سے دوچار ہوتا ہے تو اس شکست کی ذمہ داری اس معاشرے پر بھی ہوتی ہے۔ کوئی فاتح کسی معاشرے پر فتح نہیں پا سکتا جب تک کہ خود اس معاشرے میں ایسے حالات نہ ہوں جو فاتح کی فتح کے لیے راہ ہموار کر سکیں۔ مثلاً ساتویں صدی ہجری میں ہمیں چنگیز خان کے ہاتھوں ذلت اور شکست سے دوچار ہونا پڑا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہماری شکست محض چنگیز خان کی مہم جوئی کا نتیجہ تھی نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہم خود ایسے حالات پیدا کر رہے تھے کہ ہمیں شکست سے دوچار ہونا پڑے پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں ہم نے خود کو اس قدر بوسیدہ اور خستہ کر لیا تھا ہم اندرونی طور پر اس قدر کمزور پڑ چکے تھے کہ چنگیز کی فقط ایک ضرب سے ہم ریت کی دیوار کی طرح گر پڑے ہم ایک ایسے درخت کی طرح تھے جسے دیمک نے اندر سے چاٹ لیا ہو جب کسی درخت کو دیمک کھوکھلا کر دیتی ہے تو اس کی جڑیں زمین میں قائم نہیں رہ سکتیں وہ درخت زندگی اور توانائی سے محروم ہو جاتا ہے۔ کھوکھلا اور کمزور پڑ جاتا

ہے۔ وہ ہوا کے معمولی سے جھونکے کو برداشت نہیں کرسکتا۔ دراصل یہ طوفانی ہوا نہیں ہے جو درختوں کو اکھاڑ پھینکتی ہے بلکہ یہ خود درخت کی کمزوری اور اس کا کھوکھلا پن ہے جو اس کے زمین بوس ہونے کا سبب بنتا ہے کون نہیں جانتا کہ تند و تیز ہوائیں جنگل میں ہمیشہ چلتی رہتی ہیں پھر کیا سبب ہے کہ سب درخت نہیں گرتے بلکہ وقتاً فوقتاً ایک یا دو درخت زمین پر گر جاتے ہیں۔

اگر آج کی عورت دیوانہ وار رنگ بدل رہی ہے۔ تیزی سے مغرب زدگی کا شکار ہو رہی ہے اگر وہ خود کو مغرب کی گھٹیا عورتوں کے رنگ میں رنگ رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے معاشرتی مسائل سے غفلت برت رہے ہیں ہم یورپ کے استعماری اور اقتصادی نظام اور اس کے اثرات کی طرف سے آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں اس لحاظ سے ہم خود مغرب کے استعماری نظام کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں۔ ہم عورت کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ہماری قید و بند سے فرار حاصل کرے اور پھر مغرب اس مفرور قیدی کا آسانی سے شکار کر لیتا ہے ہم نے اس کو حقیر، کمزور، شکستہ پا، شوہر کی کنیز، بچوں کی ماں، (یہ عہد غلامی کی اصطلاح ہے جب عورتوں کو ام ولد کہا جاتا تھا۔) حتیٰ کہ بے ادبی اور بز جیسے القاب سے نوازا ہم نے اس کی خلقت کو انسانی خلقت سے جدا کر دیا ہے اور ہم اس طرح کی بحثیں کرنے لگے کہ کیا عورتوں کو لکھنا پڑھنا سکھانا جائز ہے یا نہیں۔ ہمارا استدلال یہ ہے کہ اگر عورت لکھنا سیکھ جائے تو ممکن ہے کہ وہ نامحرموں سے خط و کتابت کرنے لگے۔

ہم عورت کی عفت اور تقویٰ کی حفاظت کس طرح کرتے ہیں؟ اسے چہار دیواری میں مقید کر کے۔ ہم عورت کو انسان نہیں سمجھتے کہ جس کے فکر و شعور کی تربیت کی جاسکے جو خود برے اور بھلے میں تمیز و انتخاب کر سکے بلکہ ہم اسے ایک حیوان سمجھتے ہیں ایک ایسی وحشی اور غیر عقلی مخلوق سمجھتے ہیں جو فکر و شعور کے جوہر سے عاری ہے اور جس کی تہذیب و تربیت ممکن نہیں ہے۔ ہمارا انداز

روایات اور جناب فاطمہؑ کی پیروی کے نام پر کیا جا رہا ہے۔ عورت کی پردہ نشینی کو اس کی عفت کی علامت خیال کیا جاتا ہے اسے گھر کی چہار دیواری میں پردہ نشین بنا کر بٹھا دیا جاتا ہے اور اسے یہ سمجھایا جاتا ہے کہ اس کا اصل کام بچوں کی پرورش اور تربیت ہے لیکن میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایسی عورت جو خود ناقص اور نا اہل ہے۔ جس میں صلاحیت اور استعداد کی کمی ہے جس کا ذہن تربیت یافتہ نہیں ہے جو نوشت و خواند، تعلیم، کتاب، تربیت، تفکر، تمدن، ثقافت اور معاشرتی ضروریات سے بے بہرہ ہے کس طرح آئندہ نسل کی تربیت و تعلیم کے فریضہ کو انجام دے سکتی ہے۔

جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ایسی پردہ نشین عورتیں آئندہ نسل کی پرورش کنندہ ہیں ان کے نزدیک بچوں کی پرورش کا مقصد صرف ان کا جسمانی تغذیہ ہے اس لیے کہ وہ عورت جو خود ناقص اور غیر تربیت یافتہ ہو جو خود علم و تمدن و ثقافت سے بے گانہ ہو بچوں کی فکری اور ذہنی بالیدگی اور ان کی روحانی اور جمالیاتی تربیت میں کیسے حصّہ لے سکتی ہے وہ بچوں کی نفسیات اور ان کی نزاکتوں سے بالکل واقفیت نہیں رکھتی اس لیے وہ ان کی تربیت کے مشکل اور اہم فریضہ کو پورا کرنے سے معذور ہے اس کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ بچوں کو دودھ مہیا کرے اور ان کے کپڑے، پوتڑے، بدلتی رہے وہ بچہ کی تربیت کس طرح کرتی ہے بس یہ کہ اسے ڈانٹے، ڈپٹے، برا بھلا کہے، ڈرائے دھمکائے اور اگر بس چل سکے تو اسے زدوکوب کرے اور اگر بچہ پر بس نہ چلے تو خود اپنا سینہ پیٹے ان سب باتوں کا بھی اگر بچے پر کوئی اثر نہیں ہوتا تو وہ اسے کسی خیالی اور روایتی بابا سے ڈراتی ہے اس کے بعد جن، ملک الموت اور دیگر نادیدہ قوتوں سے ڈرانے کی باری آتی ہے پھر بھی اگر یہ بچہ قابو میں نہیں آتا تو اسے جن بھوت، دیو لولو وغیرہ سے ڈرایا جاتا ہے اس کے ساتھ ہی بچہ کو برا بھلا کہنے، کوسنے دینے اور اسی طرح کی دیگر لغویات اور خرافات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس نظام تعلیم و تربیت میں بچوں کی تربیت

کا واحد مقصد گریہ و بکا سمجھا جاتا ہے ذاکر (خطیب (روضہ خوان) اپنی تقریر کے ابتداء میں بزعم خود جو علمی گفتگو کرتا ہے اس کے مخاطب صرف مرد ہوتے ہیں اس لیے کہ عورت اتنا شعور و علم نہیں رکھتی کہ وہ علمی مطالب کو سمجھ سکے یا ان باتوں کا ادراک کر سکے جو عوامی سطح سے بالاتر ہیں۔ ان مجالس میں اگر عورتوں سے خطاب کیا جاتا ہے تو وہ کچھ اس طرح کا ہوتا ہے "اے ضعیفہ خاموش ہو جاؤ ٹھیک سے بیٹھو اپنے بچوں کو چپ کراؤ" گویا عورتوں کو صرف سرزنش کی جاتی ہے تمام گفتگو کا مخاطب صرف مرد ہوتے ہیں البتہ پڑھنے والا جب مصائب کی طرف گریز کرتا ہے تو پھر وہ عورتوں کو مخاطب کرتا ہے اب وہ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جن کے ذریعے عورتوں کو گریہ و بکا پر زیادہ سے زیادہ آمادہ کیا جا سکے مقصد یہ ہوتا ہے کہ عورتیں اپنے نالہ و شیون اپنے شور و بکا اور شور ماتم سے مجلس کی رونقیں بڑھا سکیں اور ذاکر زیادہ ... کامیاب قرار دیا جا سکے۔

عورت جس کا کام محض اتنا ہے کہ وہ گھر میں "تولید بچہ" کا فریضہ انجام دے اور معاشرے میں اس کا کام صرف تولید اشک ہو تو ایسی عورت کو جناب فاطمہؑ یا جناب زینبؑ کے کردار سے کیا نسبت ہے ہمارے معاشرے میں کس قسم (TYPE) کی عورتیں بنائی جاتی ہیں اور اس کے باوجود ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارا آئیڈیل (IDEAL) جناب فاطمہؑ ہیں۔ مگر ہم اس بات کو بالکل بھول جاتے ہیں کہ یہ وہ اعلیٰ اور مقدس ہستی ہے جنہوں نے زینبؑ جیسی بیٹی کی تربیت فرمائی۔ زینبؑ جو چند دن قبل کربلا میں اپنے بھرے گھر کو اجڑتے دیکھ چکی تھیں جن کی آنکھوں کے سامنے ان کے عزیزوں کو قتل کیا گیا تھا جن کے اپنے قابل فخر بیٹے ان کے سامنے دم توڑ چکے تھے ایک آمر و جابر کے دربار میں کس وقار اور دبدبہ کے ساتھ کھڑی تھیں۔ جو بنی امیہ کی ظالم اور وحشی حکومت کے جبر و تشدد سے مطلق ہراساں نہیں تھیں بلکہ سلطان جابر کے سامنے خود اس کے دربار میں کھڑے ہو کر نہایت جرأت اور استقامت کے ساتھ کلمہ حق کا

اعلان ان الفاظ میں کر رہی تھیں کہ " اس خدا کی حمد جس نے ہمارے خانوادہ کو ہر طرح کی عزت و افتخار سے سرفراز فرمایا اور ہمیں اپنی بے پایاں رحمت کے لیئے منتخب کیا۔"

بھلا ہمت و استقلال کے اس پیکر کو ہماری ان عورتوں سے کیا نسبت ہے جو ایک گھریلو چوہے سے خوفزدہ ہو جاتی ہیں۔

ہم نے عورت کو ہر چیز سے محروم کر دیاہے یہاں تک کہ وہ اپنے دین و مذہب کے شعور سے بھی محروم ہے وہ اسلام کو نہیں سمجھتی ایمان کے تقاضوں سے نا آشنا ہے مذہب کی روح سے بے خبر ہے وہ نہ اپنے مذہب کی شناخت رکھتی ہے نہ اس کی اپنی کوئی شناخت ہے۔ چونکہ اسے علم سے بیگانہ رکھا گیاہے اس لیے اس کا محبوب مشغلہ صرف غیبت کرنا ہے اس کا زیادہ تر وقت غیبت کرتے گذرتا ہے چونکہ اس کا کوئی علمی اور فکری مشغلہ نہیں ہے اس لیے اس کا کام محض کھانا پکانا ہے اور چونکہ اس کا علم، کتاب، مجالس، منبر اور دیگر اجتماعی امور سے کوئی تعلق نہیں قائم ہو سکا اس لیے اب یہ کہا جاتا ہے کہ عورت، مردوں کی برابری کس طرح کر سکتی ہے اس میں اس بات کی اہلیت ہی نہیں ہے کہ اسے علمی، فکری، یا دینی مشاغل میں شرکت کا موقع دیا جائے یہ ایسی ہی بات ہے کہ پہلے ہم کسی کو مفلوج بنا دیں اور پھر یہ استدلال کریں کہ چونکہ یہ مفلوج ہے اس لیے یہ سرگرمی سے شرکت سے محروم ہے۔

سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ تمام خرافات، جہالت تنگ نظری اور پسماندگی اور اس قومی روایت کی پیروی جو ماضی کے کہنہ اور فرسودہ نظاموں کی یادگار اور بدوی، غلامی اور پدرسالاری کے دور کی میراث ہے مذہب کے نام پر کی جارہی ہے یہ تمام عوامل جو ہمارے دور از کار ماضی کا ورثہ ہیں ایک مکڑی کے جالے کی طرح عورت کو اپنے حصار میں جکڑے ہوئے ہیں۔ عورت جہالت، بے مائیگی اور قدیم روایات کے جال میں گرفتار ہے اور یہ سب کچھ مذہب اسلام اسلامی

نظریہ ہے کہ عورتوں کی حفاظت کا واحد طریقہ انہیں قفس میں قید کر دینا ہے گویا وہ کوئی ایسا پرندہ ... ہے کہ اگر قفس کا در کھل جائے گا تو وہ فوراً اڑ جائے گا عورت کی عفت کو ہم شبنم کی طرح سمجھتے ہیں جو آفتاب کی نگاہوں کی تاب نہ لا کر فوراً اڑ جاتی ہے۔ عورت ہماری قید میں ایک ایسی مخلوق ہے جو گھر کے حصار سے باہر نہیں نکل سکتی اسے اسکول، لائبریری کالج یا یونیورسٹی میں جانے کی اجازت نہیں ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کالج یا یونیورسٹی میں غیر مسلم طلباء بھی پڑھتے ہیں یہ اقوام ہمارے خیال میں نجس ہیں بلکہ یہ لوگ انسان ہی نہیں ہیں اس لیے کہ یہ انسان کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ انسان ایک معاشرتی حیوان ہے اس لیے ہم ان انسان نما حیوانوں کے درمیان اپنی لڑکیوں کو کیسے بھیج سکتے ہیں؟ نتیجہ یہ کہ ہماری لڑکیاں تعلیم سے محروم رہتی ہیں اگرچہ کہ یہ ہمارا اعتقاد ہے کہ "تحصیل علم ہر مسلمان عورت اور ہر مسلمان مرد پر واجب ہے" اور تحصیل علم کا یہ فریضہ مسلسل اور جاری ہے یہ عہد سے لحد تک پھیلا ہوا ہے۔ ہم منبروں سے اس حدیث پیغمبرؐ کی تبلیغ کرتے ہیں رمضان کے پورے مہینہ وعظ و پند کی محفلیں سجائی جاتی ہیں لیکن ان محافل میں صرف مرد شریک ہو سکتے ہیں انہیں عورتیں کبھی شریک نہیں کی جاتیں صرف متمول گھرانے کی عورتیں جو اپنے گھروں پر استاد سے پڑھنے کا خرچہ برداشت کر سکتی ہیں تعلیم حاصل کر سکتی ہیں باقی تمام عورتیں تحصیل علم کی سہولت سے محروم ہیں وہ اس بات پر قادر نہیں ہیں کہ تحصیل علم کے دینی فریضہ کو پورا کر سکیں۔

مذہبی مجالس و محافل ہوں، دینی معاملات ہوں، تبلیغی امور ہوں یا قرآن، حدیث، فلسفہ تاریخ عرفان کا درس ہو عورت کے لیے کہیں جگہ نہیں ہے وہ ان میں سے کسی کام میں شریک نہیں ہو سکتی۔ اسے صرف مجالس عزا میں شرکت کی اجازت ہے اور وہ بھی پردے کے پیچھے۔ ان مجالس میں عورت کی شرکت

اسی طریقہ سے ہوتی ہے اس لیے کہ اس نظام میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ عورت اگر اپنی فکری اور روحانی تربیت پر وقت صرف کرے گی تو اس سے اس کے فریضہ۔ بچوں کی پرورش کو نقصان پہنچے گا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے قدیم روایتی معاشرے میں عورت کس بے چارگی کا شکار ہے افسوس کی بات یہ ہے کہ ہم نے ان انحطاط پذیر روایات پر مذہب کا جھوٹا غلاف چڑھا رکھا ہے اس معاشرے میں عورت کی زندگی کس طرح گذرتی ہے ابتداً وہ باپ کے گھر میں ایک ناپسندیدہ فرد اور ایک ایسے قیدی کی طرح رہتی ہے جسے تازہ ہوا بھی نصیب نہیں ہوتی یہاں تک کہ وہ جوانی کی منزلوں میں قدم رکھتی ہے ایک مقررہ رقم کے عوض جس پر بیچنے والا (اس کا پہلا مالک۔ والد) اور خریدنے والا (اسکا دوسرا آقا شوہر) راضی ہو جاتے ہیں وہ شوہر کے گھر منتقل ہو جاتی ہے۔ شوہر کے گھر منتقل ہونے وقت دستاویز بالفاظ دیگر قبالۂ ملکیت تحریر کی جاتی ہے اس میں اس کا کام اور اس کی قیمت دونوں کی نشاندہی کر دی جاتی ہے۔ اپنے نئے آقا (شوہر) کے گھر میں وہ ایک باعزت ملازم کی حیثیت رکھتی ہے جو خانگی امور کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ کھانا تیار کرتی ہے۔ بچوں کو دودھ پلاتی ہے اور اولاد کی نگہداری کا فریضہ انجام دیتی ہے غرض خانگی زندگی کے تمام امور انتظامات اور تمام داخلی معاملات کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے وہ ایک ملازم ہے اور ایک دایہ ہے لیکن کیونکہ وہ بغیر اجرت کے ملازمت کرتی ہے اس لیے اسے کوئی حقوق حاصل نہیں ہیں۔ چونکہ وہ رسم و شرع و قانون کے نام پر یہ خدمت انجام دیتی ہے اور چونکہ اسے ملازم کہنا رسم و رواج کے خلاف ہے اس لیے اسے گھر کی مالکہ کا نام دیا جاتا ہے اور چونکہ اس کا آقا اس کا شوہر ہے اس لیے وہ بیگم کہلاتی ہے اور چونکہ وہ اپنے شوہر کے بچوں کی دایہ گیری کرتی ہے اس لیے اسے ماں کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔ ہماری گھریلو عورتیں تمام عمر جو کام کرتی ہیں ان کی نوعیت ایک ملازم اور ایک دایہ کے کام سے کسی طرح مختلف نہیں ہوتی اس لیے کہ انہیں اس کے علاوہ اور

کسی کام کی تربیت نہیں دی گئی۔ وہ علم و شعور کی دولت سے بے بہرہ ہیں۔

اس مرحلہ پر ہم صاحبِ ثروت والدین اور شوہروں کی توجہ اس امر کی جانب خصوصی طور پر منعطف کرانا چاہتے ہیں کہ وہ اپنی بیٹیوں اور بیویوں کو محض اس وجہ سے کہ وہ عورت ہیں تحصیلِ علم و کسبِ کمال سے محروم نہ رکھیں اور اپنی اس روش کو دینداری اور شعائر اسلام سے منسوب نہ کریں اس لیے کہ تاریخ اسلام میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ عورتیں تحصیلِ علم کے بعد درجۂ اجتہاد تک پہنچیں اور انہوں نے مدرسوں میں معلمی کا فریضہ انجام دیا بہت سی خواتین نے نہایت مفید علمی اور اخلاقی کتابیں تالیف کیں۔

وہ عورتیں اور لڑکیاں جو تحصیلِ علم سے اس لیے محروم رہتی ہیں کہ ان کے پاس ضروری معاشی وسائل نہیں ہیں لیکن وہ اپنے والد اور شوہروں کے گھروں میں محنت اور مشقت سے کام کرتی ہیں نہایت قابلِ تعریف و تحسین ہیں۔ یہ قبائلی یا دیہاتی لڑکیاں تمام اجتماعی امور میں حصہ لیتی ہیں اور دولت پیدا کرنے کے کام میں پوری طرح ہاتھ بٹاتی ہیں۔ یہ گھر کے باہر گلہ بانی اور کھیتی باڑی میں مردوں کے ساتھ کام کرتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی گھر کے اندر کے تمام کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتی ہیں گویا یہ دولت پیدا کرنے کے اجتماعی عمل میں بھی شریک ہیں اور درونِ خانہ تمام امور کی دیکھ بھال بھی کرتی ہیں۔ یہ باغوں میں بیج ڈالتی ہیں، کھیتوں میں صفائی ستھرائی کرتی ہیں، میوہ چنتی ہیں درختوں سے پھل جمع کرتی ہیں۔ جانوروں کو آب و دانہ دیتی ہیں۔ ان کا دودھ دوہتی ہیں پھر اس دودھ سے مکھن، دہی اور پنیر تیار کرتی ہیں جسے گھر میں بھی استعمال کیا جاتا ہے اور بازار میں فروخت بھی کیا جاتا ہے یہ روئی دھنتی ہیں، سوت کاتتی ہیں کپڑا بنتی ہیں، کپڑے سیتی ہیں اور ان سب کاموں کے ساتھ ساتھ یہ اپنے بچوں کی دیکھ بھال بھی کرتی ہیں۔ گھر کا کھانا بھی پکاتی ہیں اور گھر کی صفائی ستھرائی بھی کرتی ہیں انہیں سے کچھ وہ بھی ہیں جو دستکاری اور حرفت سے بھی واقف ہیں اور گھریلو صنعتوں کا کام کرتی ہیں

ایسی عورت بیک وقت بیوی، دایہ، ماں، کارکن اور دستکار ہوتی ہے وہ ہمالیہ گلستاں کی طرح آزادی سے نشو و نما پاتی ہے صحرا کی قمریوں کی طرح پاکیزہ محبت سے سرشار ہوتی ہے آہوانِ دشت کی طرح عشق و محبت سے بچے پیدا کرتی ہے اور ان بچوں کو ماں کی ماما سے نوازتی ہے۔ مادہ کبوتر کی طرح وہ اپنے شوہر اور اپنے گھر سے مخلص اور وفادار ہوتی ہے وہ اس گھر میں جو قید و بند کی سختیوں سے آزاد ہے اپنے خلوص اور وفا کے پھول مہکاتی ہے۔ اس پر کوئی جبر نہیں ہے مگر اس کے عشق کی شدت اور خلوص اسے اپنے گھر سے وفادار رہنے پر مجبور کر دیتا ہے وہ اپنے گھر کو اپنے تمام خاندان کو عشق و وفا کے خلوص سے نوازتی ہے اور یہ سب کچھ اس آزادی کا کرشمہ ہے جو اسے حاصل ہوتی ہے۔ وہ آزاد ہے اس لیے وہ اپنے عشق و خلوص کو اپنی مرضی سے استعمال کرتی ہے بالآخر وہ اپنے ہاتھوں سے کھیتوں کی زمین کو سنوارتی ہے گھر میں اپنے بچوں کو پیار اور محبت سے پالتی ہے اور خواب گاہ میں اپنے شوہر کی خستگی کو دور کرتی ہے اور بازاروں میں اس کے ہاتھ کے تیار کئے ہوئے دستکاری کے بہترین نمونے فروخت کئے جاتے ہیں۔

اس کے برعکس سب سے ناکارہ اور ہیچ عورت وہ ہے جو خاتون خانہ کہلاتی ہے یہ ایک خوفناک مخلوق ہے جسے نہ مشرق کی روایتی عورت کہہ سکتے ہیں اور نہ جس میں مغرب کی جدید عورت کی کوئی خوبی پائی جاتی ہے یہ مغرب کی وہ جدید عورت نہیں ہے جو ایک ایسے گھر کی فرد ہوتی ہے جو دو افراد سے مل کر بنتا ہے۔ یہ دو افراد جو باہم شریک کار کی حیثیت رکھتے ہیں ان کی حیثیت یکساں اور مساوی سمجھی جاتی ہے اور دونوں دولت کمانے کے لیے گھر کے باہر کام کرتے ہیں۔ گھر کے اندر بھی لڑکی کو لڑکے کی طرح ہر طرح کی آزادی حاصل ہوتی ہے اور گھر کے باہر بھی لڑکی ہر طرح کی اجتماعی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لیے آزاد ہوتی ہے وہ مسائل کو تجربے کے ذریعہ سیکھتی ہے اور سمجھتی ہے وہ ہر چیز کو دیکھتی ہے۔ ہر بات سے واقف ہوتی ہے زندگی اور اس کے تمام معاملات اور مسائل کو سمجھتی ہے۔ وہ اپنے تجربات اور حادثات کے نتیجہ میں

برائی بھلائی، نیکی بدی، صلاح فساد، غرض زندگی کے تمام رنگ، تمام جلووں تمام معاملات اور مسائل کو عملی طور پر سمجھ سکتی ہے۔ وہ اجتماعی زندگی کی تمام نیرنگیوں کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ غرض وہ ہر اس بات سے باخبر ہے جس کا اس سے کسی طرح کا کوئی تعلق ہے اسے لڑکوں کی طرح تعلیم حاصل کرنے کی آزادی ہے وہ علم حاصل کرتی ہے مطالعہ کرتی ہے اپنے فکر و شعور کی تربیت کرتی ہے اپنے ذہن کو نشو و نما دیتی ہے اپنے شعبہ میں تخصص تک پہنچ جاتی ہے بالآخر اسے معاشرے میں اقتصادی اور سماجی آزادی حاصل ہے وہ اپنے رفیق حیات۔ اپنے شوہر کے انتخاب میں مطلق آزاد ہوتی ہے۔

مشرق کی ناکارہ ترین اور ہیچ اور پوچ عورت وہ ہے جو نہ مغربی عورت کی طرح اقتصادی اور نہ مشرقی قبائلی اور دیہاتی عورت کی طرح سرگرم عمل نظر آتی ہے یہ وہ خاتون خانہ ہے جو اپنے گھر کے کام کاج اور گھریلو زندگی کے امور سے کلی بے نیاز نظر آتی ہے۔ چونکہ اس کے پاس مالی وسائل ہیں اس لیے اس کے گھر میں باورچی دایہ نوکر اور دوسرے خدمت گار موجود ہیں جو گھر کے مختلف کام کاج اور بچوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ اب اس عورت کی صورت کیا ہے؟ کیونکہ یہ دیہاتی عورت نہیں ہے اس لیے کھیتوں میں کام نہیں کرتی کیونکہ اس کا تعلق اہل حرفہ سے نہیں ہے اس لیے اپنے شوہر کے ساتھ کام نہیں کرتی، چونکہ یہ یوروپی عورت نہیں ہے۔ اس لیے گھر سے باہر دفتروں میں کام نہیں کرتی، کیونکہ یہ تعلیم یافتہ نہیں ہے اس لیے کسی قسم کے غور و فکر سے عاجز ہے۔ کیونکہ اسے پڑھنا نہیں آتا اس لیے یہ کوئی کتاب نہیں پڑھ سکتی چونکہ اس نے کوئی تربیت حاصل نہیں کی اس لیے اسے کوئی فن یا ہنر نہیں آتا۔ چونکہ اسکے پاس دایہ ملازم ہے اس لیے یہ بچوں کو دودھ دینے کا کام بھی نہیں کرتی۔ چونکہ نوکر موجود ہے اس لیے گھریلو سامان کی خرید و فروخت نہیں کرتی چونکہ خانگی نوکر رکھ سکتی ہے اس لیے امور خانہ داری انجام نہیں دیتی۔ چونکہ باورچی موجود ہے اس لیے کھانا پکانے کی زحمت سے بے نیاز ہے اور چونکہ اس کے گھر میں

خود کار مشینی نظام موجود ہے اس لیے ملاقاتیوں کے لیے گھر کا دروازہ کھولنے کی تکلیف بھی نہیں کرتی سوال یہ ہے کہ پھر یہ کس مرض کی دوا ہے آخر اس . . . کی زندگی کا مقصد کیا ہے یہ زندہ ہے مگر اس کی زندگی کی دلیل اور جواز کیا ہے لوحِ وجود پہ یہ کس قسم کا نقش ہے دنیا میں اس عورت کی حیثیت کیا ہے نہ یہ حقیقی معنوں میں مغربی عورت ہے اور نہ مشرقی ۔ نہ جدید ہے نہ قدیم، نہ دیہاتی ہے نہ صحرائی نہ یہ دفتروں میں کام کرتی ہے نہ کارخانوں میں۔ نہ اس کا تعلق مدرسوں سے ہے نہ ہسپتال سے اسے نہ کوئی ہنر آتا ہے اور نہ کوئی فن ۔ نہ اس کا تعلق قلم سے ہے نہ کتاب سے یہ نہ خانہ داری کے کام کرتی ہے اور نہ بچوں کی دیکھ بھال کا فریضہ انجام دیتی ہے اور پھر یہ کہ یہ زنِ بازاری بھی نہیں ۔ اگر اس عورت کو کوئی نام دیا جا سکتا ہے تو وہ یہ کہ یہ زنِ شب جمعہ ہے ۔ آخر ایسی عورتوں کا کام کیا ہے؟ یہ خاتونِ خانہ ہیں ۔ بیگم صاحبہ ہیں ۔ ان کا شغل کیا ہے؟ زیادہ سے زیادہ اشیائے صرف کا استعمال ۔ یہ اپنا وقت کیسے گذارتی ہیں ایک لحاظ سے یہ بہت معروف رہتی ہیں ۔ دن رات اپنی ، معروفیات میں گرفتار رہتی ہیں مگر یہ کرتی کیا ہیں ۔ ان کے بہت سے کام ہیں ۔ مثلاً غیبت، حسد، دوسروں کے مقابلہ میں اپنی بڑائی کا اظہار اپنی شان و شوکت کی جھوٹی نمائش، دوسروں سے رقابت، تہمت، تکبر، بڑے بول، خود نمائی، ناز، ادا اطوار، عشوہ، غمزہ، جھوٹ، لڑائی جھگڑے وغیرہ وغیرہ ......

یہ خاتونِ خانہ اپنے طریقِ زندگی اور اپنے شعائرِ قدیم کو نبھائے جا رہی ہے وہ اپنی قسم کی دیگر عورتوں کے ساتھ ہمیشہ رقابت، حسد اور تصادم میں مبتلا ہے وہ اپنی مخصوص سرگرمیوں میں ہمہ تن غرق ہے اور اس طرح وہ اپنی زندگی کے بھیانک خلا اور اپنے وجود کی سنگین بے معنویت کو پر کرنا چاہتی ہے پرانے زمانہ میں زنانہ حمام ہوا کرتے تھے ۔ جہاں ہفتہ میں ایک بار اس قسم کی بے کار اور معمول عورتیں جمع ہو کر ایک دوسرے کو اپنی حکایت سنایا کرتی تھیں ۔ گویا ان زنانہ حماموں کی حیثیت ایک سیمینار کی سی ہوتی تھی ۔ جہاں ہر عورت اس ہفتہ کا کوئی اہم کام اور بڑا واقعہ

دوسروں کو سنا کر ان کو مبتلائے حیرت کرتی اور ان سے داد وصول کرتی۔ یہ واقعات کچھ سچ ہوتے اور کچھ من گھڑت۔ انہیں وہ محترم خواتین اپنے اپنے مخصوص انداز میں بیان کرتیں اور اپنے اس بیان میں اپنی خیال پردازی کے جوہر دکھاتیں تاکہ ان کی کہانی میں صداقت کا خلاء تخیل سے پُر کیا جا سکے اس حکایت کا مقصد اپنی بڑائی کا اظہار اور اس کے ساتھ ہی یہ خواہش ہوتی کہ دوسری عورتیں ان کے بیان سے مرعوب و متاثر بلکہ مبہوت و متحیر ہو سکیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ خواتین جنہیں یہ حکایت سنائی جاتی ہے وہ اس بات کو سمجھنے کے باوجود کہ جو کچھ بیان کیا جا رہا ہے اس میں بہت کچھ محض جھوٹ، فریب اور اختراع ہے اس بیان کو پوری دلچسپی سے سنتیں اور اپنی پسندیدگی اور حیرت کا اظہار بھی کرتیں اس لیے کہ ان کے پاس بھی اسی قسم کی کوئی نہ کوئی حکایت ہوتی جسے وہ دوسروں کو سنا کر انہیں حیرت زدہ کرتے اور ان سے داد وصول کرنے کی آرزومند ہوتیں۔ اس طرح یہ بیچاری اور معزز خواتین ہفتہ میں ایک بار اپنے لیے ایک دلچسپ مصروفیت تلاش کرتی تھیں جس کے ذریعہ وہ اپنی ہفتہ بھر کی بے کاری، اپنی بے مقصد اور ہیچ زندگی اپنے جہل اور حمق، اپنے وجود کے اندرونی خلاء اور اپنی اجتماعی زندگی کی بے معنویت کا مداوا کرنا چاہتی تھیں۔

مگر آج کے دور میں متمول طبقہ کے لیئے 'زنانہ حمام' بند ہو گئے ہیں اور جدید تمدن نے ان معزز خواتین کو اس اجتماعی مشغولیت اور مصروفیت سے بھی محروم کر دیا ہے۔ جو ہفتہ میں ایک دن ایسی خواتین کی بے رنگ زندگی میں رنگ بھر دیتی تھی۔ اب زنانہ حمام کی جگہ، عورتوں کی مختلف انجمنوں نے لے لی ہے۔ کلب قائم ہو گئے ہیں جہاں یہ ثروت مند خواتین اپنی دلچسپیاں تلاش کرتی ہیں۔ مگر یہ کلب، یہ جدید ادارے بے روح اور بے رنگ ہیں اور ان میں تو وہ گرمی اور حرارت بھی نہیں ہے جو سابقہ دور کے زنانہ حمام میں پائی جاتی تھی۔

مذہبی یا نیم مذہبی اجتماعات، محافل، مجالس، نذر و نیاز، عقیقہ اور قربانی اور معاشرتی تقریبات جیسے شادی بیاہ اور اس سے متعلقہ رسوم عورتوں کے

لیے اجتماعی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے مختلف مواقع تھے۔ جن میں عورتیں مذہب، رسم و رواج اور معاشرت کے نام پر شرکت کر کے اپنی تنہائی اور بے کاری کا مداوا کرتی تھیں اپنی اہمیت اور فعالیت کو اجاگر کرتی تھی اور اپنی شخصیت، انفرادیت حسن، زیبائی، آرائش، لباس اور زیورات اور اپنی خاندانی ثروت و دولت کا اظہار کرتی تھیں۔ لیکن اس قسم کی تقریبات آج کل کی موجودہ نسل کی نوجوان عورتوں کے لیے دلچسپی اور کشش نہیں رکھتی، نوجوان عورت ایسی تقریبات میں بہ جبر و اکراہ شرکت کرتی ہے۔ ان محفلوں میں وہ خود کو بے گانہ اور تنہا محسوس کرتی ہے۔ لہٰذا وہ ان اجتماعات سے فرار کرتی ہے۔

یہ نوجوان لڑکی جو اپنی ماں کے مقابلہ میں ایک دوسرے عہد اور دوسری نسل سے تعلق رکھتی ہے اور اپنی زندگی عالم برزخ میں گذار رہی ہے۔ فکری اعتبار سے بھی اور عملی اعتبار سے بھی وہ ایک برزخ میں ہے۔ اس کے لیے خانم بزرگ بجائے خود ایک عالم جہل و حماقت ہے۔ وہ رسم و رواج کی ایک ایسی دنیا ہے جو ناروا اور مبنی بر جہل پابندیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ بزرگ خواتین اجتماعی زندگی کو پرانے ڈھرے پر قائم رکھنا چاہتی ہیں وہ اپنے رسوم و رواج کے بندھنوں میں اس طرح جکڑی ہوئی ہیں کہ انہیں وقت بدل جانے کی خبر تک نہیں ہے لیکن نوجوان نسل کی عورت جو علم سے آشنا ہے۔ جس کا کتاب سے تعلق قائم ہو چکا ہے جو مختلف زبانوں کی کتابوں کے تراجم پڑھ چکی ہے، جرائد، ناول، فن، اور ثقافت سے واقف ہے، جو تمدن جدید اور ثقافتِ مغرب سے آگاہ ہے۔ جو درسگاہوں میں تعلیم حاصل کر کے علم و دانش کی ترقی کی خوشبو سونگھ چکی ہے اس کے لیے زنانہ محافل یا مجالس جس میں عموماً ایسے لوگ خطاب کرتے ہیں۔ جو ناخواندہ یا نیم خواندہ ہیں کوئی کشش نہیں رکھتیں وہ اس طرح کی سرگرمیوں کو برداشت نہیں کر سکتی وہ چاہتی ہے کہ اپنے فرسودہ اور خستہ ماحول سے فرار کرے۔ مگر وہ فرار کر کے جائے کہاں؟ اس عالم کے مقابل جو عالم اس کے سامنے ہے اور جو اسے بڑے شائستہ

اور دلکش جیلوں سے بلا رہا ہے وہ مغرب کی ثقافت کا عالم ہے یہ وہ دنیا ہے جہاں رقص گاہیں ہیں شراب خانے ہیں. شبینہ کلب ہیں ۔ کثیف کیفے ٹیریا ہیں ۔ یہ دنیا اس کے انتظار میں ہے کہ اسے اپنے جال میں پھنسا لے اسے ایک جنسی شکار بنالے

لیکن وہ چاہتی ہے کہ وہ اپنی انسانی شخصیت ، ایمان اور اخلاق سے وفادار رہے۔ لیکن دشواری یہ ہے کہ ماں، باپ ، چچا ، دیگر اعزا اور مذہبی ٹھیکیدار ، مذہب، اخلاق اور تحفظ شخصیت کے نام پر اسکے سامنے جو کچھ پیش کر رہے ہیں۔ وہ محض چند الفاظ کا مجموعہ ہے اور وہ الفاظ یہ ہیں ۔ نہ کرو، نہ جاؤ ، نہ بولو، نہ دیکھو ، نہ چاہو، نہ لکھو ، تم نہیں سمجھتے ، تم نہیں جانتے وغیرہ ۔

ہم دیکھتے ہیں کہ وہ عورت جس کا تعلق قدیم نسل سے ہے جو ماں ہے وہ ایک ایسی دنیا میں رہتی ہے جو ہیچ و پوچ ہے ، بے کار اور بے معنی ہے نہ اس کی زندگی میں کوئی ہدف ہے نہ کوئی مسئولیت، نہ اس کی زندگی کا کوئی فلسفہ ہے اور نہ معنویت اس کے پاس دولت کی فراوانی ہے اس لیے اس کی زندگی میں کوئی مسئلہ نہیں ہے کوئی دکھ درد نہیں ہے اس کی زندگی میں ایک ایسا خلا ہے جو اس کی گھریلو زندگی کے روز و شب کے معمولات کسی طرح پر نہیں کر سکتے، مجبوراً وہ گھر سے نکل کر بازار جاتی ہے ۔ وہاں اشیاء کی خریداری کے ذریعہ اپنی زندگی کے تکدر کو دور کرنے کی کوشش کرتی ہے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ زیورات اور جواہر کی خرید کے ذریعہ، مختلف گراں قدر و قیمت اشیاء کی خرید کر کے لوگوں کو مبہوت اور متحیر کردے اور اس طرح اپنے لیے ایک گونہ مسرت اور افتخار حاصل کر سکے لیکن اس ماں کی بیٹی اس قسم کی باتوں سے اثر قبول نہیں کرتی ۔ وہ دوسری ہواؤں میں سانس لیتی ہے وہ گویا ایسی گڑیا ہے جس کا ذکر مدرسہ کی کتاب دوم میں ملتا ہے جو دو بار لیش بچوں کے درمیان پھنسی ہوئی ہے ۔ یہ بچے نادان ہیں اور کوئی بات نہیں سمجھتے ۔ ان میں سے ہر ایک اس گڑیا کو اپنی طرف پوری قوت سے کھینچ رہا ہے ۔ اس کھینچ تان کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گڑیا ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے ٹوٹ کر بکھر جاتی ہے ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ

نوجوان عورت ٹوٹ رہی ہے بکھر رہی ہے۔ بلکہ ریزہ ریزہ ہو چکی ہے۔

عہد جوانی میں اس کا دل رومانوی خیالات کی آماجگاہ ہے۔ وہ رنگین فضاؤں میں پرواز کر رہی ہے۔ جوانی کی رنگینیاں، آزادی اور عشق کے جلوے جنسی جذبات کا طوفان، نوجوانی کے ارمان اور آرزوؤں کا بحران اسے گھیرے ہوئے ہے وہ ایک نئی اور رنگین دنیا کی تصویر دیکھ رہی ہے۔ وہ قدیم دنیا کی طرف پشت کر کے اپنے گرد کھڑے کئے گئے حصار میں کہیں کوئی روزن یا شگاف تلاش کرتی ہے تاکہ اس کے ذریعہ وہ نئی اور رنگین دنیا کا چوری چھپے نظارہ کر سکے۔ وہ اپنی خیالی دنیا میں غرق ہے مگر ظاہری اور جسمانی طور پر وہ قدیم دنیا کی قیدی ہے وہ اپنے ماں باپ کے احکام میں جکڑی ہوئی ہے۔ وہ ایک مکھی ہے جو مکڑی کے جال میں گرفتار ہے اور مکڑی کا یہ جال، نہ، نہ، نہ کے تاروں سے بنا گیا ہے۔ وہ محسوس کرتی ہے کہ اس کا وجود محض اس تصور کی بنا پر کہ وہ ایک لڑکی ہے، نہایت ناپسندیدہ اور خطرناک سمجھا جاتا ہے اسے گھر کے گوشوں میں چھپا کر رکھا جاتا ہے یہاں تک کہ اسے قانونی اور رسمی طور پر کسی ایسے شخص کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو اسے اپنی حرم سرا میں لے جاتا ہے شوہر کے گھر میں اس کا دائرہ عمل محض مطبخ اور بستر کے درمیان محدود رہتا ہے اس کے وجود کا اثبات اس کی معنویت اور اہمیت اس کے شوہر کے شکم اور زیر شکم پر منحصر ہوتی ہے اسے مذہبی جلسوں اور دینی اجتماعات تک میں بھی شرکت کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس نظام فکر میں مذہب بھی زنانہ اور مردانہ شعبوں میں تقسیم ہو گیا ہے نوحہ خوانی، مجلس، ماتم، اور نذر و نیاز عورتوں کا مذہب ہے جبکہ حوزہ علمی، منبر، مدرسہ لائبریری، درس، بحث و گفتگو مردوں کا مذہب ہے

فریاد استعمار

آخر یہ زمین کیسے ہموار ہوئی، کس نے ہموار کی جو استعمار کو یہ نعرہ بلند کرنے کا موقع مل سکا کہ آزاد ہو جاؤ۔ آزادی مگر کس چیز سے۔ عورت کس چیز سے آزادی

حاصل کرے کون سی ایسی بات ہے جس سے آزادی حاصل کی جائے۔ مگر یہ کون سوچے۔ استعمار نعرہ بلند کر رہا ہے تمہارا سانس گھٹ گیا ہے۔ تم محرومی کا شکار ہو آزاد ہو جاؤ۔ ہر چیز سے آزاد ہو جاؤ۔ ہر قید سے آزادی حاصل کر لو۔

وہ کہ جو سنگین ترین بوجھ تلے دبی ہوئی ہے۔ جس کا سانس تک گھٹ چکا ہے اب فقط یہ سوچ رہی ہے کہ وہ آزادی کی فضا میں سانس لے سکے اور وہ اس قید اور فشار سے آزاد ہونا چاہتی ہے اور اسے یہ سوچنے کی مہلت نہیں ہے کہ وہ آزادی کس طرح حاصل کرے غلامی کا جوا اپنی گردن سے کس طرح اتارے۔

عورت آزاد ہو گئی۔ مگر یہ آزادی علم و دانش، تخلیق و تہذیب اور روشن خیالی کا نتیجہ نہیں ہے یہ آزادی فکر و نظر کی بلندی، سطح شعور، احساس کی تبدیلی کا ثمر نہیں ہے۔ جہاں ذہنی سطح نہیں بدلی، عورت فکر و شعور کے اعتبار سے اسی طرح پست ہے۔ مگر وہ آزاد ہو گئی ہے۔ یہ آزادی قینچی کا ثمر ہے۔ قینچی نے اس کی چادر کو قطع کر دیا اور چادر سے آزادی حاصل کر کے عورت یہ سمجھ رہی ہے کہ وہ آزاد ہو گئی۔ روشن خیال بن گئی۔

مسلمان اور مشرقی عورت کے مسائل پر نفسیات دانوں اور ماہرین عمرانیات کے نظریات استعمار اور استحصال کے ہاتھوں میں ایک زبردست حربہ ہیں۔ جسے وہ اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتے ہیں ان ماہرین کے نزدیک عورت کی تعریف یہ ہے کہ عورت وہ حیوان ہے جو اشیاء کو خریدتی ہے۔

ارسطو نے انسان کی نہایت جامع اور مانع تعریف اس طرح کی تھی کہ انسان حیوان ناطق ہے۔ اب عورت کے حوالے سے اس تعریف کو یوں تبدیل کر لیا گیا ہے کہ "انسان ایک ایسا حیوان ہے۔ جو اشیاء کو خریدتا ہے" اس کے علاوہ عورت کا نہ کوئی کام ہے اور نہ وہ کسی بات سے دلچسپی رکھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا نہ کوئی آئیڈیل ہے نہ کوئی قدر، نہ کوئی نقش ہے اور نہ کوئی معنی۔

عورتوں کے متعلق ایک رسالہ نے یہ اعداد و شمار دیئے ہیں کہ ۱۹۵۶ء اور

۱۹۷۶ء کے درمیان تہران میں عورتوں کی آرائش وزیبائش کے سامان کی کھپت میں ۵۰۰ گنا اضافہ ہوا ہے۔ یہ اضافہ حیرت ناک ہے۔ اقتصادی دنیا میں ایک معجزہ ہے۔ پوری تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ عام طور پر اشیاء صرف کی کھپت میں ۸ فیصد، ۹ فیصد، ۱۰ فیصد یا حد سے حد ۲۰ فیصد اضافہ ہوتا ہے۔ مگر ۵۰۰ فیصد اضافہ کی مثال پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر دس سال قبل تہران میں سرخی پوڈر اور دیگر سامان آرائش پر دس ہزار تومان خرچ ہو رہے تھے تو اب ۵ ملین تومان کی خطیر رقم خرچ کی جا رہی ہے۔

معاشرے میں کسی ایک شے کا صرف بہت سی دوسری اشیاء کے استعمال کی راہ ہموار کرتا ہے۔ مثلاً جب قبا کی جگہ کوٹ پتلون کا استعمال شروع ہوتا ہے تو ساتھ ہی پرانی وضع کے جوتوں کی جگہ جدید وضع کے بوٹ، قدیم وضع کی ٹوپیوں کی جگہ جدید وضع کے ہیٹ استعمال ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ گھروں میں قالین کی جگہ نیا فرنیچر آتا ہے۔ غرض بہت سی پرانی چیزیں نئی چیزوں سے بدل جاتی ہیں۔

پس جب یورپ ہمارے معاشرے میں اشیائے صرف میں سے کوئی نئی شے بھیجتا ہے تو اس کے ساتھ ہی بہت سی دیگر اشیاء اور مصنوعات کے لیے راستہ کھل جاتا ہے اور جب اشیائے صرف بدل جاتی ہیں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ ان اشیاء کو استعمال کرنے والے انسانوں میں بھی تبدیلی واقع ہو رہی ہے اس لیے کہ اشیاء صرف اور مصرف کنندہ میں ایک بنیادی تعلق پایا جاتا ہے۔ جب معاشرے میں اشیائے صرف کی نوعیت بدلتی ہے تو مصرف کنندگان کے عقیدہ، رسم و رواج، روایت، تاریخ، ثقافت اور مذہب پر اس کے اثرات کا مرتب ہونا ناگزیر ہے۔

اسلامی ممالک میں جب عورت ایک ایسے مصرف کنندہ میں تبدیل ہو جاتی ہے جو مشرقی اشیاء کی بجائے یورپی اور امریکی مصنوعات استعمال کرنے لگتی ہے تو اس کے ساتھ ہی وہ خاندانی اور اجتماعی زندگی میں تبدیلی کا ایک موثر عامل بن جاتی ہے وہ نسل امروز و فردا کے افکار و خیالات اور معاشرے کے مزاج کو متاثر کرنے کی

صلاحیت رکھتی ہے، وہ اخلاق، اقدار، ادب، فن، عقیدہ غرض ہر چیز پر گہرے انقلابی اثرات مرتب کرسکتی ہے۔ مغربی استعمار اسے اس مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔

موجودہ دور کے اقتصادی، اصول، تمدن اور ثقافت اجتماعی امکانات، معاشرتی روابط کا تغیر، فکر جدید وغیرہ وغیرہ اسلامی معاشرے پر ایک ناگزیر اثر ڈال رہے ہیں اور لوگوں کی فکر، ان کی وضع، ان کی روایت اور ٹائپ دگرگوں ہو رہی ہے۔ لامحالہ عورت داخلی اور ظاہری ہر دو اعتبار سے تبدیل ہونے پر مجبور رہے اس کا ظاہر بھی بدل رہا ہے اور باطن میں بھی تبدیلی ہو رہی ہے اس لیے کہ آج کی عورت کے لیے پرانی وضع، روایتِ قدیم، ناموزوں اور نامناسب ہے۔

اب کہ تبدیلی کا عمل ناگزیر ہے اور معاشرہ کے اہل فکر و اہل خبر و نظر، اس تبدیلی کا پورا شعور نہیں رکھتے اور اس کی طرف سے غفلت برت رہے ہیں، سرمایہ داروں کے لیے یہ اچھا موقع ہے کہ وہ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھائیں اپنے تیار کردہ قالب کو زیادہ سے زیادہ دلکش اور موثر بنائیں تاکہ عورت جب روایتی اور قدیم قالب کو توڑ کر آزاد ہو تو اس پر اپنا قالب مسلط کر دیں اسے اپنے وضع میں ڈھال لیں اسے ایک ایسی ٹائپ میں تبدیل کر دیں جو ان کے مفادات کے مطابق ہو اور جو معاشرے میں "پانچویں کالم" کا کام انجام دے یعنی داخلی طور پر خارجی دشمن کے لیے راہ ہموار کرے۔

ہمیں کیا کرنا چاہیئے

اس ذہنی اور فکری یلغار کے مقابلہ میں ہم کیا کریں۔ کون ہے جو اس استعماری حملہ کے خلاف ہمارا دفاع کرسکتا ہے۔ وہ جو اس فکری یلغار کا مقابلہ کرنے میں کوئی کردار ادا کرسکتی ہے وہ نہ روایتی عورت ہے کہ جو کہنگی اور درماندگی کا شکار ہے۔ جو ماضی کے قالب میں آرام اور اطمینان سے ہے اور اس قالب کو بدلنے

کی کوئی تڑپ محسوس نہیں کرتی اور نہ وہ جدید عورت ہے جس کی مثال ایک چابی کی گڑیا کی سی ہے جو دوسروں کے اشارے پر ناچ رہی ہے اس نے مغربی قالب کو اپنا لیا ہے بلکہ اس فکری حملہ کا مقابلہ کرنے کی اہل وہ عورت ہے جو ان روایات قدیم کو جو متحجر ہو چکی ہیں، بے روح اور بے جان ہو چکی ہیں۔ شکست کرنے کی صلاحیت اور ہمت رکھتی ہے۔ یہ روایات جنہیں دین سے منسوب کیا جاتا ہے دراصل ان کا تعلق دین سے نہیں ہے بلکہ یہ علاقائی اور قومی روایات ہیں یہ وہ رجعت پسندانہ رسوم ہیں جو ہماری خواتین کے دل و دماغ (وہاں کی اجتماعی زندگی کے طور طریقوں پر پوری طرح حکمراں ہیں وہ عورت جو ان روایات کے شکنجوں کو توڑ کر اپنی انسانیت کو نئے سرے سے دریافت کر سکتی ہے جو نہ عہد ماضی کی میراث کو گزشتہ لوگوں کے پند و نصائح کو بغیر چون چرا تسلیم کرتی ہے اور نہ جدید طور طریقوں کے فریب میں پھنستی ہے۔ بلکہ مغرب کے نعرۂ آزادی کے پس پردہ اس عورت کے چہرے کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے جو کرب اور وحشت کی علامت ہے یہ ایک ایسی عورت کا کریہہ چہرہ ہے جو معنویت اور انسانیت سے عاری آزادی اور حرمت انسانی سے محروم اور ہر قسم کی حقیقی آزادی سے دور ہے۔

یہی وہ خواتین ہیں جو اس بات کا شعور رکھتی ہیں کہ ہمارے قلب و دماغ پر جن چیزوں کو مسلط کیا جا رہا ہے وہ کہاں سے آ رہی ہیں ان افکار و خیالات کے پیچھے کون سے دماغ کارفرما ہیں ان تبدیلیوں کے پس پردہ کون سے خفیہ ہاتھ کام کر رہے ہیں۔ یہ کیسی اشیاء ہیں جنہیں بازاروں میں بھیجا گیا ہے۔ بے احساس بے شعور، بے درد، بے عقل جن میں کوئی مسئولیت کا احساس نہیں ہے۔ جو انسانیت کے جذبات و احساسات اور شعور سے عاری ہیں۔ یہ خوش نما گڑیا ہیں تر و تازہ اور شائستہ خواتین، مگر ان کی شائستگی کا مقصد اور مطلب کیا ہے۔ یہ سب کو معلوم ہے شائستگی کا یہ تصور، تہذیب و ثقافت کا یہ نعرہ کہاں سے آیا ہے اور کیوں آیا ہے ہماری خواتین پر یہ نیا قالب کیوں اور کس مقصد کے تحت مسلط کیا جا رہا ہے۔

وہ خواتین جو ان حقیقتوں کا شعور رکھتی ہیں۔ ان کے لیے "چگونہ باید شد" یعنی ہم کون ہیں اور ہمیں کیا ہونا چاہیئے کا سوال اہم اور ضروری ہے۔ یہ وہ خواتین ہیں جو نہ اس روایتی قالب میں ڈھلی ہوئی ہیں اور نہ اس (مغربی) قالب میں ڈھلنا پسند کرتی ہیں وہ بے ارادہ اور بغیر اپنی رائے سے انتخاب کئے کسی سانچے میں ڈھلنے پر تیار نہیں ہیں۔ وہ آزادی اور انتخاب کا حق چاہتی ہیں۔ حقیقی آزادی، حقیقی انتخاب۔

ان کو ایک مثالیہ کی تلاش ہے

اور یہ مثالیہ کون ہے؟

(جنابِ فاطمہؑ)

حصہ دوم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فاطمہؑ

جناب فاطمہؑ اسلام کے عظیم پیغمبرؐ کی چوتھی[1] اور سب سے چھوٹی بیٹی تھیں۔ یہ ایک ایسے خانوادہ کی سب سے آخری بیٹی تھیں جس میں کوئی اولاد نرینہ زندہ نہ تھی۔ اور آپؑ کی ولادت عرب کے اس معاشرے میں ہوئی۔ جہاں ہر باپ اور ہر خاندان بیٹے کے لئے آرزومند ہوا کرتا تھا۔

عرب کا قبائلی نظام مادری عہد سے نکل چکا تھا۔ زمانۂ قبل بعثت میں عرب جاہلیت کا معاشرہ پدر سالاری کے دور میں داخل ہو چکا تھا۔ ان کے خدا مذکر تھے جبکہ ان کے نزدیک بت اور فرشتے[2] مونث ہوا کرتے (گویا یہ اللہ کی بیٹیاں تھیں) قبیلہ کا سردار مرد ہوتا تھا۔ کوئی سفید ریش بزرگ۔ گھر کی حاکمیت باپ کے لیے وقف تھی۔ اصل میں ان کے نزدیک تمام مذہب کی بنیاد ان کے آباؤ اجداد کی سنت تھی۔ ان کا ایمان و عقیدہ وہی تھا جو ان کے "آبا" کا ایمان اور عقیدہ تھا۔ اللہ نے جو برگزیدہ پیغمبر بھیجے وہ اسی مذہب "آبا و اجداد" کے خلاف جہاد کرتے رہے۔ مگر عربوں کی قوم پیغمبروں کے انقلابی پیغام کے علی الرغم اپنی روش پر قائم رہی ان کا مذہب سنت آبا کا تحفظ اور اساطیر الاولین کی پیروی رہا یہ تقلیدی اور موروثی مذہب اصل میں پدر پرستی کے جذبہ کا شاخسانہ ہے جبکہ پیغمبروں کی دعوت کی اساس خدا پرستی کا عقیدہ ہے جو ایک انقلابی، خود آگاہانہ اور فکری عقیدہ ہے۔

علاوہ ازیں قبائلی زندگی، خصوصاً صحرا کی بدوی زندگی سخت کٹھن اور دشوار ہوتی ہے قبیلوں کی باہمی رقابت اور مخاصمت اس زندگی کی ایک لازمی

---

[1] مصنف نے تاریخی حوالوں کے انتخاب میں اہل سنن کے منابع کو ترجیح دی ہے مترجم یا ناشر کا مصنف سے ہر معاملہ میں متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

[2] کلام پاک میں خصوصاً سورۂ اسراء کی ۴۰ ویں آیت میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے

حقیقت ہے اس طرح کی زندگی 'دفاع' اور 'حملہ' اور 'معاہدہ اور پیمان' کے اصولوں پر منحصر ہوتی ہے اس زندگی میں بیٹے کی اہمیت بڑی اہم ہے اور بیٹا اپنے خاندان کے لیے طاقت اور عزت کا سبب سمجھا جاتا ہے۔ بیٹے کی یہ اہمیت فائدہ اور احتیاج کے اصول پر منحصر ہوتی ہے مگر معاشرتی تبدیلیوں کے نتیجہ میں جب افادیت (سود) ہی قدر بن جاتی ہے تو پھر بیٹا بجائے خود عزت وقار، عظمت اور دیگر اخلاقی اور معنوی خوبیوں کا مظہر اور اجتماعی زندگی میں عظمت اور طاقت کا نشان بن جاتا ہے اور اس پس منظر میں لڑکی ہونا حقارت کی بات سمجھا جاتا ہے۔ لڑکی کے فطری ضعف کو اس کی ذلت کا سبب بنا دیا جاتا ہے اور اس ذلت کے نتیجہ میں اس کی حیثیت غلام اور کنیز کی سی ہو جاتی ہے اس غلامی کی وجہ سے اس کی انسانیت مجروح ہوتی ہے اس کے اندر جو انسانی جوہر ہے وہ ماند پڑ جاتا ہے اور بالآخر وہ ایک ایسی مخلوق بن جاتی ہے جو مرد کی ملکیت ہے۔ ننگ پدر ہے۔ مردوں کی ہوس کا کھلونا ہے اسی لیے اس کا وجود جاہلیت عرب میں مردوں کی عزت کا سوال بن گیا تھا کہ ان کے نزدیک خاندان کی عزت اور وقار کی خاطر لڑکیوں کو کم سنی ہی میں زندہ دفن کر دینا ایک مستحسن روایت تھی مشہور شاعر فردوسی نے شاہنامہ میں ایک شعر لکھا ہے

زن و اژدہا ہر دو در خاک بہ   جہاں پاک ازیں ہر دو ناپاک بہ

اس شعر میں عورت اور اژدہے کو ایک ہی سطح پر دیکھا گیا ہے مگر یہ انداز نظر فردوسی تک محدود نہیں ہے بلکہ فردوسی کی فکر کا ماخذ تو عرب کے شاعر کے اشعار معلوم ہوتے ہیں۔ ان اشعار کا مفہوم یہ ہے کہ ہر وہ باپ جس کے کوئی بیٹی ہے جب کبھی اپنے داماد کے متعلق سوچتا ہے تو اس کے سامنے تین باتیں آتی ہیں اس کے نزدیک ایک داماد تو گھر ہے جہاں اس کی بیٹی سر چھپائے رکھتی ہے دوسرا داماد اس کی بیٹی کا شوہر ہے جو اس کی حفاظت اور دیکھ بھال کا فریضہ انجام دیتا ہے اور داماد کی تیسری شکل قبر ہے جو اسے پوری

طرح چھپا لیتی ہے اور تینوں میں سب سے زیادہ بہتر یہی قبر ہے۔

یہ مقولہ کہ قبر ہی سب سے بہتر داماد ہے تمام مردانِ جاہلیت پسند کے نزدیک ایک سنہرا اصول ہے۔ ہر باپ اور ہر بھائی اپنے خاندان کی جھوٹی حمیت اور عزت کی خاطر اور اپنے ننگ و نام کے تحفظ کے لیے لڑکی کی موت کی آرزو یا انتظار میں رہتے ہیں تاکہ اس سے قبل کہ ان کی بیٹی یا بہن کے لیے کوئی اور خواستگاری کرے وہ خود اس کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتار دیں اس لیے کہ ان کے نزدیک عورت کا بہترین بر یہی قبر ہے وہ قبر کو اپنا بہترین داماد سمجھتے ہیں اسی لیے شاعر اپنی بیٹی کے لیے بہترین رشتہ قبر کو سمجھتا ہے اور یہی وہ رویہ ہے کہ جس کے تحت فارسی شاعر "زن و اژدہا ہر دو درخاک بہ" کہتا ہے اور یہی وہ انداز نظر ہے جس کی رو سے یہ کہا جاتا ہے کہ "دفن البنات من المکرمات" یعنی لڑکیوں کو قبر میں دفن کرنا خاندانی عزت کے تحفظ کا ذریعہ ہے۔

جاہلیت عرب کا عورتوں کے متعلق یہی وحشی رویہ تھا جس کا کلام پاک میں سرزنش آمیز اور موثر لہجہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ کلام پاک میں اس کیفیت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے کہ جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی پیدائش کی خبر سنائی جاتی ہے تو غم و غصے کی زیادتی سے اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے۔

ایک اہم نقطہ جس کی طرف ڈاکٹر عائشہ عبد الرحمٰن "بنت الشاطی" نے قرآن کے حوالے سے توجہ دلائی ہے یہ ہے کہ لڑکیوں کی طرف نفرت اور ناپسندیدگی کے رویہ کی جڑ اصل میں اقتصادی مسئلہ ہے۔ عرب جاہلیت کا معاشرہ فقر و نا داری کے خوف سے لڑکیوں کو ناپسند کرتا تھا اور انہیں ایک بوجھ سمجھتا تھا اور یہی وہ بنیادی اقتصادی مسئلہ تھا جس نے وقت اور ماحول کے اعتبار سے بہت سی تعبیرات اختیار کر لیں۔ آج بہت سے ماہرین عمرانیات اور سماجیات اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ عورت اور مرد کے مسئلہ کا بہت سے عقائد، جذبات، اور احساسات جن کا تعلق اخلاق اور روحانیت سے ہے۔ اقدار معنوی کی بحثیں اور یہ انداز نظر

کہ بیٹا فضیلت و شرافت و افتخار کی علامت ہے جبکہ بیٹی ذلت اور خواری کی علامت ہے اس کے ساتھ ہی مستقبل کے اندیشوں اور خوف کے تحت لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کی مذموم رسم اور اس رسم کی یہ توجیہ کہ لڑکی بڑے ہو کر خاندان کی ذلت اور رسوائی کا سبب بن سکتی ہے ممکن ہے کہ وہ کسی جنگ کے نتیجہ میں قید ہو کر غیر لوگوں کی کنیز بنائی جائے یا وہ کسی ناموزوں مرد کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جائے یہ اور اسی قسم کی دیگر تمام باتیں، بحثیں اور نظریات ثانوی اور ظاہری باتیں ہیں۔ عورت کی طرف حقارت اور ذلت کے رویہ کا اصل سبب اقتصادی مسئلہ ہے

جیسا کہ ہم اس سے قبل اشارہ کر چکے ہیں کہ قبائلی نظام زندگی سخت حوادث اور مقابلہ سے عبارت ہوتا ہے اور لوگوں کو اپنی روٹی حاصل کرنے کے لیے سخت جدوجہد کرنی پڑتی ہے اس کے ساتھ ہی مختلف قبیلوں کے درمیان باہمی رقابت اور مقابلہ کا ایک مسلسل سلسلہ جاری رہتا ہے۔ (خصوصاً عرب کی قبائلی معاشرت پر یہ باتیں بہت زیادہ صادق آتی ہیں) اس معاشرتی پس منظر میں بیٹا سماجی اقتصادی اور دفاعی ہر اعتبار سے خاندان یا قبیلہ کی ناگزیر ضرورت ٹھہرتا ہے۔ بیٹا روٹی فراہم کرتا ہے جبکہ بیٹی گھر میں بیٹھ کر روٹی کھاتی ہے اس کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکے اور لڑکی کے درمیان جنس کا اختلاف طبقاتی اختلاف میں بدل جاتا ہے مرد مالک اور حاکم طبقہ بنا لیتے ہیں اور عورت محکوم اور مملوک طبقہ ہو جاتی ہے عورت اور مرد ایک دوسرے کے ساتھی نہیں رہتے بلکہ انمیں آقا اور غلام کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے اس اقتصادی تقسیم کے لحاظ سے انسانوں کی ان دونوں انواع میں اختلاف محض جنس کا اختلاف نہیں رہتا بلکہ یہ دو الگ الگ طبقہ بن جاتے ہیں۔ مرد چونکہ اقتصادی لحاظ سے طاقتور اور حاکم ہوتا ہے اس اعتبار سے تمام خوبیاں، اچھائیاں اور بزرگیاں اس کے حصہ میں آتی ہیں جبکہ عورت حقارت ضعف پستی اور ذلت کی نشانی بن جاتی ہے۔ مرد اور عورت کے مختلف طبقات کے لیے اجتماعی اقدار بھی الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ مرد اقتصادی برتری کی وجہ

سے فضیلت اور عورت اقتصادی پستی کے سبب سے ذلت کی مستحق سمجھی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ دختر کی ولادت یا کسی کا صاحب دختر ہونا بے عزتی اور شرم کی بات سمجھا جاتا تھا اور لڑکی کو خاندان کی بے عزتی اور بے آبروئی کا سبب گردانا جاتا تھا اس لیے کہ لڑکی کے باپ کو ہمیشہ یہ اندیشہ رہتا تھا کہیں وہ کسی ایسے شخص سے شادی نہ کرلے۔ جو نسلی یا اقتصادی اعتبار سے اس کا ہم شان یا ہم کفو نہ ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ خوف و اندیشہ جو بظاہر ایک اخلاقی مسئلہ نظر آتا ہے درحقیقت اقتصادی مسئلہ سے پیدا ہوتا ہے۔ قبائلی نظام میں حفظ ملکیت اور دولت کی مرکزیت کا تصور ایک زبردست اقتصادی قدر کی حیثیت رکھتا ہے اسی اقتصادی قدر کے نتیجہ میں پدرسالاری نظام میں باپ کی تمام میراث سب سے بڑے بیٹے کو ملتی ہے تاکہ خاندانی دولت اکٹھی رہے اس وراثت میں ہر چیز یہاں تک کہ وہ خواتین جو باپ کے تصرف میں تھیں شامل ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ بیٹیوں کو میراث سے محروم کردیا جائے تاکہ باپ کی دولت اس کی موت کے بعد تقسیم نہ ہوسکے اس کے سبب سے ایک خاندان کی عورتیں دوسرے خاندان میں بیاہی نہیں جاتیں یہ رسم آج بھی جاری ہے قدامت پسند خاندانوں میں اب تک اس بات پر اصرار کیا جاتا ہے کہ لڑکیوں کے رشتہ اپنے خاندان سے باہر نہ کئے جائیں ہمارے لوگ اب بھی یہ کہتے ہیں کہ عم زادوں کا عقد آسمان پر ہو جاتا ہے اس لیے زمین پر بھی لڑکیوں کے رشتہ ان کے چچا کے بیٹوں کے ساتھ ہی ہونا ضروری ہیں تاکہ لڑکیاں اپنی میراث خاندان سے باہر نہ لے جاسکیں اور خاندان کی دولت خاندان ہی میں رہے۔

تاریخ مذاہب کے مورخان قدیم اور جدید محققین لڑکیوں کے زندہ درگور کرنے کے بارے میں مختلف توجیہات پیش کرتے ہیں جیسے کہ ننگ و نام کا خوف یا اس بات کا اندیشہ کہ لڑکی کسی نامناسب اور ناموزوں شخص سے رشتۂ ازدواج میں منسلک نہ ہو جائے بعض مستشرقین نے یہ رائے بھی ظاہر کی ہے کہ عربوں میں دختر کشی کی رسم قدیم مذاہب میں دیوی یا دیوتا کے حضور لڑکیوں کی قربانی

کے عقیدہ کا تسلسل ہے لیکن قرآن نے نہایت صاف اور صریح لہجہ میں اس بات کی وضاحت یہ کہہ کر کر دی ہے کہ یہ تنگدستی کے خوف سے اپنی لڑکیوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ یعنی اصل سبب اقتصادی ہے نہ کہ اعتقادی اور اخلاقی۔ بقیہ جتنی باتیں اس بارے میں کہہ دی جاتی ہیں ان کی حیثیت زبانی جمع خرچ کی سی ہے ان باتوں میں کوئی جان نہیں ہے۔

میری نظر میں قرآن نے اقتصادی عامل کی نشاندہی کر کے نہ صرف اس مسئلہ کے اصل سبب اور محرک کو واضح کر دیا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی تحقیر اور سرزنش اور رسوائی کا سامان بھی فراہم کر دیا ہے جو اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کرنے کے مذموم فعل کی توجیہ کے لیے اخلاقی توجیہات پیش کرتے ہیں اور اسے اپنے ننگ و ناموس کے مسئلہ کا روپ دیتے ہیں حالانکہ ان کے اس ظالمانہ اور غیر انسانی عمل کا واحد سبب ان کا غربت اور تنگدستی کا خوف اور مال و دولت کی لالچ اور محبت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ قرآن کی آیات ان تمام فریب کے پردوں کو چاک کر کے جنہیں شرافت، حمیت، عزت اور ناموس کا نام دیا گیا ہے ایسے تمام پست فطرت اور کینہ انسانوں کے مکروہ چہروں کو بے نقاب کرتا ہے۔ اس ضمن میں دو آیتوں میں صریحی تنبیہ موجود ہے

"اور اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کیا کرو۔ ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور انہیں بھی رزق عطا کرتے ہیں" ۱

" اور اپنی اولاد کو افلاس کے ڈر سے قتل مت کرو۔ ہم ہی انہیں رزق عطا کرتے ہیں اور تم کو بھی رزق دیتے ہیں۔ بے شک ان کو قتل کرنا بہت بڑے گناہ کی بات ہے" ۲

۱۔ سورۃ انعام۔ آیت ۱۵۱

۲۔ سورۃ اسراء۔ آیت ۳۱

اس بارے میں میرے نزدیک سب سے زیادہ قابل غور بات یہ ہے کہ قرآن بار بار اور بہ اصرار و تاکید اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ ہم تمہیں بھی اور تمہارے بچوں کو بھی روزی فراہم کرتے ہیں. پس انہیں احتیاج اور تنگدستی کے خوف سے قتل نہ کرو۔ قرآن کا یہ اعلان اولاً اس حادثۂ ناپسندیدہ کے اصلی سبب کی نشاندہی کرتا ہے اور ثانیاً ان تمام توجیہات کی نفی کرتا ہے جن کے ذریعے اس مذموم عمل کی اخلاقی توجیہ کر کے اسے جاہلیت عرب کی عزت اور حمیت کے نتیجہ کے بطور پیش کیا جاتا ہے. قرآن اس جھوٹ کا اور فریب کا پردہ چاک کر کے یہ صاف اور صریح اعلان کرتا ہے کہ اس قضیہ کا سو فیصد سبب اقتصادی ہے اور یہ مال و دولت کی حرص اور تنگدستی کے خوف کا نتیجہ ہے اس قرآنی تصریح سے قبل عام طور پر لوگ اس واقعیت کے اصل سبب سے ناواقف تھے. محروم اور کمزور طبقہ کے علاوہ ہر جگہ اسے عمومی اور عوامی وجدان و احساس کا ردِ عمل اور حمیت و شرافت خاندان کے تحفظ کی علامت اور ایک ہمت اور مردانگی کا کام سمجھا جاتا تھا کیونکہ عرب کے قبائلی نظام میں عام طور پر تمام انسانی فضیلت اور شرف بیٹے کے ساتھ مخصوص کر دیئے گئے تھے اور بیٹیوں کو تمام انسانی اقدار سے تہی اور محروم سمجھا جاتا تھا.

بیٹا نہ صرف یہ کہ کسب دولت کے عمل میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا ہے. نہ صرف یہ کہ اپنے خاندان کا محافظ اور قبیلوں کی باہمی جنگ میں اپنے خاندان اور قبیلہ کے لیے باعث طاقت و افتخار ہے بلکہ تمام خاندانی، آبائی اور نسلی افتخارات اور امتیازات کا وارث بھی وہی ہے اس کے ذریعہ خاندان کی اجتماعیت قائم رہتی ہے وہی خاندان کے اجتماعی وجود کو تسلسل بخشتا ہے اور اسی کے ذریعے خاندان کی عزت اور وقار برقرار رہتا ہے. یہ بیٹا ہی ہے جو خاندان کے نام کو اونچا کرتا ہے اور اپنے باپ کے انتقال کے بعد اپنے خاندان کے چراغ کو روشن رکھتا ہے۔

اور بیٹی۔ وہ بیچاری ایک ذیلی اور طفیلی وجود ہے اس کی حیثیت اثاثہ جائداد کی سی ہے شادی کے بعد یہ اثاثہ شوہر کے گھر میں منتقل کر دیا جاتا ہے وہاں اس کا وجود ہی تحلیل ہو جاتا ہے۔ اس کا وجود اس طرح گم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنا نام تک برقرار نہیں رکھ سکتی اس کا خاندانی نام تبدیل ہو جاتا ہے جہاں تک اس کی اولاد کا تعلق ہے تو ان کا نام ان کی شناخت اور ان کے تمام روابط اپنے باپ کے خاندان سے متعلق ہوتے ہیں بیچاری ماں کا ان سے کوئی تعلق پہچانا نہیں جاتا۔ اس صورتِ حال میں تمام مادی طاقت دولت، اور اجتماعی فضیلت کا حقدار صرف بیٹا ہوتا ہے۔ جو پدری نظام میں اپنے باپ کا دست و بازو بن کر اپنے خاندان کی دولت، عزّت، طاقت، کو بڑھانے اور اجتماعی زندگی میں اپنے خاندان کا نام اونچا کرنے کا فریضہ انجام دیتا ہے اور اپنے باپ کے بعد اپنے خاندان کی اجتماعی اور معنوی زندگی کے لقا، اور تسلسل کی علامت سمجھا جاتا ہے اس کے برعکس لڑکی ہیچ، لیوچ، بے وقعت، بے قیمت بلکہ خاندان پر بوجھ کی حیثیت رکھتی ہے وہ ایک ضعیف اور کمزور وجود ہے جو خاندان کی حفاظت اور حمایت کی محتاج ہے وہ مردوں کی مہم جوئی اور جنگی حوصلوں کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے جس طرح کسی پرندے کے پاؤں میں بھاری پتھر باندھ کر اس کی پرواز میں رکاوٹ پیدا کر دی جائے اسی طرح عورتیں ہنگام جنگ مردوں کے حوصلہ جنگ اور ان کی پیش قدمی کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہیں جب بھی کوئی شخص دشمنوں کی صفوں، اس کے خیموں، اس کے قلعوں پر بڑھ بڑھ کر حملہ کرنا چاہتا ہے اس کے جوشِ شجاعت میں یہ خیال مانع آجاتا ہے کہ کہیں اس کے خاندان یا قبیلہ کی عورتیں دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو کر پورے قبیلہ کے لیے ذلت و رسوائی کا سبب نہ بن جائیں اسے ہمیشہ یہ خیال ستاتا ہے کہ ہنگام جنگ اس کی ذرا سی غفلت اور چوک کے نتیجہ میں اس کے قبیلہ کی عورتیں کہیں دشمن کے ہاتھوں گرفتار نہ ہو جائیں کیونکہ اگر ایسا ہوا تو اس کا قبیلہ ہمیشہ کے لیے طنز و ملامت کا نشانہ بن جائے گا۔ اس خوف اور اندیشے سے اسکی ہمت

اور جرأت اور اس کا جوش جنگ متاثر ہو جاتا ہے اسی طرح زمانہ صلح میں خاندان کے عزت مند مردوں کا دل اس خوف سے لرزتا رہتا ہے کہ کہیں خاندان کی کسی عورت کا طرز عمل انکے لیے خجالت اور بے عزتی کا سبب نہ بنے اس تمام مشقت، رنج، تکلیف اور زحمت کے بعد جس لڑکی کی پرورش کی جاتی ہے وہ آخرکار دوسروں کے حوالے کر دی جاتی ہے (ازدواج کی صورت میں) وہ ایک ایسا درخت ہے جس کے میوے دوسروں کے کام آتے ہیں۔

اس پس منظر میں منطقی طور پر بہترین حل یہی ہے کہ جیسے ہی کسی ماں کی آغوش بیٹی سے آباد ہو۔ بیٹی کو ماں کے گود سے چھین کر آغوش مرگ کے حوالے کر دیا جائے اس کو بچپن ہی میں بیاہ دیا جائے اس کے لیے شروع ہی میں داماد تلاش کر لیا جائے اور یہ داماد، بہترین داماد قبر کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

عرب میں ایسے شخص کو جو اولاد نرینہ سے محروم ہو ابتر کہا جاتا ہے ابتر یعنی دم بریدہ جس کی نسل منقطع ہو گئی ہو جو عقیم ہو یا بانجھ ہو۔ اس کے برعکس لفظ کوثر کے معنی ہیں خیر و برکت کی کثرت، فراوانی اور تسلسل اس کے معنوں میں اولاد اور ذریت کی کثرت کا رخ بھی ہے لوگ کہ رہے تھے کہ رسولؐ (معاذ اللہ) ابتر ہیں اس کے جواب میں اللہ نے اپنے محبوب پیغمبرؐ کو کوثر یعنی ذریت اور اولاد کی کثرت کی بشارت دی ہے

ایسے ماحول اور ایسے زمانہ میں دست تقدیر پس پردۂ غیب کارفرما ہو کر تمام اقدار میں انقلاب برپا کرنے والا تھا۔ ہر چیز بدلنے والی تھی۔ تقدیر کا نادیدہ ہاتھ ہر شے کو درہم برہم کر رہا تھا تا کہ اقدار حیات کی اس جھیل میں جس کا پانی ساکت اور بدبودار ہو چکا تھا ایک انقلابی طوفان برپا کر دیا جائے ایک مثبت زندگی بخش اور انسانیت نواز طوفان، ناگہاں اس ساکت اور متعفن جھیل سے ایک شفاف اور متحرک چشمہ ابل پڑتا ہے۔ زندگی اور اس کی قدروں میں ایک انقلابی تبدیلی رونما

ہوتی ہے یہ انقلاب نہایت خوش گوار ہے مگر اس کے ساتھ ہی نہایت دشوار بھی ہے اور اس خوش گوار مگر دشوار انقلاب کے لیے قدرت نے دو عظیم شخصیتوں کا انتخاب کیا ہے۔ ایک باپ اور ایک بیٹی۔

اس انقلابِ عظیم کا بارِ سنگین باپ یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شانوں پر ہے۔ لیکن انقلابی اقدار کی نمود و افزائش کی ذمہ داری بیٹی یعنی حضرت فاطمہؑ پر ہے۔

نمودِ انقلاب

قریش عرب کا سب سے بڑا قبیلہ ہے اسے دینی اور دنیوی دونوں اعتبار سے بزرگی حاصل ہے درا صل قبیلۂ قریش اپنی قوم کی شرافت اور بزرگی کی نشانی ہے اس قبیلہ نے اپنے تمام افتخارات کو دو خاندانوں یعنی بنی ہاشم اور بنی امیہ میں تقسیم کر دیا ہے۔ بنی امیہ دولت کے اعتبار سے آگے ہیں مگر بنی ہاشم کی وجاہت اور وقار بنی امیہ سے زیادہ ہے اس لیے کہ کعبہ کے امور کی نگہبانی ان کے پاس ہے اور عبدالمطلبؑ جو شیخ قریش ہیں ان کا تعلق بنی ہاشم سے ہے مگر عبدالمطلبؑ کی وفات سے بنی ہاشم کی کیفیت پہلے جیسی نہ رہی۔ ابو طالبؑ کو اپنے والد جیسا اثر و نفوذ اور طاقت حاصل نہیں ہے ان کی تجارت بھی کمزور ہو گئی ہے اور انہوں نے مالی مشکلات کے پیشِ نظر اپنے فرزندوں کو اپنے اعزا کی کفالت میں دیدیا بنی امیہ اور بنی ہاشم کی باہمی رقابت میں شدت آ گئی ہے اور بنی امیہ کی کوشش ہے کہ وہ قبیلۂ قریش کے مناصب اور امتیازات پر قابض ہو جائیں اور بنی ہاشم کو جو روحانی اور معنوی برتری حاصل ہے وہ بھی ان سے چھین لیں بنی ہاشم میں اگر کسی گھر کو وقار اور اعتبار حاصل ہے تو وہ خانوادۂ محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم ہے آپ حضرت عبدالمطلبؑ کے پوتے ہیں۔ جناب خدیجہؑ سے جو عرب کی صاحب دولت و حیثیت خاتون ہیں، عقد کے نتیجے میں آپؐ کی سماجی حیثیت بہت نمایاں ہو گئی ہے

خود محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت بڑی مضبوط اور مستحکم ہے لوگوں میں آپ کی ایمانداری اور دیانت کا شہرہ ہے۔ خاص طور پر بنی ہاشم اور رجال قریش میں آپؐ کی شخصیت بڑی معزز اور محترم سمجھی جاتی ہے آپؐ کو عبد مناف کے عز و شرف کا آئینہ، بنی ہاشم کی عظمت کی علامت اور بالخصوص عبد المطلبؑ کی حیثیت کے احیاء کنندہ کے بطور دیکھا جاتا ہے اس لیے کہ حمزہ ایک ایسے جوان ہیں جن کی حیثیت ایک پہلوان کی ہے، ابولہب مرد بے اعتبار ہے عباس صاحبِ دولت ہیں مگر ان کی شخصیت مستحکم نہیں ہے ابوطالبؑ کی شخصیت مضبوط ہے مگر ان کی مالی حالت کمزور ہے یہ صرف محمدؐ ہیں کہ جو عہد شباب کی منزلوں میں ہیں۔ جن کی اپنی ایک بھرپور اور محترم شخصیت ہے اور ان کی رفیق حیات بھی ایک شخصیت اور حیثیت کی مالک ہے اور وہ صاحبِ ثروت بھی ہے شجرۂ بنی ہاشم کی عظمت اور اس کی بزرگی اب اسی گھرانہ پر منحصر ہے۔ یہی گھر ہے جس کی وجہ سے مکہ میں بنی ہاشم کی ساکھ قائم ہے۔

سب اس انتظار میں ہیں کہ یہ گھر اولاد نرینہ کی خوشبو سے مہکے تاکہ خاندانِ عبد المطلبؑ اور خانوادۂ محمدؐ کی طاقت اور اعتبار کا سبب بنے مگر اس گھر میں جو اولاد ہوئی ہے اس کی صورت یہ ہے۔

سب سے پہلی ایک لڑکی پیدا ہوئی ـــ زینب۔

حالانکہ تمام خاندان کو بیٹے کی آرزو اور انتظار تھا

دوسری اولاد بھی لڑکی ہی ہے ـــ رقیہ

لڑکے کی آرزو شدید ہوگئی اور سب لوگ اس امید میں رہے کہ اب کی بار لڑکا ہوگا۔

تیسری بار پھر لڑکی پیدا ہوئی ـــ ام کلثوم

اس کے بعد دو لڑکے پیدا ہوئے۔ قاسم اور عبد اللہ۔ ان کی ولادت سے خاندان میں خوشی کی زبردست لہر دوڑ گئی۔ مگر یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی دونوں

لڑکے کم سنی میں انتقال کر گئے اور اب اس گھر میں تین بچے ہیں اور تینوں لڑکیاں ہیں۔

ماں ضعیف ہو چکی ہے اس کا سن ساٹھ سال سے تجاوز کر گیا ہے اور باپ اگرچہ کہ بیٹیوں کو بہت عزیز رکھتا ہے مگر اپنی قوم کے جذبات اور اپنے اہل خاندان کے احساسات میں شریک ہے۔

کیا خدیجہؓ جو اپنی عمر کی آخری منزلوں سے نزدیک ہیں کسی اور بچے کی ماں بن سکیں گی۔ امکانات بہت کم ہیں، مگر اس گھر میں ایک بار پھر امید اور آرزو کی لہر بہا بھی پیدا کر دیتی ہے۔ لوگوں کا اضطراب اپنے نکتہ عروج پر ہے یہ خاندان عبدالمطلبؑ کے لیے آخری موقع ہے۔ یہ آخری امید ہے۔

مگر اس بار پھر بیٹی پیدا ہوتی ہے

اس کا نام فاطمہؑ رکھا گیا ہے۔

خوشی اور امید خاندان بنی ہاشم سے بنی امیہ میں منتقل ہو گئی۔ دشمن بہت خوش ہے لوگ طرح طرح کی باتیں بنا رہے ہیں ہر طرف یہی چرچا ہے کہ "محمدؐ ابتر ہیں" وہ اپنے خاندان کی آخری شخصیت ہیں، ان کا گھرانہ صرف چار بیٹیوں پر مشتمل ہے اور بس (کوئی اولاد نرینہ نہیں ہے)

کیا کہا جائے کہ تقدیر نے یہ کیسے خوبصورت کھیل کا آغاز کیا ہے زندگی گذر رہی ہے اور محمدؐ خود اپنی رسالت کے برپا کردہ انقلاب کے طوفان میں ہمہ تن گھرے ہوئے ہیں ان پر رسالت کی عظیم ذمہ داریاں ہیں۔ پھر وہ فاتح مکہ کی حیثیت حاصل کر لیتے ہیں اور اپنی رحمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے تمام دشمنوں کو طلقاء قرار دیتے ہیں (طلقاء یعنی آزاد کردہ) تمام قبائل ان کے زیر فرمان ہیں تمام جزیرہ عرب ان کے زیر نگین ان کی شمشیر نے آمر اور جابر حکمرانوں کو لہولہان کر دیا ہے ان کی آواز زمین سے آسمان تک گونج رہی ہے۔ ان کے ایک ہاتھ میں طاقت ہے اور دوسرے ہاتھ میں نبوت اور وہ عزت و افتخار کی

اس بلندی پر ہیں کہ جو بنی امیہ یا بنی ہاشم یا عرب یا عجم کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ محمدؐ پیغمبر ہیں۔ مدینہ میں ان کا مرکز ہے اور وہ شکوہ واقتدار وعظمت کے اس نکتہ کمال پر ہیں جس کا تصور بھی محال ہے کوئی دوسرا انسان اس عظمت اور بزرگی کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ یہ وہ شجر مبارکہ ہے جس کا تعلق عبد مناف، بنی ہاشم یا عبدالمطلب سے نہیں ہے بلکہ یہ شجر نور ہے۔ یہ وہ درخت ہے جو نور سے اگا ہے۔ اس کی نمود غار حرا میں ہوئی ہے۔ اس کا نور صحرا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک بلکہ افق سے افق تک تمام روئے زمین پر چھایا ہوا ہے بلکہ یہ نور وقت کی تمام طوالت پر محیط ہے یہ تمام آنے والے زمانوں کو انتہائے تاریخ تک وقت کے تمام ادوار کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے۔

مگر اس عظیم انسان کا خاندان صرف چار بیٹیوں پر مشتمل ہے

اور ان میں سے بھی تین بیٹیاں خود اس کی رحلت سے قبل انتقال کرگئیں

اب اس کی کل بضاعت صرف ایک بیٹی ہے سب سے چھوٹی بیٹی۔ فاطمہؑ

فاطمہؑ

فاطمہؑ تنہا وارث ہیں اپنے خاندان کے تمام افتخارات کی۔ اس تمام بزرگی اور عزت و شرف کی جس کی بنیاد خاک و خون یا دولت نہیں ہے بلکہ جو آفریدۂ وحی ہے یہ وہ وراثت ہے جس کا تصور قرآن نے پیش کیا ہے اس کا تعلق رنگ و نسل یا مال و دولت سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق اس انقلابی پیغام سے ہے جو ایمان و جہاد اور تبدیلی فکر و نظر کا پیغام ہے اس پیغام نے زندگی کی قدریں بدل دی ہیں مادیت کی پستی کو روحانیت کی بلندی سے تبدیل کر دیا ہے اب محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شخصیت صرف بنی عبدالمطلب یا عبدمناف تک محدود نہیں ہے اب ان کا تعلق محض قریش یا عرب سے نہیں ہے بلکہ اب وہ ان سطحوں سے بہت بلند ہو چکے ہیں۔ وہ تاریخ انسانیت میں ایک علامت ہیں وہ تمام انسانیت اور انسانیت

کی بلند اقدار کے وارث ہیں وہ وارث ابراہیمؑ ہیں۔ وارث نوحؑ و موسیٰؑ و عیسیٰؑ ہیں اور اس عظیم وراثت کی تنہا وارث ان کی بیٹی فاطمہؑ ہے

انا اعطینٰک الکوثر ....

اے ہمارے حبیبؐ ہم نے تجھے کوثر عطا کیا ہے۔ پس اپنے پروردگار کی نماز ادا کر اور قربانی دے۔ بے شک تیرا دشمن ابتر ہے۔

ہاں دشمن رسولؐ ابتر ہے اپنے دس بیٹوں کے باوجود ابتر اور دم بریدہ ہے اس کی نسل منقطع کر دی گئی ہے اللہ نے اپنے حبیبؐ کو کوثر عطا کیا ہے۔ اسے فاطمہؑ جیسی بیٹی سے نوازا ہے اس طرح دنیا میں ایک عظیم فکری اور روحانی انقلاب کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

اب اپنے باپ کی عظیم انقلابی وراثت کی تنہا وارث ایک بیٹی ہے۔ یہ بیٹی اپنے خاندان کے تمام عز و شرف کی وارث ہے اسی کے ذریعے اس عظیم خاندان کا تسلسل جاری ہے جس کا سلسلہ حضرت آدمؑ سے شروع ہوتا ہے اور جو انسانی حریت، عظمت اور آزادی کے تمام عظیم رہبروں کے سلسلہ سے گذرتا ہوا حضرت ابراہیمؑ تک پہنچتا ہے اور پھر حضرت ابراہیمؑ کی عظیم شخصیت کے بعد حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کو خود میں شریک کرتے ہوئے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) تک آتا ہے۔ یہ انسانیت کا خاندان ہے۔ یہ انسانی عز و شرف، حرمت اور عظمت کا خاندان ہے یہ عدل الٰہی کی زنجیر ہے۔ یہ سچائی اور حقیقت کا شجرہ ہے اور اس زنجیر کی آخری کڑی فاطمہؑ ہیں۔

فاطمہؑ جو اس خاندان کی سب سے آخری اولاد (بیٹی) ہیں جو خاندان بیٹے کا منتظر تھا۔

محمدؐ خوب جانتے ہیں کہ کاتب تقدیر نے ان کے لیے کیا مقدر کیا ہے

اور فاطمہ بھی اپنی عظمت اور اپنی ذمہ داریوں سے پوری طرح باخبر ہیں

ہاں اس مکتب فکر میں اسی طرح کا فکری انقلاب رونما ہوتا ہے

اس مذہب میں عورت کو اسی طرح آزادی اور حرمت عطا کی جاتی ہے

کیا یہ مذہب، مذہب ابراہیمؑ نہیں ہے اور کیا یہ دونوں باپ اور بیٹی وارثان ابراہیم نہیں ہیں۔

کسی انسان کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ مسجد کے اندر دفن ہو سکے روئے زمین کی تمام مساجد میں سب سے افضل مسجد الحرام ہے۔ خانۂ کعبہ جو خدا کا گھر ہے جو خدا کا حرم بھی ہے اور حریم بھی جس کی طرف رخ کر کے سجدے کئے جاتے ہیں یہ تمام نمازیوں کا قبلہ ہے یہ وہ گھر ہے جسے خدا کے حکم پر بنایا گیا اور جس کے بنانے والے حضرت ابراہیمؑ جیسے برگزیدہ پیغمبر تھے۔ یہ وہ گھر ہے کہ جسے بتوں سے پاک کرنے اور مشرکوں کے تسلط سے آزاد کرنے کی عظیم ذمہ داری پیغمبرؐ اسلام کے سپرد ہوئی اور فتح مکہ ان جنابؐ کا کارنامہ سمجھا جاتا ہے اس فتح کے نتیجہ میں کعبہ یعنی خانۂ آزاد صحیح معنوں میں طواف اور سجدہ کے لیے آزاد ہو سکا تاریخ میں جو بزرگ پیغمبر گذرے ہیں سبھی اس گھر کے خدمت گذار رہے اس کے باوجود کسی پیغمبر کو یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ خانہ کعبہ میں دفن ہو سکے ابراہیمؑ اس گھر کے بانی ہیں لیکن ان کا مدفن یہاں نہیں ہے اور پیغمبرؐ اسلام اس گھر کے آزاد کنندہ ہیں اس کو بتوں کے تسلط سے آزاد کرانے والے ہیں لیکن ان کا مدفن بھی یہاں نہیں ہے تمام انسانی تاریخ میں یہ شرف صرف ایک ہستی کو حاصل ہو سکا خدائے اسلام نے تمام نوع بشر میں صرف ایک ایسی ہستی کو چنا جو خاص اس کے گھر یعنی کعبہ میں دفن ہو سکے۔

اور یہ ہستی کس کی ہے؟ کون ہے؟

ایک عورت، ایک کنیز یعنی جناب حاجرہؑ

خدا نے ابراہیمؑ کو یہی حکم دیا کہ انسانوں کی سب سے بڑی عبادت گاہ کعبہ حاجرہؑ کے گھر سے متصل بنایا جائے تاکہ بشریت ہمیشہ خانۂ کعبہ کے طواف کے ساتھ ساتھ بیت حاجرہ کے گرد بھی طواف کرے۔

خدائے ابراہیمؑ نے تمام انسانیت میں اپنے گمنام سپاہی کے طور پر ایک عورت کا انتخاب کیا۔ ایک عورت جو ایک کنیز تھی یعنی جو دنیا کے مروجہ معیار کے مطابق ہر عزت اور شرف سے محروم تھی۔

ہاں بے شک اس مکتبِ فکر میں ایسا فکری انقلاب رونما ہوا

اور اس مذہب میں عورت کو اس قدر آزادی اور عزت عطا کی گئی

عورت کا مقام کس قدر بلند کیا گیا

اب خدائے ابراہیمؑ نے فاطمہؑ کا انتخاب کیا ہے۔

فاطمہؑ کے توسط سے وہ فکری انقلاب برپا ہوا کہ اب بیٹے کی جگہ بیٹی اپنے خاندان کی عزت و بزرگی کی وارث قرار پائی اب اپنے خاندان کی تمام قدروں کا تحفظ کرنے والی اور اپنے آباؤ اجداد کے نام کو دوام بخشنے والی ہستی بیٹی ہے۔ یہ بیٹی ہی ہے جس کے ذریعہ شجرہ آگے بڑھے گا نسل کو دوام حاصل ہوگا۔

فاطمہؑ پیغمبرؐ کے کام اور ان کے نام کی وارث ہیں اپنے باپ کی نسلی اور فکری وراثت کا بار اٹھائے ہوئے ہیں۔

اور یہ اس معاشرے کی بات ہے جس میں لڑکی ہونا ایک جرم تھا اور اس جرم کی سزا یہ تھی کہ اسے زندہ درگور کر دیا جائے۔ یہ اس ماحول کی بات ہے جب باپ بیٹی کو باعثِ ننگ سمجھتا تھا اور اس کے نزدیک بہترین داماد قبر ہوتی تھی۔

پیغمبرؐ اس بات سے آگاہ ہیں کہ قدرت نے ان کو کسی عظیم انقلاب کا مظہر بنایا ہے۔

اور فاطمہؑ بھی اس بات کا پورا شعور رکھتی ہیں کہ اس انقلاب میں ان کی حیثیت کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ پیغمبرؐ کے اپنی سب سے چھوٹی بیٹی سے رویہ پر تاریخ حیران ہے۔ پیغمبرؐ اپنی اس دختر سے جس طرح پیش آتے تھے اس کی مدح و ستائش میں انہوں نے جو باتیں کہیں ہیں اور اس کے ساتھ عزت و احترام کا جو رویہ دکھاوہ

سب باتیں تعجب خیز ہیں۔

خانۂ پیغمبرؐ اور خانۂ فاطمہؑ ایک دوسرے سے متصل ہیں۔ صرف فاطمہؑ اور ان کے شوہر علیؑ مسجدِ نبوی میں سکونت پذیر ہیں۔ بیتِ رسولؐ کے علاوہ صرف فاطمہؑ کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ ان کا گھر مسجدِ نبوی میں ہے ان کے گھر اور رسولؐ کے گھر کے درمیان صرف دو میٹر کا فاصلہ ہے دونوں گھروں کی کھڑکیاں آمنے سامنے کھلتی ہیں۔ پیغمبرؐ ہر صبح اپنے گھر کی کھڑکی کھول کر اپنی دختر کو سلام کرتے ہیں۔

جب کبھی پیغمبرؐ سفر پر جاتے ہیں تو خانۂ فاطمہؑ میں جا کر بیٹی کو خدا حافظ کہتے ہیں فاطمہ وہ آخری ہستی ہے جس سے حضورؐ سفر پر جاتے وقت وداع ہوتے ہیں اور جب آپؐ سفر سے واپس تشریف لاتے ہیں تو سب سے پہلے جس ہستی سے ملاقات کرتے ہیں وہ ہستی بھی فاطمہؑ ہی ہیں آپؐ سب سے پہلے خانۂ فاطمہؑ میں تشریف لے جاتے ہیں اور ان کی مزاج پرسی کرتے ہیں۔

متعدد تاریخی کتب میں یہ درج ہے کہ پیغمبرؐ اپنی بیٹی (فاطمہؑ) کے چہرے اور دونوں ہاتھوں کو بوسہ دیا کرتے تھے۔

یہ حسنِ سلوک اور یہ رویہّ ایک شفیق اور مہربان باپ کی محبت اور نوازش سے کچھ زیادہ معنویت رکھتا ہے باپ اپنی بیٹی کے ہاتھوں کو چومے اور بیٹی بھی وہ جو سب سے چھوٹی بیٹی ہے یہ محبت کا برتاؤ عرب کے اس ماحول میں ایک ضربِ انقلابی کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں عورتوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک کیا جاتا تھا اسی طرح یہ حقیقت کہ اسلام کے پیغمبرؐ اپنی بیٹی فاطمہؑ کے دستِ مبارکہ کو بوسہ دیتے تھے، تمام بزرگوں، سیاستدانوں، تمام مسلمانوں اور بالخصوص پیغمبرؐ کے اصحاب اور ساتھیوں کی نگاہیں کھولنے کے لیے بہت کافی تھی تاکہ وہ فاطمہؑ کی حیثیت اور ان کی عظمت کو پیغمبرؐ کے اس رویہ کے حوالے سے پہچان سکیں۔ اسی طرح اپنی بیٹی کا ساتھ حضورؐ کا یہ غیر معمولی رویہ تمام انسانوں کو اور ہر عہد کے انسانوں کو یہ سبق دیتا ہے کہ انسان کس طرح

تاریخی عادات و اوہام اور فرسودہ روایتوں سے نجات حاصل کرسکتا ہے یا انسانوں کو فرسودہ اور غلط عادات و روایت سے نجات دلا کر اس بات کا سبق دیتا ہے کہ مرد اس تختِ جبروت و جباریت اور اس خشونت اور فرعونیت کی بلندی سے نیچے اتریں جو انہوں نے اپنے لیے اختیار کر رکھی ہے وہ عورتوں کے برابر کھڑے ہوں اور اسی طرح یہ عمل پیغمبرؐ عورت کو اس بات کا سبق دیتا ہے کہ وہ اس حقارت کی پستی سے جو قدیم دور سے جدید عہد تک اس کا مقدر رہی ہے نجات حاصل کرے اور انسانی وقار و عظمت کی بلندی تک صعود کرے۔ بالفاظِ دیگر یہ عمل مرد اور عورت کو انسانیت کے صحیح مرتبہ اور مقام سے متعارف کرانے کی علامت اور عورت کی عزت و حرمت کا اشاریہ ہے

یہی سبب تھا کہ پیغمبرؐ صرف محبت پدری کے اظہار کے لیے ہی نہیں بلکہ ایک وظیفہ کے طور پر ایک فرض اور ایک عظیم ذمہ داری کے پورا کرنے کے لیے اپنی دختر (فاطمہؑ) کے ساتھ عزت اور احترام کا رویہ رکھتے تھے اور یہی سبب تھا کہ حضورؐ اپنی بیٹی کی شان میں ہمیشہ رطب اللسان رہا کرتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا :

تمام دنیا کی عورتوں میں چار عورتیں سب سے زیادہ فضیلت رکھتی ہیں: مریمؑ، آسیہؑ، خدیجہؑ اور فاطمہؑ۔

- اللہ فاطمہؑ کی خوشنودی سے خوش اور ان کی ناراضگی سے ناراض ہوتا ہے
- فاطمہؑ کی خوشنودی میری خوشنودی ہے۔ فاطمہؑ کا غصہ میرا غصہ ہے۔ جو کوئی میری بیٹی فاطمہؑ کو دوست رکھتا ہے۔ وہ مجھے دوست رکھتا ہے اور جو کوئی فاطمہؑ کو خوش کرتا ہے وہ مجھے خوش کرتا ہے اور جو فاطمہؑ کو غضبناک کرتا ہے۔ وہ مجھے غضبناک کرتا ہے۔
- فاطمہؑ میرا پارۂ تن ہے جس نے اسے اذیت دی اسنے مجھے اذیت دی اور جس نے مجھے اذیت دی اس نے خدا کو ناراض کیا۔

یہ سب تکرار آخر کس لیے؟ کس لیے پیغمبرؐ نے بہ اصرار اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کی مدح و ستائش میں اسقدر حدیثیں ارشاد فرمائیں۔ یہ تکرار، یہ اصرار

یہ اہتمام آخر کس لیے تھا۔ آخر کس لئے پیغمبرؐ لوگوں کے سامنے ان کی مدح وستائش فرماتے تھے آپؐ کیوں یہ چاہتے تھے کہ تمام مسلمانوں کو اپنی بیٹی سے اپنی غیر معمولی محبت اور تعلق سے آگاہ کردیں۔ اور پھر آخر حضورؐ فاطمہؑ کی خوشنودی اور ان کی ناراضگی (خشم) کا ذکر کیوں کرتے تھے کیوں بار بار ان کے بارے میں اذیت دینے اور آزردہ کرنے کی طرف اشارا کرتے تھے۔ خشم اور خوشنودگی اور آزردگی کے کلمات پر پیغمبرؐ نے اتنا زور کیوں دیا ہے۔

ان سوالوں کا جواب اگرچہ بہت حساس اور جذباتی مسئلہ ہے لیکن تاریخ میں یہ جواب صاف اور روشن ہے تاریخ نے ان تمام سوالوں کا جواب دیا ہے اور حضورؐ کے بعد فاطمہؑ نے جو زندگی کے مختصر سے دن گذارے ہیں ان دنوں کے واقعات پیغمبرؐ کے تمام مستقبل کے اندیشوں کو آشکار کر دیتے ہیں۔

اُمِّ ابیہا

تاریخ نہ صرف یہ کہ ہمیشہ بزرگوں کی بابت گفتگو کرتی ہے بلکہ تاریخ کا موضوع توجہ بھی محض بزرگ ہستیاں ہی ہوتی ہیں بچوں اور کم سنوں کو تاریخ ہمیشہ فراموش کر دیتی ہے۔

فاطمہؑ اپنے گھر میں سب سے کم سن تھیں۔ ان کی طفلی کا زمانہ طوفانِ مشکلات وحوادث میں گذرا۔ ان کی تاریخِ ولادت میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ طبری، ابن اسحٰق اور سیرت ابن ہشام میں آپؑ کا سن ولادت ۵ھ قبل بعثت بتایا گیا ہے اس کے برعکس مسعودی کی مروج الذہب میں آپؑ کی ولادت بعثت کے بعد پانچویں سال میں بتائی گئی ہے یعقوبی نے ایک درمیانی راستہ اختیار کیا ہے وہ سنِ ولادت کا تعین نہیں کرتا بلکہ آپؑ کی ولادت کو پس از نزولِ وحی قرار دیتا ہے اسی اختلافِ روایات کے سبب اہلِ سنت نے آپؑ کی ولادت بعثت سے پانچ سال قبل اور شیعوں نے بعثت کے بعد پانچویں سال میں تسلیم کی ہے۔

لیکن ہم ان اختلافی مباحث سے قطع نظر کر کے ان کو محققین کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ محققین کا کام ہے کہ آپؑ کے سن ولادت کا صحیح تعین کریں ہمیں تو دراصل جناب فاطمہؑ کی شخصیت اور آپؑ کی حقیقت اور معنویت کے متعلق گفتگو کرنی ہے۔ ہمارے موضوع گفتگو پر اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ کی ولادت قبل بعثت ہوئی یا بعد بعثت۔

جو بات مسلم ہے وہ یہ ہے کہ فاطمہؑ گھر میں بالکل تنہا تھیں۔ آپ کے دونوں بھائی بچپنے ہی میں انتقال کر گئے آپؑ کی سب سے بڑی بہن زینبؓ جو بڑی بہن ہونے کے ناطے ماں کی جگہ تھیں ابی العاص کے گھر بیاہ کر چلی گئیں۔ جناب فاطمہؑ نے ان کی جدائی کی تلخی اور صدمہ کو محسوس کیا۔ اس کے بعد رقیہؓ اور ام کلثوم کے عقد کی باری آئی اور وہ دونوں بھی اپنے اپنے شوہر کے گھر چلی گئیں اور فاطمہؑ تنہا رہ گئیں اور یہ صورتِ حال بھی اس روایت کو تسلیم کرنے سے مطابقت رکھتی ہے کہ جس میں آپؑ کی ولادت کو پانچ سال قبل بعثت قرار دیا گیا ہے ورنہ اگر آپؑ کی ولادت بعثت کے بعد پانچویں سال میں تسلیم کی جائے تو ایسی صورت میں آپؑ نے جب سے ہوش سنبھالا خود کو اپنے گھر میں تنہا پایا۔ بہرحال آپ کی زندگی کا دور آغاز اور آپ کے پدر بزرگوار کی عظیم رسالت کے کام کا آغاز ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہے۔ یہ دور خاندانِ رسالتؐ کے لیے بڑی شدید آزمائشوں، مصیبتوں اور سختیوں کا دور تھا۔ آپؑ کے پدر بزرگوار خلق خدا کو غفلت سے بیدار کرنے کے عظیم کام کا آغاز کر چکے تھے اور اس کے نتیجہ میں تمام انسانیت دشمن قوتوں کی دشمنی کا ہدف بن گئے تھے اور آپؑ کی مادر گرامی اپنے محبوب شوہر کی دلجوئی اور دلسوزی میں ہمہ تن مصروف تھیں اس صورتِ حال میں فاطمہؑ کو جو زندگی کا پہلا تجربہ ہوا وہ رنج واندوہ کا تجربہ تھا اور آپؑ نے بچپن ہی سے زندگی کو ایک شدید آزمائش کے طور پر محسوس کیا۔ چونکہ اس وقت آپ بہت ہی کم سن تھیں اس لیے گھر سے باہر نکلنے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ اس آزادی سے آپؑ نے یہ فائدہ اٹھایا کہ آپؑ اپنے

والد کے ہمراہ ان کی تبلیغی مہم میں شریک رہیں جناب فاطمہؑ کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ ان کے پدر بزرگوار کو یہ فرصت نہیں ہے کہ وہ اپنی بیٹی کی انگلی پکڑ کر اسے شہر کے کوچہ و بازار میں سیر کرا سکیں وہ اپنی رسالتؐ کے عظیم اور پر خطر کام میں مصروف تھے وہ جانتے تھے کہ شہر میں ہر طرف دشمنی اور مخالفت کا طوفان موجیں مار رہا ہے اس لیے وہ اس طوفان سے نمٹنے کے لیے اکیلے ہی اپنی مہم پہ روانہ ہو جاتے ہیں لیکن ان کی چہیتی بیٹی جو اپنے باپ کی عظمت اور حقیقت کا شعور رکھتی تھی ان کو ان خطرات میں تنہا چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھی۔

اس بیٹی نے بارہا یہ منظر دیکھا کہ ان کے پدر بزرگوار لوگوں کے ہجوم میں تنہا کھڑے ہیں اور انہیں ایک شفیق باپ کی طرح نرمی اور محبت سے حق کی تعلیم دے رہے ہیں۔ پیغمبرؐ خود کو تنہا اور بے یار و مددگار محسوس کر رہے ہیں مگر ان کے عزم اور حوصلہ میں کوئی فرق نہیں آتا جب کوئی ایک گروہ ان کی بات سننے سے انکار کر دیتا ہے تو وہ لوگوں کے کسی دوسرے گروہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں مگر یہاں بھی لوگ ان کا مذاق اڑانے اور ان کے ساتھ نامناسب زبان استعمال کرنے کے علاوہ اور کوئی جواب نہیں دیتے اسی طرح تمام وقت گذر جاتا ہے بالآخر حضورؐ خستہ و درماندہ اپنی بے ثمر مہم سے واپس لوٹتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے دوسرے بچوں کے باپ اپنے اپنے کام سے لوٹتے ہیں تاکہ گھر میں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد پھر اپنے کام کا آغاز کر سکیں۔

تاریخ ہمیں یہ واقعہ یاد دلاتی ہے کہ ایک دن پیغمبرؐ مسجد الحرام میں تھے کہ لوگوں نے ان پر دشنام طرازی کی اور انہیں زدوکوب کیا کمسن فاطمہؑ بے بسی اور رنج کے ساتھ یہ منظر دیکھ رہی تھیں اس ناخوشگوار حادثہ کے بعد وہ اپنے باپ کو لے کر گھر لوٹیں

پھر ایک روز یوں ہوا کہ پیغمبرؐ مسجد الحرام میں نماز ادا کر رہے تھے جب آپ سجدہ کی حالت میں تھے تو دشمنوں نے بھیڑ کی اوجھڑی آپؐ کے سر مبارک پر رکھ دی۔ فاطمہؑ نے یہ منظر دیکھا تو بیتاب ہو گئیں۔ آپؑ اپنے باپ کے نزدیک گئیں۔ اس غلاظت کو ان کے فرق مبارک

سے ہٹایا اور پھر اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے ان کے سر کو گندگی سے پاک کیا ان کے ساتھ طفلانہ محبت اور ہمدردی کا اظہار کیا اور پھر آپؑ اپنے پدر بزرگوار کو ساتھ لے کر گھر کی طرف پلٹیں۔

لوگ اس لاغر اندام اور کمزور و نحیف بچی کو ہمیشہ اپنے عظیم المرتبت باپ کی تنہائی کا رفیق اور مونس و غمخوار پاتے تھے وہ دیکھتے تھے کہ کس طرح یہ معصوم اور کم سن بچی اپنے باپ سے محبت کرتی ہے ان کو ہر طرح آرام پہنچانے کی کوشش کرتی ہے اور اپنے باپ کو مصیبت اور رنج سے نجات دلانے کے لیے ہمہ تن مصروف رہتی ہے وہ اپنی باتوں سے اپنے طور طریقوں سے اور اپنی معصومانہ محبت سے اپنے باپ کو تسکین و تسلی دیتی ہے اور ہر طرح ان کے دکھ درد بانٹنے میں مصروف رہتی ہے ایک چھوٹی سی بچی کا اپنے باپ کے ساتھ یہ بے مثال رویہ دیکھ کر لوگ کہنے لگے کہ یہ بیٹی صرف بیٹی نہیں بلکہ یہ اپنے باپ کے ساتھ ماں کا سا برتاؤ کرتی ہے۔

یہ امّ ابیہا ہے۔

باب دوم

شعبِ ابی طالبؑ کا دور

شعب ابی طالبؑ کے دور پر متن کا آغاز ہو چکا ہے۔ یہ دور خانوادۂ رسالتؐ کے لیے ہر طرح کی سختی اور مصیبت کا دور تھا۔ بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب (سوائے ابولہب کے جو دشمنوں سے مل گیا ہے) ایک خشک اور بے آب وگیاہ گھاٹی میں محصور ہو گئے ہیں۔ انہیں عورتیں، مرد بچے، سبھی شامل ہیں۔ ابوجہل نے تمام اشرافِ قریش کی طرف سے ایک دستاویز تحریر کی ہے اور اسے خانۂ کعبہ کی دیوار پر آویزاں کر دیا گیا ہے

اس قرارداد کا متن یہ ہے کہ بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلبؑ سے کوئی شخص کسی قسم کا رابطہ نہیں رکھے گا۔ ان کے ساتھ ہر قسم کا تعلق منقطع کر دیا جائے گا ان سے کوئی چیز خریدی نہیں جائے گی اور نہ ان کے ہاتھ فروخت کی جائے گی ان کے ساتھ کوئی ازدواجی رشتہ قائم نہیں کیا جائے گا

انہیں اس پہاڑی درہ میں محصور رہنے پر اس وقت تک مجبور کیا جائے گا کہ فقر و فاقہ، تنہائی اور زندگی کی سختیاں یا تو انہیں بتوں کے آگے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیں یا پھر موت کے حوالے کر دیں۔ یہ مصیبت، یہ قید کی سختیاں ان سب لوگوں کو برداشت کرنی ہوں گی جو یا تو اس نئے دین میں داخل ہو گئے ہیں یا پھر اگرچہ کہ انہوں نے اس نئے دین کے حلقہ میں شمولیت اختیار نہیں کی مگر وہ مردان آزاد ہیں۔ وہ جاہلیت کے تعصب اور تنگ نظری سے آزاد ہیں اگرچہ کہ انہیں پیغمبرؐ سے فکری اختلاف ہے مگر وہ مشترک دشمنوں کے خلاف ان کا دفاع کرتے ہیں۔ وہ اسلام شناس نہیں ہیں اس لیے وہ اسلام کے اصولوں پر ایمان نہیں

لائے مگر وہ محمدؐ شناس ہیں وہ پیغمبرؐ کی نیکی، پاکیزگی اور ان کی بے لوثی اور بے غرضی کے معترف ہیں وہ اس بات کو جانتے ہیں کہ پیغمبرؐ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ مبنی برحقیقت ہے اس میں ان کی کوئی ذاتی غرض شامل نہیں ہے بلکہ ان کا واحد مقصد یہ ہے کہ وہ تمام انسانیت کو جہل اور ظلم سے نجات دلا سکیں تمام انسانوں کو آزاد کرا سکیں۔ یہ لوگ ایسے دانشوروں سے بدرجہا بہتر ہیں۔ جو خوف اور مصلحت کا شکار ہو جاتے ہیں جیسے علی بن امیہ تھا جو رجعت پسندی کا مخالف اور اسلام کے نئے انقلابی اور ترقی پسندانہ نظریہ سے آگاہ تھا۔ اور قریش کے توہمات اور تعصبات اور عرب کے اجتماعی، اقتصادی، نسلی اور طبقاتی نظام کی خرابیوں کو اسلام کی روشنی میں اچھی طرح دیکھ سکتا تھا لیکن اس کے باوجود اپنے باپ کی دولت اپنی اپنی خاندانی وجاہت اور اجتماعی زندگی میں اپنے مقام و مرتبہ سے محرومی کا اندیشہ اور اپنی جان و مال کی سلامتی کے خوف سے ابوجہل اور ابولہب کے ساتھ ہو گیا اور اپنے ہم نکروں، نیک اور پاکیزہ فطرت اور باحوصلہ ساتھیوں۔ بلال اور عمار اور یاسر اور سمیہ۔ کو ہر طرح کے شدائد کا ہدف بنتے دیکھتا رہا اور اس کے باوجود مشرکوں کے اس ظالمانہ رویہ کے خلاف اس کے لب نہ کھل سکے اس کے منہ سے کوئی آواز احتجاج بلند نہ ہو سکی وہ اس مشکل اور آزمائشی مدت میں جب اس کے عقیدے کے علمبردار اور مجاہد قید و بند کی سختیاں جھیل رہے تھے ان کی طرف سے بے فکر اور بے پرواہ رہا اور اپنے خاندان اور شہر کی زندگی میں حسب معمول سرگرمی سے حصہ لیتا رہا یہاں تک کہ وہ کفر و ضلالت کے سربراہوں کے ساتھ تعاون بھی کرتا رہا۔ ان کی مجرمانہ سرگرمیوں میں ان کا ساتھ دیتا رہا اس طرز عمل نے ایک سنت مذموم کی بنا رکھ دی برائی کا دروازہ کھول دیا تاریخ کے ادوار میں اس مسلک اور اس سنت مذموم کے پیروں کی تعداد مسلک پیغمبرؐ کے سچے پیروکاروں علیؑ و ابوذرؓ و عمارؓ و فاطمہؑ و زینبؑ و حسینؑ کے شیعوں اور تمام ان مہاجرین اور انصار سے جو دین پر صحیح معنوں میں عمل کرنے والے تھے۔ کہیں زیادہ نظر آتی

ہے یہ لوگ (علی بن امیہ) وہ پہلے مسلمان تھے کہ جو باوجود اس کے کہ پیغمبرؐ نے عہد تقیہ کے اختتام کا اعلان کر دیا تھا۔ تقیہ کے اصول پر کاربند رہے اس لیے کہ اسی میں ان کا فائدہ تھا۔ یہ تا وقتِ مرگ اپنی اس مصلحت آمیز روش کا شکار رہے آخر یہ انسان کیسی عجیب و غریب مخلوق ہیں۔

جب انسانوں کی روح میں آتشِ ایمان فروزاں ہوتی ہے۔ جب معاشرے میں کسی نئی انقلابی تحریک کا آغاز ہوتا ہے تو پھر آزمائش اور احتساب کا وہ لمحہ بھی آجاتا ہے جب ہر شخص خود اپنے محاسبہ پر مجبور ہو جاتا ہے یہ وہ موقع ہوتا ہے جب انسان اپنے آپ کو دھوکہ نہیں دے سکتا وہ خود سے سچ بولنے پر مجبور رہتا ہے ، اسے مکر و ریا کے پردے چاک کرنے پڑتے ہیں اسے حق اور باطل کے درمیان واضح انتخاب کرنا پڑتا ہے اور یہی وہ موقع ہے جب وہ تمام عظمتیں اور ذلتیں وہ تمام کمزوریاں اور توانائیاں جو انسان کے باطن میں چھپی ہوتی ہیں خود کو پوری طرح آشکار کر دیتی ہیں۔

شعبِ ابی طالبؑ کا دور بھی ایسا ہی آزمائشی دور تھا جس نے حق اور باطل کو آشکار کر دیا ، اس ہولناک گھاٹی میں جہاں تین سال کی طویل مدت تک بھوک ، تنہائی ، سختی اور پریشانی کا ہولناک سایہ پھیلا ہوا تھا ایسا کون ہے جو مسلمان نہ ہو ۔[1] مگر جو اس عظیم انقلابی مہم میں خدائی کام میں شریک اور سہیم ہے اور تاریخ اسلام کے اس ابتدائی مگر انتہائی نازک اور آزمائشی دور میں محمدؐ اور علیؑ اور ان کے مخلص پیروکاروں یعنی اصحاب و مہاجر کے ساتھ ساتھ سختی اور مصیبت کا ہدف ہے اور دوسری طرف شہر مکہ ہے جہاں نا ؤ نوش کی لذت اور زندگی کی راحت ہے مگر اس شہر پر جاہلیت اور رجعت پسندی بے دردی اور بے شرمی کا سایہ کھینچے کئے ہوئے ہے اور اس تاریک فضا میں کچھ وہ چہرے بھی دیکھے جا سکتے ہیں جن پر اسلام کا نقاب ہے مگر جن کے دامن آلودہ اور جن کے ہاتھ پلید ہیں یہ اس شہر میں آزادی اور آرام سے زندگی گذار رہے

---

[1] ایمان ابو طالبؑ کی طرف اشارہ ہے۔

ہیں کیا یہ پیغمبرؐ اور ان کے مخلصین پر سختیوں کا تماشہ دیکھ رہے ہیں یا اس مذموم کھیل میں خود بھی شریک ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ باطنی طور پر دیندار ہیں اور دینداروں کو دوست رکھتے ہیں۔ مگر کیا واقعی یہ دعویٰ سچا ہے ادھر شعب ابی طالب کے حصار میں بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کا خاندان شہری زندگی کی ہر سہولت سے محروم، لوگوں سے دور، آزادی حتیٰ کہ روٹی تک کے لیے ترس رہا ہے کبھی کبھی نصف شب کے اندھیرے میں خفیہ طور پر کوئی ہمت جوان گھاٹی سے باہر آجاتا ہے۔ قریش کے جاسوسوں کی نظروں سے بچتا ہوا بھوکے اور بیتاب قیدیوں کے لیے خوراک کا کچھ انتظام کرتا ہے کیا اس بات کا احتمال نہیں ہے کہ ان لوگوں میں جو شہر میں آزاد ہیں کوئی عزیز یا دوست ازراہ کرم ان بھوکوں تک روٹی پہنچا دے ان کی بھوک کبھی اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ یہ نظر آتا ہے جیسے لوگ بھوک کے ہاتھوں "مرگِ سیاہ" کا شکار ہو جائیں گے۔ مگر یہ اہلِ عزم و ایمان جنہوں نے خود کو مرگِ سرخ یعنی شہادت کے لیے تیار کیا ہوا ہے۔ بھوک کے سامنے سپر انداختہ نہیں ہو سکتے ان کے حوصلہ اور صبر میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

سعد بن ابی وقاص جو خود اس حصار میں مقید تھے بیان کرتے ہیں کہ بھوک نے اسقدر بیتاب کر دیا تھا کہ اگر رات کی تاریکی میں کسی تر اور ملائم چیز سے ٹھوکر لگتی تھی تو اسے اٹھا کر بے اختیار منہ میں رکھ لیتا تھا اور چبانے اور چبانے کی کوشش کرتا تھا اس واقعہ کے دو سال بعد بھی میں یہ ٹھیک سے نہیں بتا سکتا کہ وہ کیا چیز ہوتی تھی۔

ایسے حالات میں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خود خاندانِ رسالت پر کیا گذری ہوگی تاریخ ہر واقعہ کی جزئیات نقل نہیں کرتی مگر ہم خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ خانوادۂ رسالتؐ ان سختیوں کا سب سے زیادہ ہدف بنا۔

بات یہ ہے کہ وہ تمام لوگ جو شعبِ ابی طالبؑ کے حصار میں محصور نقر و فاقہ کی سختیاں جھیل رہے تھے ان کے تمام آلام و مصائب کا واحد سبب ان کی خاندان

رسالتؐ سے محبت اور یگانگت تھی اسی خاندان سے تعلق خاطر کے سبب وہ قید تنہائی اور فقر و فاقہ کی مصیبت جھیل رہے تھے یہ حقیقت بھی پوری طرح روشن ہے کہ تمام صورتِ حال کی ذمہ دار صرف ایک شخصیت تھی اور وہ شخصیت پیغمبرؐ اسلام حضرت محمدؐ مصطفےٰ کی ذاتِ گرامی تھی خود پیغمبرؐ بھی اس بات کو محسوس کرتے تھے اور ان کے تمام ساتھی بھی اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے۔

ہر بچہ جو بھوک کی تکلیف سے بیتاب ہو کر روتا تھا۔ ہر بیمار جو غذا اور دوا فراہم نہ ہونے کی وجہ سے فریاد کرتا تھا، ہر بوڑھا خواہ مرد ہو یا عورت جو اس سختی اور مصیبت سے عاجز ہو جاتا تھا اور ہر چہرہ جو تین سال کی بھوک اور قید تنہائی کی وجہ سے زندگی کی حرارت اور خون کی سرخی سے محروم ہو چکا تھا جب ان ... کا سامنا محمدؐ سے ہوتا تو وہ اپنی بھوک، بیماری، پریشانی اور کمزوری پر پردہ ڈال کر ان سے محبت اور وفاداری کا اظہار عزم اور حوصلہ کے ذریعے کیا کرتے تھے لیکن پیغمبرؐ کا حساس اور آگاہ قلب ان تمام لوگوں کے مصائب کو محسوس کرتا تھا اور ان کی ایک ایک تکلیف سے متاثر ہوتا تھا۔

بے شک جب کبھی رات کی تاریکی میں کہیں سے کچھ طعام دستیاب ہوتا تھا اور اسے پیغمبرؐ کے حضور پیش کیا جاتا تھا تاکہ وہ اپنے ساتھیوں میں اسے تقسیم کر دیں تو اس تقسیم میں سب سے کم حصہ پیغمبرؐ کی بیوی اور ان کی اولاد کا ہوتا تھا بے شک اس غذا میں سے انہیں بس اسی قدر مل سکتا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے جسم اور روح کے رشتہ کو برقرار رکھ سکیں

دورانِ حصار خانوادۂ رسالت میں حضورؐ کی زوجہ خدیجہؑ تھیں ان کی سب سے چھوٹی بیٹی فاطمہؑ تھیں اور فاطمہؑ کی بہن ام کلثومؓ۔ ام کلثوم اور ان کی بہن رقیہ کی شادی ابولہب کے بیٹوں سے ہوئی تھی مگر بعثت کے بعد پیغمبرؐ کی تحقیر اور دل آزاری کے لیے ابولہب نے اپنے بیٹوں کو حکم دیا کہ وہ اپنی بیویوں کو طلاق دے دیں۔ مگر عثمان نے جن کا تعلق طبقۂ اشراف سے تھا جو

جوان، حسین اور دولت مند تھے رقیہ سے عقد کر کے ابو لہب کے اس عمل کی تلافی کر دی اور رقیہ عثمان کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کر گئیں، مگر ام کلثوم اپنی زندگی کے آرام و آسائش کو اپنے ایمان پر قربان کر کے اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ شعب ابی طالبؑ کے حصار میں رہیں انہوں نے اپنے عظیم المرتبت باپ کے ساتھ وفاداری اور راہ ایمان وعقیدہ میں قید و بند اور بھوک کی سختیوں کو خاندان ابولہب میں اپنے نابکار، بداندیش اور رجعت پسند شوہر عتبہ کے ساتھ رہ کر عیش وعشرت کی زندگی گذارنے پر ترجیح دی۔

اس گھاٹی کے مکینوں کا ہر دن سختی اور مصیبت میں کٹتا تھا اور ہر رات ایک تاریکی کے خیمہ کی طرح ان پر مسلط ہو جاتی تھی ہفتہ، مہینہ اور سال اسی طرح گذر گئے ان دنوں کی سختی اور ان راتوں کی مرگ آسا تاریکی نے ان کے جسموں اور روحوں کو خستہ کر دیا تھا۔ مگر اس کے باوجود ان سب کی ہمتیں جوان تھیں ان کے ایمان توانا تھے وہ ایک دوسرے کی غمخواری اور پیغمبرؐ سے عہد وفا پر مضبوطی سے قائم تھے۔

ان تمام حالات میں خاندان رسالتؐ کی ایک مخصوص اور منفرد حیثیت ہے اس خاندان کے سربراہ کے شانوں پر تمام لوگوں کے دکھ درد اور مصیبتوں کا بوجھ ہے اس کی بیٹی ام کلثوم اپنی ہر حسرت کو تج کر شوہر کے گھر سے اپنے باپ کے گھر آ چکی ہے اور دوسری بیٹی فاطمہ نہایت خورد سال ہے اس کی عمر صرف دو تین سال یا بروایت دیگر بارہ تیرہ سال ہے اس کے ساتھ ہی وہ کمزور اور حساس ہے اسکا جسم ضعیف اور اس کی روح زندہ اور حساس ہے اور پیغمبر کی زوجہ خدیجہؑ نہایت بوڑھی اور ضعیف ہیں وہ اپنی عمر کے ستر سال گذار چکی ہیں۔

جن میں دس سال کا وہ آزمائشی اور تکلیف دہ عرصہ بھی شامل ہے جو دعوت رسالت کے جواب میں کافروں کے ردعمل سے عبارت ہے اور پھر تین سال کا یہ عرصہ قید، تنہائی، بھوک اور پریشانی کا یہ دور جس کا ہر دن سختی اور ہر رات

مصیبت کا پیغام ہے انہوں نے اپنے شوہر کے حالات کو دیکھا ان کے دکھ درد کو محسوس کیا اپنی بیٹیوں کی تکلیف کو محسوس کیا ان حوادث اور اس سے قبل دو کم سن لڑکوں کی موت کے صدمے نے ان کو بالکل نڈھال کر دیا ہے اگرچہ اب بھی ان کی ہمت پست نہیں ہوئی مگر ان کے ضعیف جسم سے زندگی کی تمام توانائیاں رخصت ہو چکی ہیں اب ہر لحظہ ان کی آنکھیں موت کی تصویر دیکھ رہی ہیں۔

اور اس ضعف اور بیماری کے باوجود خاندان محمدؐ پر ایسا برا وقت پڑا ہے کہ خدیجہؓ جن کی زندگی عیش و نعم میں گذری ہے اور جنہوں نے اپنی تمام دولت اپنے شوہر کے مقصد کی راہ میں قربان کر دی اب بھوک سے بے تاب ہو کر چمڑے کے ٹکڑے کو پانی میں تر کر کے اپنے منہ میں رکھتی ہیں تا کہ بھوک کی شدت کو کم کیا جا سکے۔

فاطمہؑ جو ایک کمسن اور حساس بچی ہیں اپنی ماں کے بارے میں فکرمند رہتی ہیں اور ان کی ماں فاطمہؑ کے بارے میں پریشان رہتی ہیں یہ ان کی سب سے چھوٹی اولاد ہیں کم سن اور لاغر لڑکی جنکی اپنے باپ اور ماں سے غیر معمولی محبت کا ہر طرف چرچا ہے

اس صبر آزما قید کے آخری ایام میں ایک دن خدیجہؓ جنہیں اپنی مدت حیات پوری ہونے کا احساس ہو چکا تھا اپنے بستر پر آرام کر رہی تھیں اور فاطمہؑ اور ام کلثوم ان کے پاس بیٹھی تھیں اس وقت پیغمبرؐ لوگوں کو خوراک تقسیم کرنے کے کام میں مصروف تھے۔

خدیجہ کبر سنی اور ضعف اور نا ساز گار حالات کے مضر اثرات کو پوری طرح محسوس کر رہی تھیں ان کا جسم بیماری سے بہت کمزور ہو چکا تھا انہوں نے حسرت بھرے لہجہ میں کہا

کاش موت مجھے اتنی مہلت دے دے کہ یہ تیرہ و تاریک دور ختم ہو جائے اور میں اطمینان اور سکون سے جان دے سکوں۔ ام کلثومؓ یہ سن کر رونے لگیں اور انہوں نے کہا

اے مادر مہربان آپ پریشان نہ ہوں۔ ہم ان باتوں سے نہیں گھبراتے

جناب خدیجہؓ نے جواب دیا۔ خدا کی قسم مجھے اپنی کوئی پرواہ نہیں ہے اور نہ میں

خود اپنے بارے میں پریشان ہوں۔ اے میری لختِ جگر قریش میں کسی عورت نے زندگی سے وہ راحت و آرام نہ اٹھایا ہوگا جو مجھے میسّر رہا ہے۔ بلکہ سچ پوچھو تو تمام دنیا کی عورتوں میں جو مجھے کرامت نصیب ہوئی ہے اور وہ کسی اور کے حصّہ میں نہیں آسکی ہے میرے لیے یہ بات بہت ہے کہ اس دنیا میں میری تقدیر یہ ہوسکی کہ میں اللہ کے محبوب بندہ اور اس کے منتخب پیغمبرؐ کی شریکِ حیات ہوں اور عاقبت کے لیے مجھے یہ فخر کافی ہے کہ میں نے دعوتِ رسالتؐ پر سب سے پہلے لبیک کہا اور میں رسولؐ کے امتیوں کی ماں کہلاتی ہوں۔

پھر خود کلامی کے انداز میں انھوں نے اپنا سلسلۂ گفتگو جاری رکھا۔

خداوندا مجھ میں اتنی طاقت کہاں ہے کہ تو نے مجھ پر جو الطاف و عنایات کی ہیں اور مجھے جن نعمتوں سے نوازا ہے ان کا شمار کرسکوں، اے خدا میں تجھ سے ملاقات کے خیال سے دل تنگ نہیں ہوں لیکن میں یہ چاہتی ہوں کہ تجھ سے ایسی حالت میں سامنا ہو کہ میں خود کو تیری عطا کردہ نعمتوں کا اہل ثابت کرسکوں

فضا پر ایک گہرا سکوت چھایا ہوا تھا، رنج مایوسی، اور موت کا سایہ خدیجہؓ ام کلثومؓ اور فاطمہؓ کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھا کہ ناگہاں پیغمبرؐ نمودار ہوئے۔ ان کے چہرۂ تاباں سے امید، ایمان اور روحانی قدرت و توفیق کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں یوں لگتا تھا کہ ابتلاء اور آزمائش کے اس تین سالہ سخت و تاریک دور نے پیغمبرؐ کے جسم و روح کو بالکل پژمردہ نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس ان کے عزم، حوصلہ، قوتِ ارادی اور جذبۂ ایمان میں اضافہ کا سبب بنا ہے۔

شعبِ ابی طالبؑ کی قیدِ سخت کا تاریک دور ختم ہوگیا خدیجہؓ نے موت سے قبل مسلمانوں کی نجات اور اپنے عزیز اور عظیم شوہر کی آزادی کے دور کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ یہ قریش پر پیغمبرؐ کی پہلی بڑی فتح تھی۔

مگر کاتبِ تقدیر کو یہ پسند نہیں آیا کہ وہ عظیم انسان جسے تاریخ کا دھارا موڑنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے اطمینان اور سانس کا سکون لے سکے اسے کرۂ ارض

چہرہ پر اطمینان اور مسرت کا رنگ جھلک سکے تقدیر پیغمبرؐ کو بیک وقت دو عظیم صدمات سے دوچار کر دیتی ہے۔

شعب ابی طالبؑ کی قید سے رہائی کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرتا کہ ابو طالب اور خدیجہؑ تھوڑے دنوں کے فرق سے داعیٔ اجل کو لبیک کہتے ہیں۔ ابو طالبؑ وہ ہستی ہیں جنہوں نے اپنے یتیم بھتیجے کی پرورش کی ہے اور اپنی غیر معمولی محبت اور شفقت کے ذریعہ یتیم بھتیجے کو ماں باپ اور دادا کی کمی محسوس نہیں ہونے دی پھر جب آپؐ جوان ہو گئے تو ابو طالبؑ نے آپ کی سرپرستی اور نگہبانی کے فرائض انجام دیئے آپ کے لیے خدیجہؑ کے کاروبار میں شرکت کی راہ ہموار کی اور پھر خدیجہؑ سے آپؐ کے عقد کے موقع پر آپؐ کے پدر بزرگوار کی نیابت کی۔

ابو طالبؑ سے حضورؐ کے تعلق کی تین نمایاں جہتیں ہیں آپؑ نے محمدؐ یتیم کی پرورش فرمائی "محمدؐ جوان" کی نگہداری کا فریضہ انجام دیا اور محمدؐ پیغمبر کی حفاظت اور نصرت میں اپنی تمام توانائیوں کو صرف کیا۔ جب حضورؐ نے کار رسالتؐ کا آغاز کیا تو ابو طالبؑ دشمنوں کے خلاف آپؐ کی سپر بن گئے اور اپنی تمام شخصیت اور حیثیت اپنے تمام اثر و نفوذ اور اپنے تمام اجتماعی اعتبار اور وقار کو حضورؐ کی حفاظت اور حمایت کے لیے وقف کر دیا۔ یہاں تک کہ تین سال تک پیغمبرؐ کے ساتھ شعب ابی طالبؑ کے حصار کی سختیاں صبر و سکون سے برداشت کرتے رہے۔ یہ محض ابو طالب کی ذات تھی جس کے سبب پیغمبرؐ اسلام دشمنوں کی ایذا رسانی اور گزند سے محفوظ رہے یہ محض ابو طالبؑ تھے جو دشمنوں کی تمام سازشوں کے خلاف ایک مضبوط حصار تھے اور جن کی وجہ سے پیغمبرؐ دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے محفوظ رہے اور اب یہ بزرگ ترین شخصیت دنیا سے اٹھ گئی گویا رسولؐ کے گرد حفاظت کا جو مضبوط حصار تھا وہ ٹوٹ گیا۔ اب رسولؐ بظاہر بے یار و مددگار ہو گئے۔

اس کے کچھ ہی دن بعد خدیجہؑ بھی داغ مفارقت دے گئیں۔

خدیجہؑ وہ خاتون تھیں جنہیں قدرت نے اپنے محبوب کو ایک ایسی عنایت کے

طور پر بخشا تھا جس کے ذریعہ پیغمبرؐ کی انفرادی زندگی کی تمام محرومیوں کا ازالہ کیا جا سکے خدیجہ سے عقد کے وقت حضورؐ کا سن ۲۵ پچیس سال تھا اور یہ تمام مدت یتیمی، گلہ بانی، تنگدستی اور فقر کے ایک صبر آزما دور کی حیثیت رکھتی ہے خدیجہؓ ایک انتہائی مالدار خاتون تھیں عقد کے وقت آپ کا سن چالیس سال بتایا جاتا ہے خدیجہ سے حضور کی رفاقت محض ایک زوجہ اور شوہر کے تعلق سے کہیں زیادہ تھی وہ ایک مخلص اور وفادار بیوی تھیں وہ آپؐ کی تبلیغی مہم میں آپ کی ہمدرد اور روحانی رفیق تھیں وہ مفلسی اور تنگ دستی میں آپؐ کی پناہ تھیں انہوں نے پیغمبرؐ کو ایک مخلص دوست اور رفیق کا خلوص دیا اور انہوں نے آپؐ سے ایسا محبت آمیز رویہ رکھا جس نے کسی حد تک ماں کی محبت سے محرومی کے احساس کی تلافی کر دی۔

حضورؐ کی بعثت کے بعد ایک ایسا طوفانی دور شروع ہوا۔ جو پیغمبرؐ کے لیے سختی خوف، خطرہ اور تنہائی کا دور تھا۔ یہ دشمنوں کی سازشوں، مکروفریب اور کشمکش کا ایک ایسا دور تھا جس میں پیغمبرؐ ہر طرف سے دشمنی اور مخالفت کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ آغاز وحی کے وقت سے موت کے لمحہ تک خدیجہ قدم بہ قدم رسولؐ کے ساتھ رہیں ان کا دل اور ان کی روح رسولؐ کی محبت سے سرشار تھی وہ تمام مشکل لمحات میں ان کی مونس و غم گسار تھیں۔ ان کی تمام زندگی، تمام جذبۂ محبت، ایمان فدا کاری اور تمام دولت حضورؐ کے لیے وقف تھی انہوں نے ہر چیز کو ان پر قربان کر دیا خدیجہؓ نے ایک ایسے پرآشوب اور پرخطر دور میں رسولؐ کا ساتھ دیا جب رسولؐ کو کسی ساتھی کے خلوص اور ہمدردی کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

اور اب محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس ہستی سے محروم ہو گئے جو ان کی حامی تھی۔ ہمدم اور ہمدرد تھی۔ جو ان پر سب سے پہلے ایمان لانے والی تھی۔ جو ہر سختی اور مصیبت کے وقت ان کو تسلی دینے والی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جو ان کی بیٹی فاطمہؑ کی ماں تھی اور فاطمہؑ ماں کے سایہ سے محروم ہو گئیں

سختی اور مصیبت شدید سے شدید تر ہو گئی ہے ابو طالب دنیا سے گذر چکے

اور اب اس دنیا میں دشمنوں کی سازشوں اور ایذا رسانیوں سے پیغمبرؐ کا تحفظ کرنے والا کوئی شخص نہیں رہا۔ پیغمبرؐ کا محافظ کوئی نہیں ہے ادھر پیغمبرؐ اور ان کے پیروکاروں کے صبر اور حوصلہ اور ایمانی قوت نے دشمنوں کو بہت مشتعل کر دیا ہے۔ اور ان کی سازشیں اور ریشہ دوانیاں اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہیں۔ پیغمبرؐ حد درجہ تنہائی محسوس کر رہے ہیں۔ وہ بے یار و مددگار ہیں، شہر ابو طالبؑ سے خالی ہے اور گھر خدیجہؑ سے۔ پیغمبرؐ کے لیے گھر کے اندر اور باہر ہر طرف تنہائی ہے۔

اور یہی وہ وقت تھا جب فاطمہؑ نے اپنی کنیت 'ام ابیہا' کی معنویت اور اس کے تقاضے ہمیشہ سے زیادہ شدت سے محسوس کیے۔ ان کے ذہن میں ان لمحوں کی یاد تازہ ہو گئی جب ان کی بہنیں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد باپ کے گھر سے شوہر کے گھر منتقل ہوئی تھیں انہوں نے اپنی ماں کا دامن پکڑ کر کہا تھا

اماں مجھے کسی طرح یہ پسند نہیں ہے کہ میں اس گھر کو چھوڑ کر کسی اور گھر چلی جاؤں اماں میں ہرگز آپ سے جدا نہ ہوں گی خدیجہ نے ایک ایسی مسکراہٹ کے ساتھ جو شفقت اور ستائش سے لبریز تھی جواب دیا۔

سب یہی کہتے ہیں مگر اے پارۂ جگر ایک وقت آتا ہے کہ ہر لڑکی اپنے باپ کے گھر سے شوہر کے گھر منتقل ہو جاتی ہے۔

مگر فاطمہؑ اصرار کرتی ہیں کہ نہیں میں اپنے باپ کو نہیں چھوڑ سکتی کوئی مجھے ان سے جدا نہیں کر سکتا۔ ماں بیٹی کے یہ جذبات دیکھ کر خاموش ہو جاتی ہے۔

اور اب فاطمہؑ کو پوری طرح احساس ہوتا ہے کہ قدرت نے ان کو کیسی اہم ذمہ داری سونپ دی ہے انہوں نے اپنے پدر بزرگوار سے جدا نہ ہونے کا جو عہد کیا تھا اب وہ محض طفلی کا معصومانہ عہد نہیں تھا بلکہ اس میں ایمان اور شعور کی پختگی شامل ہو چکی تھی۔ فاطمہؑ نے اپنے باپ کو ایک رسول کی حیثیت میں دیکھا تھا اور رسولؐ کی رسالت پر ان کا ایمان محض باپ اور بیٹی کی محبت کی بات نہ تھی بلکہ اس میں تفکر کی گہرائی بھی شامل تھی جس وقت حضورؐ نے قریش کو پہلی بار اسلام کی دعوت دی تو اس موقع پر

خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا تھا۔

اے گروہ قریش اپنی حقیقت کو دریافت کرو۔ میں خدا کے معاملہ میں تمہیں کسی بات سے بے نیاز نہیں کرسکتا۔

~~اے بنی عبدمناف۔ اپنی ذمہ داریوں کو پہچانو۔ میں اس بات کی قدرت~~ نہیں رکھتا کہ خدا کے معاملہ میں تمہیں کسی فرض سے بے نیاز کرسکوں۔

اے عباس بن عبدالمطلبؑ میں خدا کے حضور تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا

اے صفیہ بنت عبدالمطلبؑ ۔۔۔۔۔۔

پھر رسولؐ نے اپنی کم سن بیٹی کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

اے فاطمہؑ۔ تم میری دولت میں سے جو کچھ چاہو لے لو لیکن جہاں تک تمہارا اور تمہارے خدا کا معاملہ ہے یاد رکھو اس باب میں تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا تمہیں کسی فرض سے بے نیاز نہیں کرسکتا۔

فاطمہؑ نے یہ سن کر شوق اور جذبۂ ایمان کی فراوانی کے عالم میں جواب دیا تھا۔

ہاں، ہاں ٹھیک ہے۔ اے پدر مہربان۔ اے گرامی ترین پیغمبرؐ۔

کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ پیغمبرؐ نے اکابر قریش کے مجمع میں بنی ہاشم اور بنی عبدمناف کی بزرگ ترین شخصیتوں کے ساتھ ساتھ فاطمہؑ کو بھی بطرز خاص نام لے کر مخاطب کیا۔ فاطمہؑ جو اس وقت بہت کم سن تھیں مگر جو اس اجتماع میں شرکت کرنے والی وہ واحد ہستی تھیں جس کا تعلق خاص خانوادۂ رسولؐ سے تھا اس مجمع میں صرف اور صرف وہی رسولؐ کے گھر کی نمائندگی کررہی تھیں طفل کے جذبات اور ایک بیٹی کی محبت کا وہ ذوق و شوق کہ جس کے زیر اثر فاطمہؑ نے بار بار یہ اظہار کیا تھا کہ وہ ہرگز شادی نہ کریں گی۔ تاکہ انہیں اپنے باپ سے جدائی کا صدمہ نہ برداشت کرنا پڑے رفتہ رفتہ ایک عہد آگاہانہ میں بدل گیا تھا اس میں ذمہ داری اور مسؤلیت کی شان پیدا ہوگئی تھی۔

فاطمہ کی عمر کا ابتدائی دور اور بعثت رسولؐ اور اس کے رد عمل کے طور پر پیش آنے والی مصیبتوں کا ابتدائی دور ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہے اور فاطمہؑ محمدؐ کی تمام اولاد میں سختیوں کو جھیلنے مصائب کو برداشت کرنے اور اپنے والد کے بار رسالت کو سہارا دینے کی سب سے زیادہ اہل ہیں اور پھر وہ اپنی اس حیثیت اور سرنوشت کا پوری طرح شعور بھی رکھتی ہیں ان کے باپ اور ماں بھی اپنی اس چہیتی بیٹی کی حیثیت سے باخبر ہیں۔ اپنی زندگی کے بالکل آخری ایام میں ایک دن خدیجہ نے فاطمہؑ سے ان کے مستقبل کی بابت گفتگو کرتے ہوئے کہا

اے میری عزیز ترین بیٹی میری موت کے بعد خدا معلوم تجھے کن حالات کا سامنا کرنا پڑے۔ میری زندگی کا پیمانہ بس آج یا کل لبریز ہو جائے گا اور میں اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں گی۔ تیری دو بہنیں زینبؓ اور رقیہؓ اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ آسودہ زندگی گذار رہی ہیں ام کلثومؓ کی عمر اور اس کا زندگی کا تجربہ اتنا کافی ہے کہ میں اس کی طرف سے بے فکر ہوں۔ مگر اے میری دختر خورد سال اے فاطمہؑ مجھے یہ فکر پریشان کئے ہوئے ہے کہ میرے بعد تو سختی اور مصیبت کے طوفان میں گھر جائے گی اور تیرے درد و غم میں روز بروز اضافہ ہوتا جائے گا۔

اور فاطمہؑ نے جو اپنی اس حیثیت سے آگاہ تھیں کہ انہیں اپنے پدر بزرگوار کی عظیم اور صبر آزما ذمہ داریوں میں ان کا ہاتھ بٹانا ہے ان کے شانوں پر جو رسالتؐ کا سنگین بار ہے اسے ہلکا کرنا ہے بڑے اعتماد سے اپنی ماں کو یوں جواب دیا۔

مادر گرامی مطمئن رہیئے۔ میرے بارے میں غم نہ کیجئے۔ بت پرست قریش جس قدر چاہیں سرکشی کریں۔ جتنا ممکن ہو مسلمانوں کے اوپر مصیبت کے پہاڑ توڑیں ان کا ظلم و زیادتی کسی حد تک کیوں نہ بڑھ جائے۔ سچے دل سے اسلام قبول کرنے والے ان عظیم مصائب کو خندہ پیشانی سے قبول کریں گے اور میں سب سے زیادہ اس بات کی سزاوار ہوں کہ میں کفر و شرک کی ان ریشہ دوانیوں اور ایذا رسانیوں کا مقابلہ کروں مجھے

رسولؐ کی بیٹی ہونے کا شرف حاصل ہے اور مجھے رسولؐ کی وہ محبت اور توجہ حاصل ہے جو صرف میرے ساتھ مخصوص ہے اس اعتبار سے مجھ پر تمام سختیوں اور مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کی ذمہ داری ہر شخص سے زیادہ عائد ہوتی ہے اور میں اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے بخوشی تیار ہوں۔

ابوطالبؑ کے انتقال کے بعد دشمنوں کی دشمنی اور کینہ توزی اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ پیغمبرؐ کے اقارب واصحاب میں سے ایک گروہ نے حبشہ ہجرت کرکے وہاں پناہ حاصل کرلی دوسرا گروہ مکہ میں کفار کے ظلم وستم اور تشدد کا نشانہ بنا رہا۔

مسلمانوں پر کفار کی طرف سے ایذا رسانی کی شدت بڑھتی رہی چاروں طرف سے مصیبتوں کی یلغار میں اضافہ ہوتا رہا۔ پیغمبرؐ جن کی عمر کے پچاس سال گذر چکے ہیں اور جن کی زندگی مسلسل آلام ومصائب کی ضربات شدید کا نشانہ رہی ہے ایسے ہر طرف سے غم واندوہ میں گھرے ہوئے ہیں وہ تنہا اور بے یار ومددگار ہیں ایسے عالم میں ان کے دکھ درد کی ساتھی صرف ایک ہی ہستی ہے۔

ان کی چہیتی اور کم سن بیٹی فاطمہؑ۔

مگر نہیں۔ تقدیر نے اس گھر میں ایک بیٹے کو بھی داخل کر دیا ہے کوئی نہیں جانتا کہ قدرت مستقبل کے لیے کیا منصوبہ بنا رہی ہے۔

اس بیٹے کا نام علیؑ ہے۔

ہاں علیؑ خود اپنے باپ کے گھر میں پروان نہیں چڑھے۔ وہ آغاز طفولیت ہی سے فاطمہؑ کے ساتھ رہے ان کی پرورش اور تربیت پدر فاطمہؑ کے گھر میں ہوئی اس نوجوان کی تقدیر اس باپ اور بیٹی کی تقدیر سے عجیب طرح مربوط اور منسلک ہے۔ تاریخ اپنا کام کئے جا رہی ہے ایک بظاہر پرسکون مگر پراسرار اور پنہاں امکان دور کی آغوش میں ایک زبردست طوفان پرورش پا رہا ہے مستقبل میں جب یہ طوفان برپا ہوگا تو تمام بت ٹوٹ جائیں گے۔ پتھروں کے بت طبقاتی تضاد کے بت، نسلی افتخار کے بت، اشرافیت اور قومیت کے بت، اقتصادی گروہ

بندی اور طبقہ واریت کے بت سب ریزہ ریزہ ہوجائیں گے۔ آتش کدۂ ایران میں درباری روحانیت کی آتش پر فریب سرد پڑجائے گی مدائن کے بلند و بالا قصر کے کنگرہ زمین بوس ہوجائیں گے۔

روم کی استبدادی حکومت جس کی بنیاد انسانوں کے خون پر رکھی گئی ہے درہم برہم ہوجائے گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ لوگوں کے دل و دماغ سے وہ زنگ دھل جائے گا جو صدیوں کی بوسیدہ روایات، کہنہ عادات، بے معنی خرافات، اساطیری روایات کا نتیجہ ہے۔ تعصب جہالت، ہوس، جذبات اور انسان دشمن عقائد و خیالات نے جو قدریں تراشی ہیں اور بزرگی اور افتخار کے جو پیمانہ مقرر کئے ہیں وہ سب درہم و برہم کر دیئے جائیں گے اور ایک ایسی فضائے تاریک میں جو خاندان، نسل طبقہ واریت اشرافیت، طاقت، تشدد اور غارت گری سے آلودہ ہے اور جہاں خاک و خون اور بتوں کی پرستش کی جاتی ہے آزادی اور مساوات اور عدالت اور جہاد اور خود آگاہی کی موجیں نمودار ہوکر ہر نقش کہن اور ہر قدیم پارینہ کو مٹا دیں گی عوام۔ گمنام، بے حیثیت اور بے اعتبار عوام ناخدایانِ زمین کے اقتدار کو جو ہمیشہ سے عوام کی گردنوں پر مسلط رہا ہے خاک میں ملادیں گے۔ تاریخ ماضی کے افسانوں کے بدلے حال و مستقبل کی حکایت بن جائے گی اس میں بوسیدہ ہڈیوں، فرسودہ قبروں، اور دولت اور طاقت کے افسانوں کی جگہ زندگی، حرکت تغیر اور انقلاب کا رنگ آجائے گا اب تاریخ تیغ اور طلا یعنی طاقت اور دولت کی حکایت نہیں رہے گی۔ ایک نئی تاریخ کا آغاز ہوگا۔ انقلابی تاریخ جو عوام کے جوش، حرکت، اور ذوق عمل سے عبارت ہوگی اس انقلابی تاریخ کا سلسلہ ان لوگوں سے شروع ہوگا جن کا تعلق طبقہ عوام سے نہیں بلکہ طبقہ عوام سے ہے یہ وہ گلہ بان ہیں جو انقلاب کے داعی ہیں ان میں ایک عظیم رسولؐ کو مبعوث کیا گیا ہے اور انہیں اقوام عالم تک اس پیغام کو پہنچانے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے یہ چوپایان مبعوث ہیں جن میں سے ہر ایک کے جسم پر شہادت کی قبا اور سر پر فقر کا تاج ہے ان کی زندگی یا میدانِ جنگ

میں بسر ہوتی ہے یا تعلیم خلق کے مشغلہ میں گذرتی ہے یا پھر وہ زندانِ ستم میں قید کے دن گذارتے ہیں تاریخ کے اس عظیم انقلاب کے داعی رسولؐ ہیں لیکن ایثار، فداکاری، قربانی اور شہادت کی اس عظیم تاریخ کا نکتہ آغاز فاطمہؑ ہیں۔ اور اس تاریخ کو حرکت، توانائی، تسلسل اور اعتبار بخشنے کے لیے بہرحال علیؑ کی ضرورت ہے۔

یہی سبب تھا کہ فقر کی زحمت نے رحمت کی شکل اختیار کر کے ابوطالب کے کم سن بیٹے کو آغازِ طفولیت ہی میں اپنے باپ کے گھر کی بجائے اپنے ابن عم زاد کے گھر منتقل کر دیا تاکہ اس بچے کی روح جاہلیت کی آلودگی سے ہر طرح پاک رہے تاکہ جس وقت وحی کا نزول ہو وہ سب سے پہلے اس پیغام کو سن سکے تاکہ آغازِ بعثت کے لمحہ ہی سے وہ ہر طرح کے حوادث اور آفات، ہر طرح کے رنج و مصیبت اور ہر طرح کی سختی اور کشاکش کے مقابلہ کی تربیت حاصل کر سکے تاکہ وہ ہجرت کے خطرناک موقعہ پر اپنی بے مثال ذمہ داری کو پورا کر سکے تاکہ وہ بدر، احد، خیبر، اور حنین کے معرکوں کو سر کر سکے تاکہ اس کی تلوار اور اس کی شجاعت اسلام کی انقلابی تحریک کی کامیابی کی علامت بن سکے تاکہ وہ فاطمہؑ کے ساتھ تربیت پا کر پروان چڑھ سکے تاکہ وہ بالآخر فاطمہؑ کی رفاقت میں انسانیت کا ایک خاندانِ مثالی کو تشکیل دے سکے اور سنتِ ابراہیمیؑ کو مداومت عطا کر کے تاریخ میں ایک نئے انقلابی دور کے آغاز اور تسلسل کی بنیاد رکھ سکے۔

ہجرت

مکی زندگی کے تیرہ سال پورے ہو چکے اس تمام مدت کا ایک ایک لمحہ سختی مصیبت، کشمکش اور صعوبت کی داستان ہے۔ فاطمہؑ آغاز طفولیت ہی سے ان آلام و مصائب کی زد پر رہی ہیں۔ شہر ہو، گھر ہو یا شعب ابی طالبؑ کا حصار وہ ہر جگہ اپنے پدر بزرگوار کے قدم بہ قدم دور جاہلیت کی وحشت آمیز مخالفت اور اس مخالفت کی سختیاں اپنی جان ناتواں پر جھیلتی رہی ہیں اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے عظیم المرتبت مگر تنہا پدر بزرگوار کی غم خواری اور کسی ماں کی طرح ان کی دیکھ بھال کا فریضہ بھی انجام دیتی رہی ہیں۔

ہجرت کا آغاز ہو چکا ہے مسلمانوں کے گروہ مدینہ جا چکے ہیں فاطمہؑ کی بہن رقیہ جو اپنے شوہر عثمان کے ساتھ پہلے حبشہ کی طرف ہجرت کر چکی تھیں اب مدینہ روانہ ہو چکی ہیں۔ بالآخر خود پیغمبرؐ اور ان کے ساتھ ابو بکر رات کی تاریکی میں مکہ سے ہجرت کر چکے پھر فاطمہؑ اور ان کی بہن ام کلثوم بھی مکہ روانہ ہو گئیں' ناگہاں قریش کا ایک مفسد اور شر پسند شخص جو پیغمبرؐ کو آزار پہنچانے میں بہت پیش پیش رہتا تھا ان تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور انہیں تشدد کا نشانہ بناتا ہے یہاں تک کہ یہ سواری سے زمین پر گر جاتی ہیں۔

فاطمہؑ جو کمزور اور لاغر اندام تھیں اور جنہیں تین سالہ قید کی صعوبت اور زحمت نے مزید کمزور اور لاغر کر دیا تھا اس حادثہ سے شدید طور پر متاثر ہوئیں مدینہ تک کا تمام طویل راستہ انہوں نے شدید درد اور تکلیف کی حالت میں طے کیا حویرث بن نقیذ کی اس کمینہ حرکت نے تمام مسلمانوں بالخصوص پیغمبرؐ اور علیؑ کو اس قدر اذیت پہنچائی کہ اس واقعہ کے آٹھ سال بعد فتح مکہ کے موقع پر اس کی اس حرکت کو بھلایا نہیں جا سکا اور اس کا نام ان لوگوں کی فہرست میں شامل تھا جن کا خون مباح کر دیا گیا تھا باوجودیکہ پیغمبرؐ نے مکہ میں خونریزی سے پرہیز کا عمومی حکم دیا تھا

اور اس حکم پر شدت سے عمل کرایا گیا تھا لیکن اس کینہ فطرت شخص کے بارے میں یہ حکم دیا تھا کہ اگر وہ خانۂ کعبہ کے پردے سے بھی لپٹا ہوا ہو تو بھی اسے قتل کر دیا جائے۔

اور یہ محض اتفاقی حادثہ نہیں ہے کہ پیغمبرؐ کے اس حکم کی تعمیل علیؑ کے ہاتھوں سے ہوئی۔

دورِ مدینہ

اب مدنی زندگی کا آغاز ہو چکا ہے۔ پیغمبرؐ نے مسجد کی بنیاد رکھی ہے اور اس کے پہلو میں چھوٹا سا گھر تعمیر کیا ہے اس گھر کی تعمیر کھجور کے پتوں، شاخوں اور اسی طرح کے ساز و سامان سے کی گئی ہے۔

اس کے بعد عہد مواخات کی رسم ادا کی جاتی ہے خدا کی راہ میں دو انسانوں کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا جاتا ہے۔

جعفر بن ابوطالبؑ کو ان کی عدم موجودگی میں معاذ بن جبل کا بھائی بنایا جاتا ہے ابوبکر کو خارجہ بن زہیر کا عمر بن خطاب کو عتبان بن مالک کا اور عثمان کو اوس بن ثابت کا بھائی قرار دیا گیا۔

جب پیغمبرؐ تمام لوگوں کو ایک دوسرے کا بھائی بنا چکے تو آپؐ نے فرمایا کہ "میرا بھائی یہ علیؑ ہے" عہد مواخات کی رو سے محمدؐ اور علیؑ بھائی بھائی قرار پائے۔

اس طرح ایک بار پھر تمام لوگوں میں علیؑ محمدؐ سے خصوصی قربت اور یگانگت سے سرفراز ہوئے۔ علیؑ کو محمدؐ سے ایک اور تعلق کا شرف عطا کیا گیا۔ علیؑ کی ماں، فاطمہؑ بنت اسد محمدؐ کی پرستار اور خدمت گذار ہیں، علیؑ کے باپ ابوطالبؑ محمدؐ کے حامی و ناصر اور ان کے محافظ تھے۔ محمدؐ علیؑ کے گھر میں پروان چڑھے اور علیؑ نے خانۂ محمدؐ میں پرورش پائی۔ وہ فاطمہؑ کے ہمراہ تربیت پاتے رہے وہ پیغمبرؐ کے سایے میں پلے اور فاطمہؑ کی ماں خدیجہؑ کی آغوشِ عاطفت میں پروان چڑھے۔ وہ محمدؐ کے

عم زاد بھی تھے اور بہ مثل ان کے فرزند بھی تھے اب وہی علیؑ، محمدؐ کے بھائی قرار پائے
مگران سب باتوں کے باوجود ابھی ایک اور منزل باقی ہے سب سے اہم اور آخری منزل جس کے بعد علیؑ اس مقام کمال تک پہنچ جائیں گے جو قدرت کی طرف سے ان کے لیے مقرر کیا جا چکا ہے اور جس کا سرگذشت محمدؐ اور تاریخ سربلندیٔ اسلام سے بڑا گہرا اور بنیادی اور خصوصی تعلق ہے۔

عقدِ فاطمہؑ

فاطمہؑ نے طفلی میں اپنے پدر بزرگوار کا ساتھ نہ چھوڑنے کا جو عہد کیا تھا اس پر پورے خلوص سے قائم ہیں۔ وہ خانۂ پدر میں اطمینان اور سکون سے مقیم ہیں۔ ہر شخص اس بات سے باخبر ہے جب سے پیغمبرؐ نے ابوبکر اور عمر کی خواستگاری کو صریحی طور پر رد کر دیا ہے تمام اصحاب پر یہ بات روشن ہو گئی ہے کہ فاطمہؑ کا عقد ایک خصوصی نوعیت کا معاملہ ہے اور پیغمبرؐ اپنی بیٹی سے مشورے کے بغیر اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کریں گے۔

فاطمہؑ علیؑ کے ساتھ ساتھ پلی بڑھی ہیں ان کی نظروں میں علیؑ ایک عزیز بھائی اور ان کے پدر بزرگوار کے عاشق اور شمعِ رسالتؐ کے پروانے کی حیثیت رکھتے ہیں قدرت نے ان دونوں کی تقدیر کو عہد طفلی ہی سے ایک دوسرے سے مربوط کر دیا ہے اور یہ ربط اور تعلق بہت ہی خاص اور امتیازی نوعیت رکھتا ہے دونوں میں سے کسی ایک کو بھی جاہلیت کی آلودگی نے مس نہیں کیا دونوں کی عمر کا ابتدائی حصہ بعثت کے طوفانی دور میں گذرا اور دونوں وحی کے نور کی آغوش میں پروان چڑھے۔

فاطمہؑ علیؑ کی نسبت کیا احساسات و جذبات رکھتی ہیں اور علیؑ کا شجاعت اور محبت سے لبریز دل فاطمہؑ کو کس حیثیت میں دیکھتا تھا اس کے متعلق سوچا تو جا سکتا ہے مگر اس کے بیان سے الفاظ قاصر ہیں۔

ان تہہ در تہہ احساسات کو الفاظ میں کس طرح ڈھالا جا سکتا ہے جن کی ترکیب میں ایمان، عشق، حرمت، ستائش، مہر خواہر و برادر، اشتراک عقیدہ اور روحانی یگانگت جیسے عناصر شامل ہیں۔ ان دونوں نے ایک ساتھ دکھ درد جھیلے ایک ساتھ مصیبتیں اٹھائیں۔ ان کا عقیدہ اور ان کی سرگزشت مشترک ہے۔ یہ راہِ حیات میں ایک دوسرے کے ہم سفر ہیں۔ قدم بہ قدم، لحظہ بہ لحظہ انہوں نے زندگی کا سفر ایک ساتھ طے کیا اور یہ دونوں (علیؑ و فاطمہؑ) ایک ہی سرچشمۂ ہدایت ورحمت سے فیضیاب ہوئے۔

پس علیؑ خاموش کیوں ہیں۔ وہ عمر کی پچیس منزلیں طے کر چکے ہیں اور فاطمہؑ اب نو سال یا براویتے دیگر ۱۹ سال کی ہیں۔

میرے خیال میں علیؑ کی خاموشی کے اسباب واضح ہیں۔ فاطمہؑ نے خود کو پیغمبرؐ کے لیے وقف کر دیا ہے۔ . . . وہ اپنے پدر بزرگوار سے اس قدر متعلق ہیں کہ کوئی انہیں ان سے جدا نہیں کر سکتا۔ علیؑ کے لیے یہ کیسے ممکن ہوگا کہ وہ فاطمہؑ کو اس گھر سے کسی دوسرے گھر منتقل کرنے کی سبیل کر سکیں، وہ انہیں محمدؐ سے کیسے جدا کر سکتے ہیں۔ علیؑ تو خود اس باب میں اسی طرح سوچتے ہیں جس طرح فاطمہؑ۔ انہیں بھی پیغمبرؐ کی خدمت، دلدہی اور آرام رسانی کی اسی قدر فکر ہے جتنی رسولؐ کی بیٹی فاطمہؑ کو۔ اس لیے علیؑ فاطمہؑ کو پیغمبرؐ سے طلب کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں وہ خاموش ہیں۔

ناگہاں صورتحال بدلنے لگتی ہے۔ عائشہ خانۂ پیغمبر میں آچکی ہیں پیغمبرؐ نے اپنی تمام زندگی میں پہلی اور آخری بار کسی ایسی شریکِ حیات کو منتخب کیا ہے جو جوان ہے اور اس کے جذبات و احساسات بھی جوان ہیں۔

فاطمہؑ کو رفتہ رفتہ یہ احساس ہو گیا کہ ان کے پدر بزرگوار کی جوان زوجہ رسولؐ کے دل میں نہ سہی مگر ان کے گھر میں خدیجہؑ اور خود فاطمہؑ کی جگہ حاصل کر رہی ہے علیؑ کو بھی یہ احساس ہو رہا ہے کہ قدرت نے جو لمحہ مقرر کیا تھا وہ آن پہنچا

ہے ۔ مگر علیؑ کے پاس مال دنیا سے کچھ نہیں ہے وہ جوان جو خانۂ رسولؐ میں چھوٹے سے بڑا ہوا اور جس نے اپنی نوجوانی کا تمام عہد اپنے عقیدہ اور عقیدے کے لیے جہاد میں گزارا ہے جسے یہ فرصت ہی نہیں ہے کہ وہ عقیدہ اور ایمان سے ہٹ کر کسی اور طرف دیکھے ۔ کار دنیا کی طرف متوجہ ہو یا دولت دنیا میں سے کچھ حاصل کرے ۔ اس کا کل سرمایۂ حیات محمدؐ اور دین محمدؐ کے لیے جذبۂ فداکاری ہے اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی سرمایہ نہیں ہے ۔ سرمایہ کا کیا ذکر اس کے پاس تو سر چھپانے کے لیے کوئی گھر بھی نہیں ہے اور جب گھر ہی نہیں ہے تو گھر کا ساز و سامان کہاں سے ہوگا۔

اس کے باوجود ایک دن علیؑ پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں ان کے سامنے خاموش سر جھکا کر بیٹھ جاتے ہیں ۔ پیغمبرؐ ان کے سکوت اور شرم کی کیفیت کو دیکھ کر سوال کرتے ہیں۔

اے پسر ابو طالبؑ تمہیں مجھ سے کیا کام ہے؟

علیؑ ایک ایسے لہجہ میں جو حیا ، نرمی اور لطافت کا آئینہ دار ہے ۔ دختر رسولؐ فاطمہؑ کی خواستگاری کا اظہار کرتے ہیں ۔

- پیغمبرؐ اس درخواست کو سن کر بے ساختہ فرماتے ہیں
- مرحبا و اہلاً (بہت خوب ، خدا مبارک کرے)
- دوسرے دن وہ مسجد میں علیؑ سے سوال کرتے ہیں۔
- تمہارے پاس کچھ مال و متاع ہے ۔
- نہیں ! اے اللہ کے رسولؐ کچھ بھی نہیں۔
- وہ زرہ جو میں نے جنگ بدر کے موقع پر تمہیں دی تھی کیا ہوئی
- وہ میرے پاس ہے اے اللہ کے رسولؐ
- اسے لے آؤ
- علیؑ گئے اور بہ عجلت اس زرہ کو لا کر رسولؐ کی خدمت میں پیش کر دیا۔

پیغمبرؐ نے ارشاد فرمایا اسے فروخت کر دو اور اس سے جو قیمت حاصل ہو اس سے اپنے عقد کے لیے سامان مہیا کر لو۔

عثمان نے یہ زرہ ۴۷ درہم میں خرید لی

پیغمبرؐ نے اصحاب کو جمع کیا۔ تقریب عقد منعقد ہوئی۔ حضورؐ نے خطبہ خود ارشاد فرمایا۔

فاطمہؑ دختر رسولؐ کا نکاح علیؑ سے ہو گیا۔

اس کے بعد حضورؐ نے دعا فرمائی۔ پروردگار ان کو صالح ذریت عطا کر۔ پھر خرمے تقسیم کئے گئے اور اس طرح جشن عروسی کی تقریب اختتام کو پہنچی۔

فاطمہؑ اسلام کے عظیم پیغمبرؐ کی سب سے چہیتی بیٹی فاطمہؑ کا مہر کیا تھا چار سو مثقال چاندی اور آپ کے جہیز کی صورت کیا تھی۔ ایک چکی۔ ایک لکڑی کا پیالہ اور ایک اونی کمبل۔

در آغاز محرم سال دوم ہجری، علیؑ بیرون شہر مدینہ، مسجد قباء کے نزدیک ایک گھر کا بندوبست کرتے ہیں اور فاطمہؑ اپنے باپ کے گھر سے رخصت ہو کر شوہر کے گھر منتقل ہو جاتی ہیں۔

سید الشہداء حمزہؑ جو مجاہدین کے سرخیل اور جو پیغمبرؐ کے چچا ہیں دو اونٹ ذبح کر کے اہل مدینہ کی دعوت کرتے ہیں۔

پیغمبرؐ نے ام سلمہؓ سے کہا کہ وہ علیؑ کے گھر تک دلہن کی ہمراہی کریں بعد ازاں بلال نے عشاء کی اذان دی پیغمبرؐ نماز ادا فرمانے کے بعد علیؑ گھر تشریف لے گئے ایک برتن میں پانی طلب کیا۔ کچھ آیاتِ قرآنی کی تلاوت فرمائی پھر حکم دیا کہ دلہا اور دلہن اس کاسۂ آب میں سے پانی نوش کریں اس کے بعد آپؐ نے اس پانی سے وضو فرمایا اور ان دونوں کے سروں پر وہ پانی چھڑکا پھر جب آپؐ نے واپسی کا ارادہ فرمایا تو فاطمہؑ شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر رونے لگیں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اپنے باپ سے جدا ہو رہی تھیں۔

پیغمبرؐ نے نہایت شفقت اور محبت سے انہیں تسلی دی اور فرمایا۔
میں نے تمہارا ہاتھ ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں دیا جو ایمان کے اعتبار سے سب سے افضل ہے۔ جس کا علم سب کے علم سے زیادہ ہے۔ جس کا اخلاق تمام لوگوں کے اخلاق سے بلند تر ہے اور جس کی روح تمام تر روحوں سے زیادہ پاکیزہ اور لطیف ہے۔

جہد حیات کا نیا دور

عقد اور رخصتی کے بعد بضعۃ الرسولؐ کی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ لیکن تقدیر نے انسانیت کی اس عظیم ترین ہستی کے لیے اس دور نو کے آغاز کی نشانی کے طور پر رنج و مصیبت کے نئے تحفے فراہم کئے ہیں۔

فاطمہؑ جن کی زندگی آغاز طفولیت ہی سے آلام و مصائب کا شکار رہی ہے جو اپنے باپ کے گھر میں فقر و فاقہ اور تنگی کے ماحول میں پل کر جوان ہوئی ہیں اب خانۂ علیؑ میں منتقل ہو گئی ہیں۔ جس کا اثاثہ دولت عشق و فقر کے سوا اور کچھ نہیں ہے خانۂ علیؑ میں زندگی کے آزمائشی دور کا آغاز ہو چکا ہے۔ مگر یہاں فاطمہؑ پہلے سے زیادہ آزمائشی حالات سے دوچار ہیں۔ یہاں بھی ان پر وہ تمام ذمہ داریاں ہیں جنہیں وہ اپنے باپ کے گھر میں پورا کرتی رہی ہیں مگر اب یہ ذمہ داریاں علیؑ کے حوالے سے ہیں۔ علی جو چشم فاطمہؑ میں کل تک ایک بھائی کی حیثیت رکھتے تھے اور آج ان کے رفیق حیات ہیں۔ فاطمہ اچھی طرح جانتی ہیں کہ علی کی زندگی ہمیشہ اسی فقر و فاقہ میں گذرے گی اس لیے کہ انہیں خدا کی راہ میں جہاد، حقوق اللہ اور حقوق العباد کے علاوہ اور کسی بارے میں سوچنے کی مہلت ہی نہیں ہے وہ کبھی ایسی حالت میں گھر نہیں لوٹے کہ ان کے ہاتھ خالی نہ ہوں۔ فاطمہؑ کی ذمہ داریاں خانۂ رسولؐ کے مقابلے میں کچھ زیادہ بڑھ گئی ہیں اب وہ خانۂ علیؑ میں ہیں یہ ان کا اپنا گھر ہے۔ اس گھر کے تمام مسائل کی وہ براہ راست ذمہ دار ہیں اور ان کے شوہر کی

کیفیت یہ ہے کہ ان کی تہی دستی ان کی خوش بختی پر غالب ہے اور وہ متاعِ حیات سے زیادہ مقصدِ حیات کے بارے میں فکر کرتے ہیں۔

فاطمہؑ خود چکی پیستی ہیں خود روٹی پکاتی ہیں گھر کے اندر تمام کام اپنے ہاتھوں سے انجام دیتی ہیں۔ بارہا یہ بھی دیکھا گیا کہ وہ .. باہر سے پانی بھر کر لا رہی علیؑ جو فاطمہؑ کی عظمت و جلالت سے واقف ہیں۔ جو ہمیشہ انہیں احترام اور محبت کی نظر سے دیکھتے رہے جو اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ بچپنے سے آج تک فاطمہؑ نے جو سختیاں جھیلی ہیں اور جو مصیبتیں اٹھائی ہیں ان کے نتیجہ میں وہ بہت کمزور اور ناتواں ہو چکی ہیں اب اپنے گھر میں انہیں اس قدر محنت اور مشقت کرتے ہوئے دیکھتے تو ان کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔

ایک روز علیؑ نے ہمدردی اور غم گساری کے لہجہ میں کہا۔

"زہراؑ، تم اس قدر زحمت اور مشقت برداشت کرتی ہو کہ میرا دل تڑپ اٹھتا ہے خدا نے (فتوحات کے نتیجہ میں) مسلمانوں کو بہت سے خدمت گار عطا کئے ہیں کسی دن خدمتِ رسولؐ میں حاضری دیکر انہیں سے ایک خادم اپنے لیے طلب کر لو"

فاطمہؑ اپنے باپ کی خدمت میں حاضری دیتی ہیں۔

بتاؤ۔ اے میری پیاری بیٹی تمہیں کیا کام ہے

بس آپ کے سلام کے لیے آئی تھی۔

فاطمہؑ یہ کہہ کر واپس چلی گئیں۔ واپسی پر انہوں نے علیؑ سے کہا مجھے اپنے باپ سے کوئی سوال کرتے ہوئے شرم دامن گیر ہوتی ہے" ——————

—————— فاطمہؑ اور علیؑ پھر رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس بار علیؑ نے فاطمہؑ کی طرف سے سوال کیا۔ مگر پیغمبرؐ نے بلا تردد دو ٹوک جواب دیدیا نہیں بخدا نہیں۔ اسیرانِ جنگ میں سے کسی ایک فرد کو بھی تمہیں نہیں

دے سکتا۔ اہل صفہؓ بھوک کا شکار ہیں اور میرے پاس ان کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہے میں ان غلاموں کو فروخت کر کے اس سے جو رقم حاصل ہوگی وہ اہل صفہ کی شکم سیری کے لیے خرچ کروں گا۔

علیؑ اور فاطمہؑ پیغمبرؐ کا یہ جواب سن کر ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور خالی ہاتھ لوٹ آتے ہیں۔

رات ہو چکی ہے اور دونوں (خاوند اور بیوی) اپنے بے سروسامان گھر میں آرام کرنے کے لیے لیٹ چکے ہیں مگر دونوں کے ذہن اسی سوال کے متعلق سوچ رہے ہیں جو آج انہوں نے پیغمبرؐ سے کیا۔

اور پیغمبرؐ بھی تمام دن اسی بارے میں غور فرماتے رہے کہ انہوں نے اپنی محبوب ترین ہستیوں کے سوال کا کیا جواب دیا۔

ناگہاں خانۂ علیؑ کا دروازہ باز ہوتا ہے۔ پیغمبرؐ اندر داخل ہوتے ہیں۔

رات نہ صرف تاریک ہے بلکہ بے انتہا سرد بھی ہے اس قدر سرد کہ علیؑ اور فاطمہؑ کانپ رہے ہیں پیغمبرؐ نے دیکھا کہ ان دونوں کے پاس سردی کے تدارک کے لیے صرف ایک معمولی سا کپڑا ہے اور وہ بھی اس قدر چھوٹا کہ اگر اس سے یہ اپنے سروں کو ڈھکیں تو پیر کھل جاتے ہیں اور اگر پیروں کو ڈھکیں تو سر کھل جاتا ہے۔

پیغمبرؐ نے محبت بھرے لہجہ میں ارشاد فرمایا

اپنی جگہ سے اٹھنے کا تکلف مت کرو۔

پھر آپؐ نے فرمایا۔

کیا تم نہیں چاہتے کہ میں تمہیں ایک ایسی چیز عطا کروں جو اس چیز سے بدرجہا بہتر ہے جس کی بابت تم نے مجھ سے سوال کیا تھا۔

۱ؕ اہل صفہ میں وہ مہاجر اصحاب شامل تھے جن کا مدینہ میں کوئی گھر نہیں تھا وہ مسجد نبویؐ کے چبوترہ پر رات بسر کرتے تھے اصحاب صفہ کا شمار نیک اور پاکیزہ لوگوں میں ہوتا ہے اور ان میں ابوذرؓ اور سلمانؓ جیسی ستودہ صفات ہستیاں شامل تھیں۔

دونوں نہایت اشتیاق آمیز لہجہ میں پوچھتے ہیں وہ کیا چیز ہے اے اللہ کے رسولؐ۔

یہ وہ کلمات ہیں جو جبریل نے مجھے بطور خاص سکھائے ہیں۔ ہر نماز کے بعد دس بار سبحان اللہ دس بار الحمد للہ اور دس بار اللہ اکبر پڑھ لیا کرو اور جب اپنے بستر پر سونے لیٹو تو چونتیس۳۴ بار تکبیر اور تینتیس۳۳ بار حمد اور تینتیس۳۳ بار تسبیح پڑھا کرو

فاطمہؑ نے ایک بار پھر یہ سبق حاصل کیا ایک بار پھر ایک ضرب نرم کے ذریعے جوان کی روح کی گہرائی تک اتر گئی۔ انہوں نے یہ دریافت کر لیا کہ "وہ فاطمہؑ ہیں"

فاطمہؑ اس سبق سے اچھی طرح واقف ہیں انہیں بچپن سے اس حقیقت کا احساس ہے مگر یہ ایک ایسی زبردست حقیقت ہے جسے بار بار اور مسلسل یاددلانا ضروری ہے یہ وہ سبق ہے جس کا تعلق علم و دانش سے نہیں ہے بلکہ یہ اپنی زندگی کو بنانے (شدن) کا درس ہے۔ یہ فاطمہؑ بننے کا سبق ہے (فاطمہ شدن) یہ آسان بات نہیں ہے۔ یہ وہ امانت ہے کہ جس کے لیے بے اندازہ بلندیوں تک سفر کرنا ہوگا۔

ـــــــــ فاطمہؑ کو علیؑ کے ساتھ ساتھ گام بہ گام بلندی کی طرف سفر کرنا ہوگا علیؑ کی عظمت اور ان کی آزمائش میں شریک ہونا پڑے گا۔ تاریخ آزادی وجہاد میں تاریخ انسانیت میں علیؑ کی ذمہ داری بہت عظیم اور بڑی صبر آزما ہے اور فاطمہؑ اس ذمہ داری میں علیؑ کی شریک اور سہیم ہیں یہ اس زنجیر نور کی درمیانی کڑی ہیں جو ابراہیمؑ سے محمدؐ تک کے سلسلہ کو حسینؑ اور ان کی اولاد میں ہونے والے آئمہ سے مربوط کرتی ہیں یہ امام منتقم تک انسانیت کی تاریخ کو ایک لڑی میں پرونے کا ذریعہ ہیں یہ نبوت اور امامت کے ربط و اتصال کا واسطہ ہیں۔

یہ تھا فاطمہؑ کا مرتبہ اور مقام اور ان بلند مقامات کے اعتبار سے ان کی ذمہ داریاں بھی بہت عظیم تھیں۔ مگر ان سب مراتب اور درجات کے ساتھ ہی سب سے بڑی حقیقت، حیرت انگیز اور تعجب خیز اقدار کی آئینہ دار حقیقت یہ ہے کہ فاطمہؑ کے فاطمہ ہونے (فاطمہ بودن) کی بات اس قدر بڑی اور اہم ہے کہ جو

پیغمبرؐ کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ اپنے اس "خصوصی شاگرد اور غیر معمولی صحابی" کی تعلیم و تربیت کے بارے میں سخت گیری کا رویہ اختیار کریں۔ آرام و سکون کا کوئی ایک لحظہ بھی ان کا مقدر نہیں بن سکتا اس لیے کہ ایسے لمحات ان کی تعمیر شخصیت فاطمہؑ کے فاطمہؑ بننے کی راہ میں رکاوٹ ہوتے ہیں یہ وہ درخت ہے جس کے لیے رنج اور محرومی آب و خاک کی حیثیت رکھتے ہیں یہ نور وحی کے سائے میں پروان چڑھتا ہے اور اس میں آزادی اور عدالت کے ثمر آتے ہیں۔ ان کی ہستی اس شجرہ طیبہ کی مانند ہے جس کی ہر شاخ اس بات پر مامور ہے کہ پرومیتھیس کی طرح آسمان سے آتش خدائی کو حاصل کر کے اسے باشندگان زمین تک پہنچاتے ہیں۔ اس نسل کا ہر فرد 'اطلس حقیقی' کی طرح بار زمین اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے۔

یہی وجہ ہے کہ فاطمہؑ کو مسلسل نگہداری اور تربیت کی ضرورت ہے جس طرح درخت کو ہمیشہ روشنی ہوا، اور غذا کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ ضرورت کبھی ختم نہیں ہوتی اسی طرح منصب فاطمہ کا تقاضا ایک مسلسل اور کبھی ختم نہ ہونے والی تربیت ہے۔

پیغمبرؐ نے اپنی بیٹی اور داماد کو بجائے خدمت گار "کلمات" تعلیم کیے تمام دنیا میں یہی وہ عجیب و غریب جوڑا ہے۔ جو اس بات کا شعور رکھتا ہے کہ 'کلمہ' زندگی کے لیے کیا اہمیت رکھتا ہے یہ پیغمبرؐ کے کلمہ عطا کرنے پر مسرور ہیں اسے اپنی خوش بختی سمجھتے ہیں یہی ان کا آب و طعام ہے اور اسی کے سہارے یہ اپنی زندگی گذارتے ہیں۔ اس کلمہ نے ان کی روح کو سیراب کر دیا ہے۔ ان کلمات کی مثال ایک ایسی بارش نور و رحمت کی سی ہے جو مسلسل برس رہی ہے اور صرف یہی دو برگزیدہ ہستیاں انسانیت کے یہی بلند ترین نمونہ وہ نہال ہیں جو اپنی تشنگی کو اس سے بجھانے کے اہل اور سزاوار ہیں وہ اس بارش نور و رحمت کو اپنے رگ و ریشہ میں جذب کر رہے ہیں ان کی آب و غذا یہی ہے۔ اس رات کے سکوت میں محمدؐ کی ندائے ناگہانی ان کے لیے گلبانگ حیات و رحمت کی حیثیت رکھتی تھی

گویا یہ آواز کہہ رہی ہو:

بانگ آیم من بگوشِ تشنگان   ہمچو باراں می رسم از آسماں

برجہ ای عاشق برآور اضطراب   بانگ آب و تشنہ و آنگاہ خواب

اور تمام روئے زمین پر ان دونوں ہستیوں سے بڑھ کر تشنہ اور عاشق اور کون ہے۔

یہ بات بے معنی نہیں ہے کہ علیؑ نے جو مردِ جہاد و عمل ہیں اور جن کی زندگی مسلسل سعی و عمل سے عبارت ہے اور جن کے لیے ذکر اور ورد محض ایک رسم و عادت یا زبانی جمع خرچ نہیں ہے اس واقعہ کے پچیس سال بعد یہ اعلان کرتے ہیں۔

"خدا کی قسم جس دن سے مجھے ان کلمات کی تعلیم دی گئی ہے آج تک میں نے کبھی ان کا ورد ترک نہیں کیا"

لوگوں نے حیرت اور استعجاب سے پوچھا کیا صفین کی خونیں رات میں بھی علیؑ نے بڑے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ کہا۔ ہاں صفین کی اس آزمائشی اور خطرناک رات میں بھی میں اس وظیفہ سے غافل نہیں رہا اور فاطمہؑ نے بھی تمام زندگی اس سبق کو یاد رکھا یہ کلمات ان کی زندگی بن گئے ان کلمات سے ان کا تعلق اس قدر گہرا اور ہمہ گیر ہے کہ تسبیحات ان کے نام سے موسم ہیں "تسبیح فاطمہؑ"

یہ وہ آسمانی کلمات ہیں جو بجائے خدمتگاران کا موز ندگی میں ان کی مدد کرتے ہیں اور یہ وہ کلمات ہیں جنہیں "ہدیۂ عروسی" کے بطور پیغمبرؐ نے اپنی بیٹی کو عطا کیا تھا۔

رسولؐ خود ان کے گھر تشریف لائے اور ان کی آمد کا مقصد محض انہی کلمات کو تعلیم فرمانا تھا انہوں نے یہ کلمات عطا کئے اور واپس چلے گئے۔

پیغمبر فاطمہؑ سے جس قدر محبت کرتے تھے اسی قدر ان کی تربیت میں سختی سے کام لیتے تھے انہوں نے یہ رویہ سنتِ الٰہی سے اخذ کیا تھا۔ قرآن کا مطالعہ کرنے سے

اندازہ ہوتا ہے کہ کسی پیغمبرؐ کی تنبیہ و انتقاد میں اس قدر شدت نہیں برتی گئی۔ جس قدر شدت پیغمبرؐ اسلام کے ساتھ روا رکھی گئی اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی پیغمبرؐ خدا کے نزدیک ان کی طرح محبوب اور پسندیدہ نہیں ہے اور نہ کسی اور پیغمبرؐ پر خلق خدا کی ہدایت کی اس قدر عظیم اور ہمہ گیر ذمہ داری عائد کی گئی ہے۔

ایک روز پیغمبرؐ حسب معمول خانۂ فاطمہؑ میں تشریف لائے، ناگہاں آپ کی نظر دروازے پر آویزاں پردے کی طرف اٹھی پردہ نقش دار تھا۔ پیغمبرؐ کے ابرو غصہ کی حالت میں کشیدہ ہو گئے آپؐ نے زبان سے کچھ نہ کہا مگر فوراً واپس تشریف لے گئے

فاطمہؑ اپنے باپؐ کے اشارہ چشم و ابرو کو خوب سمجھتی تھیں انہوں نے یہ محسوس کر لیا کہ رسولؐ کو کیا بات ناگوار گذری ہے اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ اس ناراضگی کا ازالہ کس طرح کیا جا سکتا ہے انہوں نے فوراً دروازے سے پردے کو اتارا تاکہ وہ اسے فروخت کر دیں اور اس کی قیمت مدینہ کے حاجت مندوں میں خیرات فرما دیں

آخر فاطمہؑ کے ساتھ اس قدر سخت اور محتاط رویہ کیوں ہے۔ زینبؓ ابوالعاص کے گھر میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہی ہیں دوسری بہنیں رقیہؓ اور ام کلثومؓ بھی ہمیشہ عیش و مسرت کے ساتھ زندگی گذارتی رہیں پہلے فرزندان ابولہب کے گھر میں اور اس کے بعد ان دونوں کی یکے بعد دیگرے عثمان کے ساتھ شادی ہوئی جن کا تعلق طبقۂ اشراف سے تھا۔ فاطمہؑ نے کبھی نہیں سنا کہ ان کے پدر بزرگوار نے ان کی بہنوں کو جو سن و سال میں ان سے کہیں زیادہ تھیں دولت و ثروت اور زیب و زینت کی وجہ سے سرزنش کی ہو۔

لیکن پیغمبرؐ کا لب و لہجہ اور ان کا طریق عمل فاطمہؑ کے بارے میں مختلف ہے اس سے ظاہر ہے کہ فاطمہ چشم پیغمبرؐ میں دوسری بیٹیوں سے کس قدر مختلف اور ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔

"فاطمہؑ سرگرم عمل رہو۔ اللہ کی راہ میں مسلسل سعی کرو کیونکہ روز قیامت میں تمہاری مدد کرنے سے معذور رہوں"

ذرا غور فرمایئے کہ اسلام کی یہ تعلیم اسلام کے اس تصور سے کس قدر مختلف ہے کہ جس کا یہ ادعا ہے کہ امام حسینؑ پر بہایا جانے والا ایک قطرہ اشک آتشِ دوزخ کو بجھا دیتا ہے اگر کسی شخص کے گناہ سمندر کی تمام موجوں صحرا کے تمام ریت کے ذرات اور آسمان کے تمام ستاروں سے بھی زیادہ ہوں گے تو بھی اسے بخش دیا جائے گا یا یہ کہ علیؑ کی دوستی فرد کے گناہوں کو روزِ قیامت نیکیوں میں بدل دے گی۔ (اس لحاظ سے وہ شخص بے عقل ہے جو اس دنیا میں گناہ نہیں کرتا اس لیے کہ قیامت میں اس کے پاس کوئی ایسا توشہ نہیں ہو گا جسے نیکیوں میں تبدیل کیا جا سکے) اور ان سب سے زیادہ مضحکہ خیز دعویٰ یہ ہے کہ بقول خدا "علیؑ کا دوست جنت میں جائے گا۔ اگرچہ کہ وہ میرا نافرمان ہو اور علیؑ کے دشمن کا ٹھکانہ جہنم ہے اگرچہ کہ وہ میرا اطاعت گذار ہو۔"

شفاعت

قیامت میں احتساب و عقاب کے دو مختلف ادارے نہیں ہیں عدالت الٰہی اور عدالتِ علوی کا الگ وجود نہیں ہے میزانِ احتساب ایک ہی ہے اس میں خدا اور علیؑ کے درمیان اختلاف نہیں ہو سکتا۔ قضیہ سخت نازک اور اس طرح کے تمام غلط تصورات سے بلند ہے۔ پیغمبرؐ روزِ قیامت، احتساب عمل کے وقت اپنی سب سے عزیز بیٹی فاطمہؑ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ فاطمہؑ کا عز و وقار و شرف خود ان کے عمل پر منحصر ہے فاطمہؑ کا دخترِ رسولؐ ہونا قیامت میں ان کے کسی کام نہ آ سکے گا البتہ یہ رشتہ یہ پاکیزہ اور مقدس رشتہ دنیا میں ان کے کام آ سکتا ہے اور وہ اس طرح کہ وہ خود کو اس منصب کا اہل بنا دیں۔ فاطمہؑ حقیقی معنوں میں فاطمہؑ بن جائیں فاطمہؑ کا فاطمہؑ بننا خود ان کے اپنے عمل پر منحصر ہے ان کا دخترِ رسولؐ ہونا ان کے عمل کے لیے میار اور ماحول فراہم کرتا ہے۔ شفاعت کا در اصل یہی مفہوم ہے۔ شفاعت کا مطلب امتحان میں ناجائز ذرائع سے کسی کی مدد کرنا نہیں ہے

نہ شفاعت کا مفہوم پارٹی بازی، اقربا پروری اور خویش نوازی ہے کہ جس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے عدل الٰہی کے تقاضوں کی نفی کی جا سکے یہ کیسے ممکن ہے کہ عدل الٰہی کے تقاضوں کو رد کر کے کسی کے نامہ اعمال کو بدلا جا سکے یا کسی کو کسی چور دروازے سے داخل بہشت کیا جا سکے۔

فاطمہؑ سے بڑھ کر اس حقیقت کو کون سمجھ سکتا ہے انہیں یہ حقیقت خود پیغمبرؐ نے تعلیم فرمائی اور پیغمبرؐ نے یہ بات نہ صرف انہیں بتائی بلکہ ہر شخص کو اس حقیقت سے آگاہ کیا۔ شفاعت کا وہ تصور جو حساب، کتاب اور مسئولیت کے اس شعور کو ہی درہم برہم کر دے جو مذہب کی اساس اور بنیاد ہے دراصل عہد جاہلیت اور بت پرستی کی طرز فکر کا عکس ہے مشرکین بتوں کو پیش خدا اپنا شفیع (شفاء ناعنداللہ) سمجھتے تھے۔ وہ ہر طرح کے گناہ اور برائی کے کام کرتے تھے لیکن لات و عزیٰ اور منات جیسے بڑے بتوں اور دیگر چھوٹے اصنام کے سامنے قربانی پیش کر کے اور ان کی مدح و ثنا اور خوشامد کر کے وہ ان سے اپنے لیے شفاعت طلب کر لیتے تھے اس طرح ان کا خیال تھا کہ یہ بت ان کے گناہوں کو بخشوا دیں گے۔ ان کے شفیع بن جائیں گے۔

میں نہ صرف پیغمبرؐ کے شفیع ہونے کا قائل ہوں بلکہ میں شفاعت امام و معصوم حتیٰ کہ شفاعت علما اور مجاہدین بزرگ کا بھی اعتقاد رکھتا ہوں مگر آپ میری بات کو بغور سمجھنے کی کوشش فرمائیے۔ میرا ایمان ہے کہ تربت حسینؑ کی خاک پاک بھی گنہگاروں کی بخشش کا سبب بن سکتی ہے مگر وہ اس طرح کہ انسان اس خاک پاک کی زیارت اس انداز سے کرے کہ اس کی روح اور اس کی فکر میں ایک تبدیلی اور انقلاب برپا ہو سکے۔ وہ حسینؑ جیسے مثالی انسان اور ان کے معیار فکر و ایمان پر غور کرے اور اس کے حوالے سے اپنی شخصیت کی اصلاح اور تعمیر کرے اس طرح انسان کی تمام شخصیت بدل جاتی ہے اس کے باطن میں ایک انقلاب رونما ہو جاتا ہے امام حسینؑ سے انسان کا تعلق اسے ہر طرح کے ضعف، خوف، طمع اور ہوس، بت پرستی، شخصیت پرستی دولت اور طاقت پرستی سے نجات دلاتا ہے اسے دین کی حقیقی معرفت عطا کرتا ہے انسانی

فضیلت کے تصور سے روشناس کرتا ہے اس کو ایک ایسا فلسفہ حیات عطا کرتا ہے جس کی روح جہاد صبر و اخلاص ہے۔

یہ تعلق انسان کو بلند اقدار سے متعارف کراتا ہے اس میں انسانیت کی حقیقی روح کو بیدار کرتا ہے۔ انسان کا ارادہ طبیعت اور عادت کی وہ کمزوریاں جو برائی اور گناہ کی جڑ ہیں ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے امام حسینؑ کی یاد ان سے تعلق انسان کو صحیح معنوں میں انسان بنا دیتا ہے ایک مکمل اور برگزیدہ انسان اور یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب اس کی ماہیت ہی تبدیل ہو جاتی ہے اس کے قلب و روح میں انقلاب برپا ہو جاتا ہے وہ باطنی طور پر ایک نیا انسان بن جاتا ہے اس کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی وہ خطائیں اور گناہ جن کا وہ ماضی میں ارتکاب کر چکا ہے محض ماضی کا قصہ بن جاتے ہیں اس کا حال اور مستقبل ان لغزشوں سے پاک ہو جاتا ہے وہ جیسا ماضی میں تھا اب ویسا نہیں ہے اب وہ ایک دوسرا اور نیا انسان ہے۔ گویا شفاعت انسان میں تبدیلی کے عمل کا قرینہ ہے یہ انسان کی قلب ماہیت کا نام ہے۔

حُرؑ جو جہاد کربلا کا ایک ہیرو ہے امام حسینؑ کی شفاعت کے سبب جاکمان جورو ضلالت کی غلامی کے دوزخ سے آزاد ہو کر محض چند گام کی مسافت میں انسانیت آزادی اور حقیقت کی بلند ترین چوٹیوں تک پہنچ جاتا ہے۔

اور فاطمہؑ شفاعت پیغمبرؐ کے ذریعہ فاطمہؑ بن سکیں اسلام میں شفاعت وہ راستہ ہے جس پر چل کر انسان خود کو نجات کا اہل بنا سکتا ہے۔ یہ عامل کسب شائستگی نجات ہے وسیلۂ نجات ناشائستہ نہیں ہے یعنی یہ ان لوگوں کے لئے جو خود کو نجات کا اہل نہیں بنا سکتے نجات کا وسیلہ نہیں ہے یہ انسان کا اپنا کام ہے کہ وہ شفیع کی شفاعت سے اکتساب فیض کر کے اس کے ذریعے اپنی اصلاح کرے خود اپنے آپ کو شائستہ نجات بنائے یعنی اپنی سرشت کو اس طرح بدلے کہ اس کی سرنوشت میں تبدیلی واقع ہو سکے بے شک انسان اپنی تقدیر اپنے عمل سے بناتا ہے وہ شفیع سے حسن عمل کا

معیار اور اقدار کسب کرتا ہے شفیع فرد کو خود سے کچھ نہیں عطا کرتا۔ اس کے برعکس فرد خود شفیع سے اکتسابِ فیض کرتا ہے۔ کوئی ایسا شخص جو گناہ گار ہو جو حسنِ عمل کے اعتبار سے بے وقعت ہو کسی ترکیب سے کسی کی مدد سے قیامت میں پلِ صراط سے نہیں گذر سکتا۔ کوئی شخص اس پل کو پار نہیں کر سکتا جب تک کہ اس نے اس دنیا میں جو میدانِ سعی و عمل ہے اور جو رزمِ خیر و شر کا میدان ہے، صراط پر سے گذرنے کا فن نہ سیکھا ہو شفیع اس فن کو سکھانے والا ہے وہ معلمِ راہِ نجات ہے اس کو پارٹی نہیں سمجھنا چاہیئے وہ خیانت کاروں اور گنہ گاروں کا رفیق و شریک نہیں حسینؑ انسانیت کے شفیع ہیں ان معنوں میں کہ ان سے عشق و ایمان کا تعلق ... ان کی یاد اور ان کا تذکرہ انسان کو مجاہد بناتا ہے ایک ایسا مجاہد جو ان کے نقشِ قدم پر چل کر جہل اور ظلم کے خلاف جہاد کرتا ہے، جبر و تشدد کے خلاف سرگرمِ عمل ہوتا ہے وگرنہ اگر انسان جہالت کی راہوں میں خود کو گم کر دے اور زندگی کی عارضی اور ظاہری لذتوں میں پھنس کر فریضۂ جہاد سے غافل ہو جائے تو پھر امام حسینؑ کی یاد میں اس کا گریہ اس کے کسی کام نہیں آئے گا۔ اشکِ عزا کوئی ایسا کیمیائی یا تیزابی اثر نہیں رکھتا۔ جو غفلت زدہ انسان کے گناہوں کو دھو دے اس سے انسان کو کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے شعور و وجدان پر اس کا اثر نہ پڑے اور جب انسان کا شعور غمِ حسینؑ سے متاثر ہو گا تو اس کی سرشت بھی بدل جائے گی اور سرنوشت بھی تبدیل ہو جائیگی

"فاطمہؑ راہِ عمل میں سعی کرو کہ میں قیامت میں تمہارے کسی کام نہیں آسکوں گا"

فاطمہؑ کی مثال محمدؐ کی سی ہے عدالتِ خدا کے نظام اور اسلام کے قانون سے خود محمدؐ بھی مستثنیٰ نہیں ... وہ بھی مقامِ مسئولیت میں ہیں بلکہ ان کی مسئولیت سب سے زیادہ سنگین ہے انہیں ہر قدم اور ہر سخن کے لیے جوابدہی کرنی ہے اپنے معمولی سے معمولی قول و فعل کا حساب پیش کرنا ہے۔ یہی صورتحال فاطمہؑ کے ساتھ ہے۔

ایک دفعہ ایک قریشی عورت نے جو اسلام قبول کر چکی تھی چوری کے جرم کا ارتکاب کیا۔ جب یہ قصہ پیغمبرؐ تک پہنچا تو آپؐ نے فرمایا کہ

اس کے ہاتھ قطع کردو۔ بہت سے لوگوں کے دل اس عورت کے لیے غمزدہ تھے۔ قریش ایک معزز قبیلہ تھا۔ عرب کا سب سے معزز اور دولت مند قبیلہ اس قبیلہ کی کسی عورت پر صحابی ہونا چوری کے جرم میں اس کے ہاتھ قطع ہونا تمام قبیلے کے لیے بے عزتی کی بات تھی یہ ایک ایسا کلنک کا ٹیکہ تھا جس کا داغ کبھی چھڑایا نہیں جاسکے گا۔ لوگوں نے چاہا فاطمہؑ اس بارے میں مداخلت کریں خدا کے حکم کے خلاف اس عورت کی شفاعت کریں۔ آپ نے صاف انکار کردیا۔ پھر لوگ اسامہؓ کے پاس گئے اسامہ زیدؓ کے بیٹے تھے جنہیں رسولؐ نے اپنا منہ بولا فرزند بنایا تھا حضور زیدؓ اور ان کے بیٹے اسامہؓ دونوں کو بہت دوست رکھتے تھے اور آپ کو ان سے محبت اور شفقت کا خصوصی تعلق تھا۔ اسامہؓ سے حضورؐ کی محبت اور شفقت تاریخ میں ایک معلوم حقیقت ہے اسی طرح ہم اس بات سے بھی اچھی طرح واقف ہیں کہ اسامہ ________ اور ان کے باپ زیدؓ جو پہلے جناب خدیجہؑ کے غلام تھے اور پھر حضورؐ کی غلامی میں آگئے تھے اپنی جاں نثاری اور وفاداری کے اعتبار سے ممیز اور ممتاز تھے اس پس منظر کے ساتھ اسامہؓ نے قریش کی جانب سے اور خود اپنی طرف سے خدمت پیغمبرؐ میں درخواست کی کہ اس زن قریش کے گناہ کو نظرانداز فرمائیں اسامہؓ نے ایک مجرم عورت کی شفاعت کی لیکن حضورؐ نے نہایت دوٹوک اور تہدید آمیز لہجہ میں جواب فرمایا۔

"اسامہؓ مجھ سے اس بارے میں ایک حرف بھی نہ کہو جب تک قانون میرے ہاتھ میں ہے کسی کے لیے اس قانون سے فرار ممکن نہیں ہے اگر اس عورت کی جگہ میری بیٹی فاطمہؑ بھی ہوتی تو اس کو بھی معاف نہ کیا جاتا۔"

آخر کیوں حضورؐ نے اپنے تمام رشتہ داروں میں صرف اپنی بیٹی کا ذکر کیا اور اس میں بھی خصوصیت سے فاطمہؑ کا نام لیا۔ ان سوالوں کا جواب صاف ہے اور بالکل واضح اور روشن ہے۔

جب حضورؐ نے دعوتِ ذوالعشیرہ میں خطاب فرمایا تو اس وقت بھی اپنے

تمام عزیزوں اپنے تمام اہل خاندان یعنی اپنی تمام بیٹیوں میں آپؐ نے بالخصوص فاطمہؑ کا انتخاب کیا حالانکہ وہ سب سے کمسن تھیں مگر وہ اسلام کی دعوت عظیم کی خصوصی مخاطب قرار پائیں۔

حضورؐ کی واضح حدیث کے مطابق فاطمہؑ تمام دنیا کی عورتوں میں جن چار عورتوں کو ممتاز کیا گیا ان میں سے ایک ہیں۔ تمام تاریخ انسانیت میں سب سے معزز اور منتخب عورتیں چار ہیں۔ مریمؑ، آسیہؑ، خدیجہؑ اور فاطمہؑ۔ اس فہرست میں فاطمہؑ کا نام سب سے آخر میں ہے۔ کیوں؟ ایسا کیوں ہے کہ یہ نام سب سے آخر میں لیا گیا۔

حضورؐ خود تمام موجودات کے کمال کی آخری حد ہیں وہ اولین و آخرین ہیں تاریخ کے تمام ادوار میں انسانیت کے کمال کی آخری منزل ہیں اور اس کے ساتھ ہی وہ سلسلۂ انبیا کی آخری کڑی ہیں۔

اور فاطمہؑ دنیا کی مثالی عورتوں میں سب سے آخری اور سب سے افضل نمونہ ہیں۔

* مریمؑ کی تمام قدر و قیمت عیسٰیؑ کے حوالے سے ہے کہ وہ ان کی والدہ اور ان کی پرورش کنندہ ہیں۔
* آسیہ (زنِ فرعون) کی تمام قدر و قیمت موسٰیؑ کے حوالے سے ہے کہ انہوں نے ان کو پالا اور ان کی مدد کی۔
* جناب خدیجہؑ کی عظمت دو حوالوں سے ہے وہ زوجۂ رسولؐ ہیں انہوں نے حضورؐ کی غم گساری فرمائی اور وہ مادرِ فاطمہؑ ہیں انہوں نے فاطمہؑ کی پرورش کی۔
* اور فاطمہؑ کی عظمت کا حوالہ کیا ہے؟ ان کی قدر و قیمت کس نسبت سے متعین ہوتی ہے عقل حیران ہے کہ کیا کہے۔

یہ عظمت خدیجہؑ کی نسبت سے ہے؟ محمدؐ کی نسبت سے ہے؟ علیؑ کی نسبت سے ہے؟ حسینؑ کی نسبت سے ہے؟ زینبؑ کی نسبت ہے؟ یا خود ان کی اپنی نسبت سے!

علیؑ اور فاطمہؑ اب بیرون شہر ایک ایسے گھر میں مقیم ہیں جو شہری زندگی کی چہل پہل سے دور قریۂ قبار میں واقع ہے یہ مقام مدینہ سے ۸ کلومیٹر دور جنوب کی طرف ہے یہیں وہ مسجد ہے جسے مسجد قبار کہتے ہیں۔ خانہ علیؑ و فاطمہؑ اس مسجد سے متصل ہے اس جگہ کی اہمیت یہ ہے کہ جب پیغمبرؐ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو مدینہ میں داخل ہونے سے قبل ایک ہفتہ اس جگہ قیام فرمایا۔ علیؑ جو مکہ سے رسولؐ کی ہجرت کے تین دن بعد روانہ ہوئے آپؐ سے اسی مقام پر آ کر ملے۔ اس کے بعد رسولؐ اسی جگہ سے روانہ ہو کر پہلی بار مدینہ کی سرزمین پر وارد ہوئے اور مدینہ کی آزاد فضاؤں میں اسلام کی آزادی اور ترقی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ یہیں پیغمبرؐ نے مسجد کی بنیاد رکھی مسجد نبوی جو خانۂ خدا بھی ہے اور خانۂ مردم بھی۔

عجیب اور حسین اتفاق ہے کہ علیؑ و فاطمہؑ اپنی ازدواجی زندگی کے آغاز کے وقت پھر مدینہ سے قبار کی طرف لوٹے اور ایک مدت تک اس گھر میں رہے جو مسجد قبار کے پہلو میں واقع ہے مسجد قبار وہ پہلی مسجد ہے جسے پیغمبرؐ اسلام نے بنایا اور اسی مسجد کے کنارے علیؑ و فاطمہؑ نے اپنے گھر کی اس گھر کی جو "خانۂ عترت" ہے بنیاد رکھی اور یہیں سے اسلام کی اس نئی تاریخ کا آغاز ہوا۔ جس کے موسس علیؑ اور فاطمہؑ ہیں اس کے بعد وہ مدینہ واپس آئے اور مسجد نبویؐ کے احاطہ میں ایک ایسے گھر میں مقیم ہوئے جس کی دیوار خانۂ پیغمبرؐ کی دیوار سے متصل تھی اسلام کی تاریخ اور علیؑ اور فاطمہؑ کی تاریخ حیات کے آغاز میں یہ وہ ہم آہنگی اور مطابقت ہے کہ جس کو وہ صاحبان نظر اچھی طرح سمجھتے ہیں جو اسلام اور تشیع حقیقی کے تطابق کو پہچانتے ہیں اور جو مسجد نبویؐ اور خانۂ نبوتؐ کے باہمی اور معنوی تعلق سے باخبر ہیں بصورت دیگر لوگوں کے لیے یہ تطابق اور یکسانیت حیرت اور استعجاب کا سبب بنتی ہے۔

پیغمبرؐ پر علیؑ اور فاطمہؑ کی دوری شاق ہے وہ انہیں اپنی نظروں سے اوجھل نہیں کرنا چاہتے علیؑ بچپن سے ان کے گھر میں ان کے ساتھ رہے ہیں۔

مگر اب یہ دونوں جو بیت رسولؐ کی روح ہیں ان سے دور بیرون شہر قبا کے مقام پر سختی اور فقر کی زندگی گذار رہے ہیں۔ مگر اس فقر و فاقہ کے باوجود ان کا جذبۂ عشق و ایمان ان کے لیے بہت بڑا سرمایہ ہے، علیؑ آغاز طفولیت ہی سے سختی، تنہائی اور تنگدستی کا شکار رہے پھر ان کی زندگی جہاد و کشمکش، ریاضت اور روحانیت کا مرقع رہی مکہ میں انہوں نے دشمنان اسلام کی مخالفت کو برداشت کیا اور ہر طرح کے آزمائشی مراحل سے صبر و تحمل کے ساتھ گذرے۔ ان کی جوانی حتیٰ کہ بچپن راہ اسلام میں جہاد کے لیے وقف رہا، وہ ایک ایسی شخصیت تھے جو دوسروں سے بہت مختلف تھی۔ ان کی روح پارسائی اور خدا ترسی کے عناصر سے مرکب تھی انہیں نہ گھر کی بات سوچنے کا موقع تھا اور نہ وہ زندگی کی لذت، دولت اور راحت کے متعلق فکر کرتے تھے ان کی زندگی محض تلخی کے ذائقہ سے آشنا تھی۔ ان کی روح رنج اور مصیبت کے چشمہ سے سیراب تھی وہ خلوت و ریاضت و تفکر کے ساتھ ہی سعی و عمل اور کشمکش و جہاد کے خوگر تھے۔

اور جہاں تک فاطمہؑ کا تعلق ہے تو ان کی پوری زندگی مصیبت کشمکش اور فقر کا مرقع تھی انہوں نے اپنے باپ اپنی ماں اور اپنے گھر کے دکھ درد میں ان کا ہاتھ بٹایا، اور وہ خود اور ان کے ہمراہ علیؑ جو اس وقت ان کے بھائی کی جگہ تھے مکہ کی تمام زندگی میں شدائد و مصائب کا شکار رہے ان حالات نے ان کے قلب و روح پر بہت گہرے اثرات مرتب کئے۔ وہ جسمانی ساخت کے اعتبار سے ضعیف اور بے حد حساس تھیں ان کا دل بہت نرم تھا اور وہ ہر ایک کی تکلیف کو پوری شدت سے محسوس کرتی تھیں اور اب خانۂ علیؑ میں بھی وہ خود ہر طرح کے مصائب و شدائد فقر و ریاضت کے ماحول کو بخوشی قبول کئے ہوئے ہیں نہ علیؑ وہ شخص ہیں جو اس گھر کو عام گھروں کا نمونہ بنا سکیں اور اس میں ایسی دلچسپی لیں جو جوانی کے جذبات اور خانگی زندگی کی دلچسپیوں سے عبارت ہو اور نہ فاطمہؑ ہی کو یہ پسند ہے کہ وہ اس گھر کی فضا کو ان گھروں کی فضا کی طرح بنا دیں جن میں نئے شادی شدہ جوڑے اپنی زندگی کا آغاز کرتے ہیں یہ گھر بھی عام گھروں سے مختلف ہے اور ان دونوں شخصیتوں کا مزاج اور معیار بھی سب سے جدا اور منفرد

ہے۔ فاطمہؑ اس بات کو پسند نہیں کرتیں کہ وہ علیؑ کو آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں کی طرف کھینچ لیں اور انہیں اپنی باطنی اور روحانی دنیا سے باہر نکلنے پر مجبور کریں۔

صرف اور صرف پیغمبرؐ وہ شخصیت ہیں جن کی محبت، شفقت اور حزن کے کلمات اس گھر میں روشنی، امید اور مسرت کی لہریں بکھیرتے ہیں اور اپنی ان دونوں عزیز ہستیوں کو ساغرِ مسرت و شادمانی سے سیراب کرتے ہیں۔

پیغمبرؐ اس بات سے بھی بخوبی آگاہ ہیں کہ اس خاندان کو ان کے لطف و محبت کی کس قدر ضرورت ہے در اصل کی زندگی کا تمام سرمایہ ہی عشقِ رسولؐ ہے اور پیغمبرؐ اس حقیقت سے بھی باخبر ہیں کہ "جو کوئی انہیں دوست رکھتا ہے پھر اس کی اپنی کوئی زندگی نہیں رہتی اس کے لیے محبتِ رسولؐ بجائے خود ایک زندگی ہے"

اس احساس کے تحت پیغمبرؐ فاطمہؑ اور علیؑ کو اپنے قریب بلا لیتے ہیں۔ مسجد نبویؐ کے احاطہ میں رسولؐ کے گھر سے متصل ان کے لیے ایک گھر تعمیر کیا جاتا ہے اس گھر کی تعمیر بیت رسولؐ کے نمونہ پر کی گئی ہے۔ اسے کھجور کی شاخوں اور پتیوں سے بنایا گیا ہے خانۂ رسولؐ اور خانۂ علیؑ میں دو کھڑکیاں ہیں جو ایک دوسرے کے مقابل کھلتی ہیں۔

اور یہ گھروں کی کھڑکیاں، گویا دلوں کے دریچے ہیں جو ایک دوسرے کے مقابل باز ہوتے ہیں۔ ایک قلبِ پدر اور دوسرا قلبِ دختر۔ مورخین نے لکھا ہے کہ پیغمبرؐ ہر روز بلا استثناء اپنے گھر کی کھڑکی کھول کر اپنی دختر کی خیریت معلوم کرتے تھے اور ان پر سلام کرتے تھے۔

ایسا کیوں تھا کہ تمام اصحاب، تمام اقارب و اعزا یہاں تک کہ تمام بیٹیوں میں صرف فاطمہؑ کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ ان کا گھر احاطۂ مسجد میں ہے اور اس کی دیوار خانۂ پیغمبرؐ کی دیوار سے اس طرح ملی ہوئی ہے گویا کہ دونوں گھر ایک ہی ہیں اور حقیقت میں یہ دونوں گھر ایک ہی تھے خانۂ محمدؐ، خانۂ فاطمہؑ ہے۔ جیسے خانوادۂ محمدؐ کہتے ہیں۔ یہ وہی خاندان ہے جس میں باپ علیؑ ہیں۔ ماں فاطمہؑ ہیں، پسر حسنینؑ ہیں اور بیٹی زینبؑ اور ام کلثومؑ ہیں۔

عترت واہل بیت جن کا قرآن وحدیث میں بار بار اور بڑی اہمیت اور خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے۔ یہی خانوادہ ہے یہی وہ گھر ہے جسے ہر طرح کے رجس سے پاک کیا گیا ہے اور یہی وہ اہل بیت ہیں جنہیں عصمت کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے۔ یہی وہ "عترت" اور "اہل بیت" ہیں جنہیں ہر دور اور ہر زمانے میں قرآن کے ساتھ ساتھ انسانوں کی ہدایت کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے۔ جو کوئی اس گھر کی عظمت کا معترف ہے وہ استدلال اور بحث کی ضرورت سے بے نیاز ہے۔ بفرضِ محال اگر اس خانوادہ کی فضیلت میں کوئی روایت نہ بھی ہو تو بھی انسان کی عقل اس کی عظمت کا اعتراف کرتی ہے۔

مدینہ میں خانۂ عائشہ سے متصل اس گھر کی بنیاد رکھی جا چکی ہے اب اس گھر میں بہاروں کا دور دورہ ہے۔ علیؑ اور فاطمہؑ کے شجرِ اتصال میں بے مثل و بے نظیر ثمر آئے ہیں پے بہ پے پھول کھل رہے ہیں ان پھولوں کے نام ہیں۔

حسنؑ، حسینؑ، زینبؑ اور ام کلثومؑ

ایک نئی تاریخ کا آغاز ہو چکا ہے ان ستاروں کے طلوع ہونے سے نئے افق روشن ہو رہے ہیں۔

یہ محمدؐ کے لیے معنیٔ حیات ہیں اسلام کے لیے دلیلِ صداقت ہیں اور انسانیت کے لیے یہ کیا کچھ نہیں ہیں۔ یہ سب کچھ ہیں۔ ہجرت کے تیسرے سال عقد کے ایک سال اور کچھ مہینہ بعد حسنؑ کی ولادت ہوئی۔

پیغمبرؐ جس دن کا ایک مدت سے انتظار کر رہے تھے وہ دن آن پہنچا انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ مدینہ میں جشن کا سماں ہے بعثت کے بعد ۱۶ سالہ دور کا ہر لمحہ تلخی اور مصیبت کا لمحہ تھا دشمنوں کی ایذا رسانی دوستوں کی تکالیف اور خود اپنی اور اپنے اہلِ خاندان کی مصیبتوں نے پیغمبرؐ کی زندگی کو تلخ کر رکھا تھا کسی طرف سے کوئی اچھی خبر سننے میں نہیں آتی تھی۔ اس ۱۶ سالہ آزمائشی دور کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ جب رسولؐ کو کوئی اچھی خبر ملی ہے جب آپؐ نے شیرینیٔ حیات کا ذائقہ چکھا ہے۔ ولادتِ حسنؑ کی خوشخبری آپ کی خستگیٔ احساس کے لیے تازگی کا پیغام تھی۔ وفورِ اشتیاق و مسرت کے عالم

ہیں حضورؐ خانۂ فاطمہؑ میں تشریف لاتے ہیں علیؑ اور فاطمہؑ کے باغ کے پہلے ثمر کو اپنی آغوش کی زینت بناتے ہیں ان کے کان میں اذان و اقامت کہتے ہیں اور پھر ان کے سر کے بالوں کے ہم وزن چاندی خیرات فرماتے تھے پھر ایک سال اور گذرا تو حسینؑ اس دنیا میں تشریف لائے۔

اب پیغمبرؐ کے دو بیٹے ہو گئے۔ حسنؑ اور حسینؑ

تقدیر کو یہی منظور تھا کہ رسولؐ کے صلبی فرزند، ان کے دونوں بیٹے قاسم اور طاہر زندہ نہ رہ سکیں اس لیے کہ دراصل فاطمہؑ کے بیٹوں کو پسرانِ رسولؐ قرار دیا گیا ہے۔ رسول کے بیٹے فاطمہؑ کے نور پائے نظر ہیں۔

پیغمبرؐ کی نسل کی بقا ان کی بیٹی یعنی فاطمہؑ پر منحصر ہے۔ فاطمہؑ جو فاطمہؑ ہیں۔ اور علیؑ بھی اس سلسلہ سے جدا نہیں ہے۔

معنوی اعتبار سے علیؑ محمدؐ کا تسلسل ہیں اور روحانی اعتبار سے علیؑ محمدؐ کے وارث ہیں۔

اور نسلی تسلسل کے اعتبار سے علیؑ، نسل محمدؐ کے تسلسل کی علامت اور اس کا وسیلہ ہیں۔ یہ دونوں مبارک ہستیاں ایک دوسرے سے اس طرح مربوط و متحد ہیں کہ ذریتِ محمدؐ، ذریتِ علیؑ ہے اور ذریتِ علیؑ ذریتِ محمدؐ ہے ان دونوں کی حقیقت ایک ہے۔ ان دونوں کا نور ایک ہے اور ان دونوں کی نسل ایک ہے اور حسنؑ اور حسینؑ کے معصوم چہروں سے یہ حقیقت نورانی پوری طرح آشکار ہے۔ محمدؐ ان دونوں بچوں کے معصوم چہروں میں تین مبارک ہستیوں کو جلوہ گر دیکھ رہے ہیں۔

علیؑ کو، فاطمہؑ کو اور خود کو

تقدیر نے ان دونوں کو خود حضورؐ کے دونوں بیٹوں کا نعم البدل قرار دیا ہے اور یہ دونوں علیؑ اور فاطمہؑ کے باغ کے ثمر ہیں۔ فاطمہؑ ام ابیہا ہیں انہوں نے اپنے باپ سے بے مثل محبت کی ہے اور حضورؐ کو بھی وہ سب سے زیادہ محبوب ہیں ہر شخص جانتا ہے اور اس بات کا بار بار اعادہ کیا جاتا ہے کہ فاطمہؑ حضورؐ کی سب

سے چھوٹی اور سب سے چہیتی بیٹی ہیں ۔ یہ حضورؐ کو سب سے زیادہ محبوب ہیں علی سے بھی زیادہ۔

اور علیؑ!

چشم رسولؐ میں ان کے بیٹے کی طرح عزیز ہیں رسول نے انہیں پالا ہے۔

یہ ان کے بھائی ہیں اور انہیں فاطمہؑ سے زیادہ عزیز ہیں ۔ علیؑ اور محمدؐ میں محبت اور یگانگت کی نسبتیں بے شمار ہیں دونوں عبدالمطلبؑ کی اولاد ہیں مادر علیؑ نے رسولؐ کو اس وقت سے جب وہ صرف آٹھ سال کے تھے ہمیشہ ماں کی طرح پرورش کیا ۔ علیؑ کے پدر بزرگوار ابو طالبؑ نے اپنے یتیم بھتیجے کو باپ کی کمی محسوس نہ ہونے دی وہ رسولؐ کے لیے مثل باپ کے تھے محمدؐ آٹھ سال کے سن سے ۲۵ سال کی عمر تک خانۂ علی میں پلے بڑھے اسی طرح علی بچپن ہی سے محمدؐ کے گھر میں رہے اور اسی گھر میں پل کر جوان ہوئے یہاں تک کہ ان کا سن پچیس برس کا ہوا خدیجہ ان کے لیے بجائے ماں تھیں اور رسولؐ مثل پدر۔

ان روابط میں کس قدر مشابہت اور یکسانیت ہے حالات ایک دوسرے سے کس طرح مطابقت رکھتے ہیں۔

ان دونوں ہستیوں کی سرنوشت میں کس قدر مطابقت ہے ۔

دونوں ایک دوسرے کا عکس ہیں۔

گویا ایک روح اور دو قالب ہیں۔

علیؑ پیغمبرؐ کی دعوتِ اسلام قبول کرنے والے پہلے شخص ہیں ۔ یہ وہ پہلے انسان ہیں ۔ جنہوں نے عالم غربت و تنہائی میں پیغمبرؐ کی آواز پر لبیک کہا ۔ ان کی نصرت کا عہد کیا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور اس دن سے جب تک زندہ رہے تمام خطرات کا مردانہ وار مقابلہ کیا ۔ تمام زندگی خطرات اور مشکلات کے حصار میں گذار دی مگر ہمیشہ اپنے عہد نصرت رسولؐ پر ثابت قدم رہے۔

بعثت سے قبل بھی علیؑ اگرچہ کہ بہت چھوٹے تھے وہ جلوت و خلوت میں ہمیشہ محمدؐ کے ساتھ دیکھے جاتے تھے اس دور میں حضورؐ جب غار حرا میں قیام فرماتے تو علیؑ ان کے ساتھ

ہوتے اوران کے گہرے اضطراب، تفکر۔۔۔ اور غیر معمولی عبادت وریاضت کو دیکھا کرتے

جزیرہ نمائے عرب کے چاند نے بارہا یہ منظر دیکھا ہے کہ بعثت شروع ہونے سے قبل ماہ رمضان میں کوہ حرا کی بلندی پر رات کی گہری اور پراسرار خاموشی میں ایک عظیم انسان کبھی کسی پتھر کے سہارے بیٹھ جاتا ہے کبھی آہستہ آہستہ ٹہلنے لگتا ہے۔ کبھی یوں سر جھکا لیتا ہے جیسے الہام کی بارش اس پر راز ہائے سربستہ کھول رہی ہو۔ کبھی آسمان کی طرف سر بلند کر لیتا ہے۔ جیسے نامعلوم حقیقتوں کے بحر ناپید اکنار کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے بے تاب ہو۔ جیسے اسے کسی عظیم خبر کا انتظار ہو۔ جیسے وہ ان چیزوں کا مشاہدہ کر رہا ہو جن کی ابھی تک کسی کو خبر نہیں دی گئی اوران تمام حالات وکیفیات کے دوران ایک بچہ سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ ہے کبھی اس کے دوش پر اور کبھی اس کے پہلو میں

اور یہ بچہ جب آٹھ یا دس سال کا تھا تو ایک روز رات کو یہ اس حجرہ میں گیا جہاں محمدؐ اور خدیجہؓ رہتے تھے۔ محمدؐ اور خدیجہؓ جو اس کے لیے مثل باپ اور ماں کے تھے دیکھا کہ دونوں کبھی سجدہ کرتے ہیں کبھی بیٹھ جاتے ہیں کبھی اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اوران تمام حالتوں میں زیر لب کچھ پڑھ رہے ہیں دونوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی پھر جب وہ اپنے اس کام سے فارغ ہوئے تو بچے نے حیرت سے پوچھا آپ یہ کیا کر رہے تھے۔ پیغمبرؐ نے جواب میں فرمایا:

ہم نماز ادا کر رہے تھے مجھے پروردگار نے مبعوث بہ رسالت کیا ہے میں اس کام پر مامور ہوں کہ لوگوں تک اسلام کا پیغام پہنچاؤں اور انہیں اپنے پروردگار کی وحدانیت اور اپنی رسالت پر ایمان لانے کی دعوت دوں اے علی میں تمہیں بھی اس دین کو قبول کرنے کی دعوت دیتا ہوں:

علی اگرچہ ابھی بچے ہیں۔ کم سن ہیں حالانکہ خانۂ محمدؐ میں قیام پذیر ہیں حالانکہ ان کی محبت میں غرق ہیں اور دل وجان سے ان کی بزرگی کے قائل ہیں مگر علیؑ پھر علیؑ ہیں۔

وہ بے سوچے سمجھے ہاں نہیں کہتے وہ اپنی عقل کے ذریعے ایمان کو قبول کرتے

ہیں. پھر یہ ایمان عقل سے ان کے دل کی گہرائیوں میں اترتا ہے اس لیے علیؑ بلاغور وتامل اس دعوت پر لبیک نہیں کہتے وہ اپنے سن و سال کی مناسبت سے ایک سادہ سی بات کہتے ہیں:

"اجازت دیجئے کہ میں آپؐ کی دعوت کے بارے میں اپنے والد (ابو طالبؑ) سے مشورہ کرلوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ان سے ضرور لے لینی چاہیے۔"

یہ کہہ کر وہ حجرۂ رسولؐ سے رخصت ہو جاتے ہیں اور اپنے سونے کے کمرہ میں واپس آجاتے ہیں۔

مگر یہ دعوت، ایسی دعوت نہیں ہے جو علیؑ کو باوجودیکہ ان کا سن صرف آٹھ یا دس سال کا ہے، آرام سے سونے دے وہ تمام رات اس بارے میں غور و فکر کرتے رہے ان کی وہ تمام رات اسی فکر و اندیشہ میں بسر ہوئی۔

اس رات علیؑ کا دل و دماغ کس قسم کے خیالات کی آماجگاہ رہا اس بارے میں کوئی شخص کیا کہہ سکتا ہے. ہاں جب صبح ہوئی تو نہایت اعتماد کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے خدمتِ پیغمبرؐ میں حاضر ہوتے اور ایک ایسے لہجہ میں جس میں طفلی کی شیرینی کے ساتھ عزم و اعتماد کا حسن بھی تھا انہوں نے کہا۔

میں نے گذشتہ شب آپؐ کی دعوت کے بارے میں بہت غور کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ خدا نے مجھے پیدا کرتے وقت میرے باپ (ابو طالبؑ) سے مشورہ نہیں کیا۔ لہٰذا مجھے بھی اپنے خدا کے دین کو قبول کرنے کے لیے اپنے والد کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے" میں آپ کی دعوت قبول کرتا ہوں۔ آپ مجھے اسلام کے بارے میں تفصیل سے بتائیے

پس پیغمبرؐ ارشاد فرماتے ہے اور علیؑ ان ارشادات کی تصدیق کرتے رہے اور اس تاریخی لمحہ کے بعد ان کی زندگی کا ہر لمحہ اسی عہد کی تصدیق، خدا کی عبادت رسولؐ کی خدمت اور نصرت، خلقِ خدا کی بھلائی اور اپنی روح کے تزکیہ کے لیے وقف رہا ان کی زندگی کا ہر لمحہ خدمتِ اسلام کی ایک بے مثال نشانی بن گیا۔ ان کے اور رسولؐ

کے درمیان صدہا ظاہری اور باطنی، فکری، قلبی، اور روحانی رشتے تھے محمدؐ اور علیؑ کے درمیان جو محبت اور تعلق تھا اس سے سبھی لوگ واقف تھے اور خود علیؑ سب سے زیادہ اس حقیقت سے باخبر تھے۔ پیغمبرؐ کے دل کی گہرائیوں سے مہر و محبت کی جو شعاعیں پھوٹتی تھیں ان کی روشنی اور لطافت کو علیؑ پوری طرح محسوس کرتے تھے ایک دن علیؑ کا دل اس پاکیزہ محبت کی خوشی سے جو رسولؐ کو ان سے تھی سرشار اور بیخود ہو گیا اور اس عالم بے خودی میں انہوں نے چاہا کہ وہ خود زبانِ رسالتؐ سے یہ سنیں کہ ان سے رسولؐ کس درجہ محبت رکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ خدمتِ رسولؐ میں حاضر ہوئے اور ان سے سوال کیا!

"ان دونوں میں سے چشمِ رسالتؐ میں کون زیادہ محبوب ہے آپؐ کی بیٹی زہراؑ یا ان کے شوہر علیؑ"

ظاہر ہے کہ پیغمبرؐ کے لیے اس سوال نے بڑی مشکل پیدا کر دی تھی ان کے لیے اس سوال کا جواب گویا ایک "انتخاب محال" تھا۔ انہیں علیؑ اور فاطمہؑ کے درمیان انتخاب کرنا تھا ان کے لبوں پر ایک معصوم اور مہربان مسکراہٹ نمودار ہوئی اور انہوں نے اپنے دل کے جذبات کی تمام گہرائیوں اور وسعتوں کو اپنے الفاظ میں سموتے ہوئے اور اپنے الفاظ سے خود محظوظ ہوتے ہوئے فرمایا:

"فاطمہؑ میرے نزدیک تم سے زیادہ محبوب ہے مگر تم مجھے فاطمہ سے زیادہ عزیز ہو۔"

اور اب حسنؑ اور حسینؑ، رسولؐ کے نواسے، ان کے محبوب ترین عزیز اور ان کی عزیز ترین محبوب کی پارہ ہائے جگر ان دونوں ہستیوں کا آئینہ اور ان کی زندگی کا عکس ہیں۔ یہ پیغمبرؐ کو تمام دنیا میں سب سے زیادہ محبوب اور سب سے زیادہ عزیز ہیں

پیغمبرؐ کہ تاریخ جن کے عزم اور حوصلہ اور طاقت اور غلبہ کی گواہی میں رطب اللسان ہے جن کی شمشیر کی ہیبت سے تمام خسروانِ جہاں تمام قیصرانِ دوراں اور تمام حاکمانِ جور کے دل دہل اٹھتے ہیں اور جن کے قہر و غضب کے سامنے دشمنانِ حق

لرزہ براندام دکھائی دیتے ہیں۔ اس تمام جلالی شان کے ساتھ ہی رحمت و محبت اور نوازش و شفقت کا سرچشمہ بھی ہیں۔ ان کی جمالی شان یہ ہے کہ وہ لوگوں پر صددرجہ شفیق اور مہربان ہیں کسی کی خفیف سی محبت ان کے دل میں محبت کے طوفان کو موجزن کر دیتی ہے اور کسی کی طرف سے جذبات اخلاص و مروت کا معمولی سا اظہار ان کی روح میں لطف و عنایت کے بحرِ ناپیداکنار کو متحرک کر دیتا ہے۔

جنگِ حنین میں تمام دشمنوں نے مل کر آپؐ پر یلغار کی، تمام شمشیروں کا رخ آپؐ ہی کی طرف کر دیا۔ کوشش یہ تھی کہ کسی طرح دنیا آپؐ کے وجودِ مقدس سے خالی ہو جائے ہر شخص... آپؐ کے قتل کے درپے تھا۔ یہاں تک کہ بالآخر دشمنانِ اسلام کو شکست ہوئی۔ چھ ہزار افراد قیدی بنائے گئے، چالیس ہزار اونٹ، بے شمار بھیڑیں اور غنیمت کا بہت سامال ہاتھ آیا۔ اچانک شکست خوردہ دشمن کی فوج میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور کہنے لگا: "اے محمدؐ ان قیدیوں میں آپؐ کی دائی ماں[۱] اور آپ کی (رضاعی) خالائیں بھی ہیں"

اس نے مزید کہا کہ اگر ہم نے نعمان بن منذر[۲] یا ابن ابی شمر[۳] کی رضاعت کی ہوتی تو اس مصیبت کے وقت میں وہ ہم سے وہ سلوک کرتے جو ان کی حیثیت اور سلطنت کے شایانِ شان ہوتا ہے اور آپؐ ان سب لوگوں سے عظیم تر ہیں جن کی رضاعت اور خدمت کی جاسکتی ہے۔"

پھر اس کے بعد ایک عورت آگے آئی اور اس نے فریاد کی "میں تمہارے پیغمبرؐ کی (رضاعی) بہن ہوں" پیغمبرؐ نے سوال کیا کہ تیرے پاس تیرے دعویٰ کا ثبوت کیا ہے پس اس نے رسولِ اکرمؐ کو اپنے شانوں پر ان کے دانتوں کے نشان دکھائے اور کہا "ایک دن میں آپ کو اپنی پشت پر سوار کئے ہوئے تھی کہ آپؐ نے غصہ کی حالت میں میرے شانے

۱۔ حلیمہ سعدیہ جنہوں نے حضورؐ کی دایہ ہونے کا شرف حاصل کیا اور حضورؐ کو دودھ پلایا۔ قبیلہ بنی اسد سے تعلق رکھتی تھیں اور یہ قبیلہ بنی ہوازن کے قبائل میں سے ایک تھا۔

۲۔ وہ بادشاہ جس کی سلطنت عرب کے مشرق میں تھی۔

۳۔ غسانی بادشاہ جس کی سلطنت شمالی عرب میں تھی۔

پر اپنے دانت پیوست کر دیئے تھے یہ اسی کا نشان ہے۔"

ان باتوں نے پیغمبرؐ کے جذبات رحمت و محبت کو برانگیختہ کر دیا۔ ماضی کی تمام یادیں آپ کے ذہن میں تازہ ہونے لگیں اس دور کی یادیں جب آپ بہت چھوٹے تھے اور آپ کی رضاعت کا فریضہ حلیمہ سعدیہؓ کو سونپا گیا تھا۔ اپنی دائی اور اس کی بیٹیوں کی محبت اور حلیمہ کے قبیلہ میں اپنی ابتدائی زندگی کے ایام کی یاد نے آپؐ کے جذبات کو اس قدر متاثر کیا کہ آپؐ کی آنکھیں آبدیدہ ہوگئیں اور آپؐ نے فرمایا۔ میں اپنا حصہ اور تمام بنی عبدالمطلب کا حصہ ابھی معاف کرتا ہوں کل صبح تم مسجد میں آجاؤ اور تمام لوگوں کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کرو۔ اس کے جواب میں میں اپنی طرف سے اور اولاد عبدالمطلب کی طرف سے مال غنیمت کے حصے کی معافی کا اعلان کر دوں گا۔ مجھے امید ہے کہ تمام دوسرے لوگ بھی میری پیروی کرتے ہوئے اپنے اپنے حصے معاف کر دیں دوسرے دن ایسا ہی ہوا اور پیغمبرؐ نے بے پایاں محبت اور لطف کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان سب کو آزاد کر دیا اور ان سب کا اسباب بھی واپس کر دیا۔ چند لوگ جو مال غنیمت میں اپنے حصہ کی دستبرداری سے خوش نہ تھے انہیں پیغمبرؐ نے مستقبل میں اس کی کی تلافی کا وعدہ کر کے مطمئن کیا۔

اپنی خانگی زندگی میں اور اہل خانہ کے ساتھ حسن سلوک میں پیغمبرؐ ہمہ تن لطف و محبت کا نمونہ تھے۔ گھر کے باہر وہ مرد رزم و سیاست تھے، وہ طاقت، قدرت اور غلبہ کا مجسمہ تھے لیکن گھر میں وہ ایک مہربان باپ اور ایک نرم خو شوہر تھے۔ ان کی ازواج میں سے بعض کا رویہ نامناسب بھی رہا ہے۔ انہوں نے گستاخیاں بھی کیں آزار بھی پہنچائے مگر پیغمبرؐ کا رویہ ہمیشہ نرمی اور لطف و محبت کا رویہ رہا۔ حالانکہ یہ وہ دور تھا جب عورت کے ساتھ سخت گیری معاشرہ کا مزاج تھا۔ لوگ عورتوں کو زدو کوب کرنے کے عادی تھے۔ لیکن پیغمبرؐ نے اپنی تمام زندگی کبھی کسی زوجہ کے ساتھ ایسا نامناسب رویہ اختیار نہیں کیا۔ وہ تنہا موقعہ جس پر آپؐ اپنی ازواج سے ناراض ہوئے ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا اور ان کی تنبیہ کی وہ موقع تھا جب آپؐ کی بعض ازواج نے فقر و تنگدستی کی اس قدر شکایت کی کہ آپؐ کو ناگوار ہوا۔ اور آپؐ نے ان کے حجروں میں سونا ترک کر دیا ایک

ایسی جگہ جو کاٹھ کباڑ، گھاس اور غلہ کا گودام تھی آپؐ سیڑھی لگا کر اس کی چھت پر چلے جاتے۔ وہاں جو سامان ہوتا اسے ایک طرف کر کے فرش صاف فرماتے اور وہیں سو جاتے ایک ماہ تک آپؐ کا یہی معمول رہا۔ یہاں تک کہ آپؐ کی ازواج اپنے رویہ پر شرمندہ ہوئیں انہوں نے اپنی غلطی کو تسلیم کیا اور جب پیغمبرؐ نے انہیں یہ فراخدلانہ پیش کش کی اگر وہ دنیاوی عیش و آرام کی طلب گار ہیں تو وہ انہیں طلاق دینے کے لیے تیار ہیں اور اگر وہ ان کے ساتھ رہنا چاہتی ہیں تو انہیں فقر و فاقہ کی زندگی کو قبول کرنا ہو گا۔ ازواج میں سے سوائے ایک کے سب نے پیغمبرؐ کی رفاقت اور فقر کو دنیاوی عیش و آرام پر ترجیح دی

پیغمبرؐ نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ خود کو دوسروں کے سامنے ان سے مختلف، پراسرار، غیر معمولی یا عجیب و غریب بنا کر پیش کریں۔ بلکہ اس کے بالکل برعکس آپؐ کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ لوگ آپؐ کو کوئی مختلف شخصیت اور اپنے سے غیر اور بیگانہ نہ سمجھیں۔ بلکہ آپؐ بھی دوسروں ہی کی طرح نظر آئیں نہ صرف یہ کہ آپ نے قرآن کے الفاظ میں اس بات کا اعلان کیا کہ "میں بشر ہوں تمہاری مثل، مگر یہ کہ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے" بلکہ بار بار یہ جتایا کہ مجھے علم غیب کا دعویٰ نہیں ہے مجھے جو کچھ خبر دی جاتی ہے اس کے علاوہ کسی بات کے متعلق میں نہیں جانتا۔ غرض آپؐ اپنی رفتار و گفتار اور عادات و اطوار سے ہمیشہ یہی کوشش کرتے تھے لوگوں کے سامنے خود کو غیر معمولی اور فوق العادات شخصیت کے طور پر پیش نہ کریں تاکہ لوگوں کے دلوں میں آپؐ کے لیے خوف یا ہیبت نہ پیدا ہو۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک بوڑھی عورت آپؐ کی خدمت میں آئی تاکہ آپ سے کسی مسئلہ کے متعلق استفسار کرے اس نے آپؐ کی عظمت و جلالت کی بابت جو باتیں سن رکھی تھیں ان کا اس کے دل پر کچھ ایسا اثر تھا کہ جب اس نے خود کو آپؐ کی حضوری میں پایا تو فرطِ ہیبت سے کانپنے لگی اور آپؐ کے سامنے اس کی قوتِ گویائی جواب دینے لگی، پیغمبرؐ نے محسوس کیا کہ آپؐ کی شخصیت کے شکوہ نے اس کو صد درجہ متاثر کیا ہے۔ چنانچہ آپؐ اس سے صد درجہ نرمی اور ملاطفت سے پیش آئے۔ اس پیر زن کے شانہ پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور نہایت نرم اور لطیف لہجہ میں فرمایا۔ مادر۔ کیا بات ہے کیوں ڈر رہی ہو۔ میں تو

ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو بکریوں کا دودھ دوہتی ہے۔

پیغمبرؐ کی شخصیت کا یہ رخ یعنی نرمی، شفقت، لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور محبت اور آپؐ کی رقتِ قلب بھی حیرت انگیز ہے۔

اپنی خانگی زندگی میں آپؐ کی سادگی اور تواضع مثالی تھی ازواج کے ساتھ آپؐ کا رویہ انتہائی نرمی اور محبت کا رویہ تھا۔ اپنی بیٹی فاطمہؑ کے ساتھ آپ کا سلوک لوگوں کیلیے باعثِ حیرت اور تعجب تھا آپؐ نے اپنی محبت اور شفقت کے اظہار کے لیے جو تشبیہات وکلمات استعمال کیے ہیں ان میں ایک خاص معنویت ہے عمارؓ کے متعلق آپؐ نے فرمایا "عمار میری دونوں آنکھوں کے درمیان کا پوست ہے۔ حضرت علی کے بارے میں ارشاد ہوا علی مجھ سے ہے اور میں علیؑ سے ہوں" اور اپنی پارۂ جگر جناب فاطمہؑ کے بارے میں آپؐ کا قول ہے۔ فاطمہ میرا جزو ہے۔ میرے جسم کا ٹکڑا ہے۔

اور جہاں تک حسنؑ اور حسینؑ کا تعلق ہے تو کس کو نہیں معلوم کہ پیغمبرؐ نے ان سے کس کس طرح اظہارِ محبت نہیں کیا۔ پیغمبر کو ان بیٹوں سے خصوصی محبت تھی خصوصاً اس لیے کہ تقدیر نے آپؐ کو فرزندوں سے محروم رکھا تھا۔ حالانکہ آپؐ بیٹیوں سے جس قدر محبت کرتے تھے اور جس حد تک ان کو عزیز رکھتے تھے اس کا تصور آج کے ترقی یافتہ انسان کیلئے بھی ممکن نہیں ہے۔ مگر پھر بھی آپؐ کے دل میں بیٹوں کی تمنا ہونا ایک فطری بات تھی مگر تقدیر کو یہی منظور تھا کہ آپؐ کی تمام اولاد میں صرف ایک بیٹی ہی زندہ رہے اور اب اس اکیلی بیٹی کو اللہ نے دو فرزند عطا کئے تھے، فاطمہؑ کے بیٹوں کی شکل میں رسولؐ نے دو ایسے فرزند پالیے جن سے آپؐ کی محبت اس قدر شدید اور بے پایاں تھی جو ہمیشہ لوگوں کو حیرت اور تعجب میں مبتلا کر دیتی ہے۔

ایک دن آپؐ خانۂ فاطمہؑ میں تشریف لائے، یہ آپ کا روز کا معمول تھا اور جب سے حسینؑ کی ولادت ہوئی تھی آپؐ کو جب بھی موقع ملتا ضرور خانۂ فاطمہؑ میں رونق افروز ہوتے۔

اس دن ایسا ہوا کہ جب آپؐ اپنی بیٹی کے گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ علیؑ

اور فاطمہؑ دونوں محو خواب ہیں اور حسنؑ بھوکے ہیں اور گریہ کر رہے ہیں کیونکہ انہیں اپنی بھوک مٹانے کے لیے کچھ مل نہیں رہا ہے۔ پیغمبرؐ نے یہ منظر دیکھا آپ نے یہ پسند نہیں کیا کہ اپنی عزیز ترین اور محبوب ترین ہستیوں میں سے کسی کو بیدار کریں، آپ تیزی سے مگر بے آواز ننگے پاؤں چلتے ہوئے صحن خانہ میں تشریف لے گئے۔ جہاں ایک دنبی موجود تھی آپؐ نے اس کا دودھ دوہا اور وہ اپنے ہاتھوں سے بچہؑ کو پلایا تاکہ بچہ سیر ہو کر چین سے سو جائے۔

ایک روز آپؐ در فاطمہؑ کے پاس سے تیزی سے گذر رہے تھے ناگہاں آپؐ کے کانوں میں حسینؑ کے رونے کی آواز پہنچی، آپ واپس مڑے۔ بیٹی کے گھر میں داخل ہوئے اور ایسی حالت میں کہ تمام جسم مبارک لرز رہا تھا فرمایا۔

"کیا تم نہیں جانتی ہو کہ اس کے رونے سے مجھے کس قدر اذیت ہوتی ہے"

اسامہ بن زید بن حارثہ جن کا ہم اس سے قبل بھی ذکر کر چکے ہیں۔ روایت کرتے ہیں کہ مجھے پیغمبرؐ سے کچھ کام تھا میں آپ کے در دولت پر حاضر ہوا۔ آپؐ گھر سے باہر تشریف لائے اور مجھ سے گفتگو فرمائی۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ پیغمبرؐ کے زیر جامہ کوئی چیز پنہاں ہے جس کی طرف آپؐ تمام وقت محبت سے نظر کرتے رہے مگر مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ پیغمبرؐ کی نگہہ لطف کا مرکز جو چیز ہے وہ در حقیقت کیا ہے جب میری بات ختم ہو گئی تو میں نے سوال کیا کہ یہ کیا ہے جسے آپ نے سینے سے لگا رکھا ہے۔

پیغمبرؐ کا چہرہ دفور انبساط و محبت سے چمکنے لگا۔ آپؐ نے اپنی عبا کے کنارے سرکائے تو میں نے دیکھا کہ حسنؑ اور حسینؑ ہیں جنہیں آپ نے سینے سے لگایا ہوا ہے۔

آپ نے چاہا کہ میرے لیے اپنے اس غیر معمولی اظہار محبت کی توجیہ فرمائیں، مگر آپؐ کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ اپنی نگاہیں ان بچوں سے ہٹا سکیں چنانچہ ایسی حالت میں آپ کی نگاہیں مسلسل ان بچوں پر مرکوز تھیں۔ آپ نے خود کلامی کے انداز میں فرمایا۔

یہ دونوں میرے فرزند ہیں۔ میری بیٹی کے بیٹے۔

اور اس کے بعد آپ کی آواز شدت جذبات سے لبریز ہو گئی اور آپ نے ایک ایسے لہجہ

ہیں جس کی توضیح نہیں کی جاسکتی مزید فرمایا

خداوندا میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان سے محبت کر، اور جو کوئی ان دونوں سے محبت رکھے تو بھی اس کو دوست رکھ۔

بقول ڈاکٹر عائشہ بنت الشاطی اگر پیغمبر کو یہ فیصلہ کرنے کا اختیار ہوتا کہ ان کی کون سی بیٹی ان کی پاک نسل کا سرچشمہ بنے اور ان کے کون سے داماد کو پدر اہل بیت ہونے کا شرف حاصل ہو تو وہ انہی دونوں ہستیوں کو منتخب کرتے جن کا انتخاب خدا نے اس مقصد کے لیے کیا تھا۔[1]

علیؑ و فاطمہؑ کے بچوں کے لیے پیغمبرؐ کا وجود ہمہ لطف و محبت تھا۔ وہ نانا تھے وہ باپ تھے ان کے خاندان کے دوست اور سرپرست تھے ان کے رفیق و دمساز تھے یہاں تک کہ وہ ان کے بچپنے کے کھیل میں ان کے ساتھی تھے بچے ان سے اپنی ماں اور باپ سے زیادہ مانوس اور بے تکلف تھے ایک روز پیغمبرؐ نے نماز میں سجدے کو اس قدر طول دیا کہ تمام نمازی حیرت اور تعجب کا شکار ہونے لگے اس لیے کہ پیغمبرؐ کی یہ عادت تھی کہ آپؐ نماز جماعت میں ہمیشہ تعجیل فرماتے تھے اور اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ نمازیوں میں کسی کمزور اور ضعیف شخص کے لیے نماز کا طول باعث زحمت نہ ہو اپنی اس عادت اور دستور کے برخلاف آپ کا سجدے کو غیر معمولی طول دینا لوگوں کے لیے حیرت اور تعجب کا باعث بنا۔

لوگوں کا خیال ہوا کہ یا تو کوئی حادثہ پیش آگیا ہے یا حالت سجدہ میں وحی کا نزول ہونے لگا ہے جب نماز ختم ہو چکی تو لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ سجدہ کی غیر معمولی طوالت کا سبب کیا تھا حضور نے فرمایا۔ حسینؑ سجدہ کی حالت میں میری پشت پر سوار ہو گیا تھا اس کی یہ عادت ہے کہ میں جب گھر میں نماز ادا کرتا ہوں تو وہ میری پشت پر سوار ہو جاتا ہے میرا دل اس بات پر راضی نہ ہوا کہ میں ایسی حالت میں سجدے سے سر اٹھاؤں کہ حسینؑ میری پشت پر سے گر پڑے اس لیے میں نے انتظار کیا تاکہ وہ خود میری پشت سے اتر جائے اس سبب سے مجھے سجدے کو اس قدر طول دینا پڑا۔

---

[1] بنات النبی (ص ۱۷۱) تصنیف ڈاکٹر عائشہ بنت الشاطی

پیغمبرؐ ہر مرحلہ پر اس بات کا اہتمام فرماتے تھے کہ لوگ بالخصوص آپؐ کے تمام اصحاب اس حقیقت کو جان لیں بلکہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ پیغمبرؐ ان دونوں بچوں، حسنؑ اور حسینؑ، ان کی مادر گرامی اور ان کے پدر بزرگوار کو کس قدر دوست رکھتے ہیں دنیا میں کوئی انسان کسی دوسرے شخص سے اتنی محبت نہیں کر سکتا جتنی محبت پیغمبرؐ کو ان ہستیوں سے تھی۔

یہی سبب ہے کہ حضور دوسروں کے سامنے اپنی بیٹی فاطمہ سے غیر معمولی محبت اور احترام کا مظاہرہ فرماتے تھے آپؐ ان کے ہاتھوں اور چہرہ کو بوسہ دیتے تھے۔ پیغمبرؐ کی خواہش تھی کہ لوگ جان لیں کہ آپؐ کو اپنی بیٹی، داماد اور نواسوں سے کیسا قلبی اور روحانی تعلق ہے اگر ایسا نہیں تھا تو پھر کیوں آپ مسلسل مسجد میں ان کی تعریف و ستائش فرماتے تھے۔ کیوں منبر سے ان کے فضائل بیان کرتے تھے۔ آپ کیوں بار بار اس خانوادہ سے اپنے روحانی اور جذباتی تعلق کا سرعام اظہار فرمایا کرتے تھے اور کیوں آپؐ ان ہستیوں کی مدح و ستائش کے بعد ان کلمات کا اضافہ فرماتے تھے کہ جو ان کو دوست رکھتا ہے اے خدا تو اس کو بھی دوست رکھ۔ کیوں آپؐ حسنؑ، حسینؑ، فاطمہؑ یا علیؑ کی نسبت یہ فرماتے تھے کہ ان کی خوشنودی میری خوشنودی ہے اور میری خوشنودی خدا کی خوشنودی ہے کس لیے آپؐ یہ ارشاد فرماتے تھے کہ جس نے انہیں سے کسی ایک کو یا ان سب کو آزار پہنچایا اس نے دراصل مجھے آزار پہنچایا اور جو مجھے آزار پہنچاتا ہے وہ خدا کی ناراضگی مول لیتا ہے۔

یہ ستائش، یہ اظہار محبت، یہ دوستی اور دشمنی کا ذکر اور اس کے ساتھ یہ تاکید کہ ان کی دوستی اور دشمنی خدا اور رسولؐ کی دوستی اور دشمنی کا پیمانہ ہے آخر پیغمبرؐ ان سب باتوں پر اس قدر زور کیوں دیتے تھے۔

ان تمام سوالوں کا جواب مستقبل میں مل جائے گا۔ اس خانوادہ کی سرگزشت اس خاندان کے ہر فرد کی داستان حیات ان تمام سوالوں کا جواب ہے۔

پیغمبرؐ کی راہ میں اور پیغمبرؐ کے واسطے اس خاندان نے مسلسل اور غیر معمولی قربانیاں پیش کیں ان قربانیوں کا سب سے پہلا مظہر فاطمہؑ ہیں پھر علیؑ، پھر حسنؑ، پھر حسینؑ اور

بالآخر زینبؑ

ہجرت کے پانچویں سال، امام حسینؑ کی ولادت کے ایک سال بعد اس خاندان میں ایک لڑکی کی ولادت ہوئی۔ قربانیوں کے سلسلہ میں اس خاندان کے لیے حسینؑ کے بعد اس لڑکی کی ضرورت ناگزیر تھی اس لیے یہ حسینؑ کے بعد بلا فصل پیدا ہوئی اس کا نام زینبؑ ہے

اور زینبؑ کے دو سال بعد ایک اور لڑکی کا اضافہ ہوا۔ ام کلثومؑ

زینبؑ ام کلثومؑ یہی دختران رسولؐ کے نام بھی تھے

درحقیقت فاطمہؑ وہ ہستی ہیں جو محمدؐ کے لیے سب کچھ ہیں وہ تنہا اپنے باپ کی تمام دنیا ہیں۔

پیغمبرؐ کی بیٹی زینب انتقال کر چکی ہیں رقیہ اور ام کلثوم بھی دنیا سے سدھار چکیں ہجرت کے آٹھویں سال خدا نے پیغمبرؐ کو ایک بیٹا عطا کیا۔ ابراہیمؑ مگر ولادت کے ایک سال بعد ہی وہ موت کی آغوش میں چلا گیا۔

اور اب پیغمبرؐ کی تمام اولاد میں صرف ایک ہستی زندہ ہے۔ فاطمہؑ اب پیغمبرؐ کی تمام دنیا، ان کی تمام امیدوں، آرزوؤں اور محبتوں کا مرکز فاطمہؑ ہیں اور ان کے بچے بے شک یہی اہل بیت پیغمبرؐ ہیں۔

حسنؑ اور حسینؑ سے پیغمبرؐ کی محبت بڑھتی جا رہی ہے اب یہی دونوں بچے ان کی زندگی ہیں انہیں جس قدر بھی وقت ملتا ہے وہ انہی کے ساتھ گذارتے ہیں۔

جب کبھی آپؐ گھر سے باہر جاتے ہیں۔ جہاں کہیں بھی جاتے ہیں مدینہ کے گلی کوچوں میں جس طرف سے گذرتے ہیں دونوں میں سے کوئی نہ کوئی بچہ آپؐ کے دوش مبارک پر سوار ہوتا ہے

ایک دن آپؐ مسجد میں منبر پہ خطبہ ارشاد کر رہے تھے تمام لوگ آپؐ کی طرف ہمہ تن گوش ہیں اچانک آپ کے نواسے اپنے گھر کے دروازے سے باہر آتے ہیں مسجد اور ان کا گھر اس طرح متصل ہے گویا مسجد ان کے گھر کا صحن ہے دونوں بچوں کے جسم پر سرخ پیراہن ہے بچے اس قدر چھوٹے ہیں کہ قدم جما کر نہیں چل سکتے بار بار لڑکھڑاتے

ہیں، اور گر پڑتے ہیں، ناگہاں پیغمبرؐ کی نگاہ ان پر پڑتی ہے اور پھر جم کر رہ جاتی ہے ان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی نظروں کو ان بچوں سے ہٹا سکیں آپ نے دیکھا کہ بچوں کو چلنے میں بڑی زحمت ہو رہی ہے۔ کبھی گرتے ہیں پھر سنبھل کر اٹھتے ہیں پیغمبرؐ یہ دیکھ کر بیتاب ہو جاتے ہیں اپنے خطبہ کو درمیان میں روک دیتے ہیں تیزی سے منبر سے اترتے ہیں، بچوں کو آغوش میں اٹھاتے ہیں اور پھر منبر پر واپس تشریف لاتے ہیں آپ دیکھتے ہیں کہ تمام لوگ حیرت سے آپؐ کی طرف نگراں ہیں اور آپ کی بے تابی اور اضطراب نے انہیں سخت متعجب کر دیا ہے آپؐ محسوس کرتے ہیں کہ جیسے لوگ یہ چاہتے ہوں کہ آپؐ اپنے خطبہ کو درمیان میں روکنے اور بچوں کے لیے اس قدر اضطراب اور بے چینی کا اظہار کرنے کے عمل کی بابت کچھ وضاحت فرمائیں۔

آپؐ نے اس حالت میں کہ دونوں بچوں کو اپنے پاس مہر و شفقت کے ساتھ منبر پر بٹھا رکھا تھا فرمایا:

بے شک خدا نے سچ کہا ہے۔ تمہارے مال اور تمہاری اولاد فتنہ (آزمائش) ہیں [۱]۔ میری نگاہ ان بچوں پر پڑی۔ میں نے دیکھا کہ انہیں چلنے میں دقت ہو رہی ہے یہ بار بار گر پڑتے ہیں۔ مجھ سے ان کی تکلیف برداشت نہ ہوئی اس لئے میں نے خطبہ کو روک دیا اور انہیں بڑھ کر اپنی آغوش میں اٹھا لیا۔

حسینؑ کے ساتھ آپؐ کی محبت کا انداز ہی اور تھا، یہ محبت اپنی شدت اور نزاکت ہر دو اعتبار سے حد سے بڑھی ہوئی تھی آپ ان کا بازو پکڑ لیتے، بچے کے ساتھ کھیلتے لسے لوریاں سناتے اسے اپنے سینہ پر سوار کر لیتے اسے کہتے اپنا منہ کھولو اور پھر نہایت محبت اور شوق کے عالم میں اس کے منہ کے بوسے لیتے۔ یہ محبت کی وہ حد ہے جس کا بیان الفاظ میں ممکن نہیں ہے آپ بچہ کا منہ چومتے جاتے اور وفور جذبات سے متاثر لہجہ میں فرماتے جاتے۔

خداوندا میں اس سے محبت کرتا ہوں تو بھی اسے اپنا دوست بنالے"

---

[۱] سورۃ تغابن (آیت ۱۵)

ایک روز آپؐ کی کہیں دعوت تھی اپنے چند اصحاب کے ساتھ آپؐ دعوت میں تشریف لے گئے، اپنے ہاتھ پھیلائے اور چاہا کہ اپنے اس نواسے کو زینتِ آغوش بنا لیں۔ بچہ نے بچوں والی معصومیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا" میں خود آپؐ کے پاس نہیں آؤں گا۔ آپؐ مجھے پکڑنے کی کوشش کریں یہ کہہ کے بچہ ادھر سے ادھر بھاگنے لگا۔ پیغمبرؐ مسکراتے جاتے تھے اور بچہ کا تعاقب کرتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ آپؐ نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ ایک ہاتھ اس کی پشت پر رکھا اور دوسرا اس کی تھوڑی کے نیچے پھر دفور شوق و محبت سے حسینؑ کے منہ کے بوسے لیے اور فرمایا۔

حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں۔۔۔۔ خداوندا تو اسے دوست رکھ جو حسینؑ کو دوست رکھے، پیغمبرؐ کے ساتھی آپؐ کے اس طرز عمل کو حیرت اور تعجب سے دیکھ رہے تھے ان میں سے ایک نے دوسروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

ذرا پیغمبرؐ کو دیکھو کہ اپنے نواسے کے ساتھ کیسا سلوک کر رہے تھے۔ بخدا میرے بھی ایک لڑکا ہے۔ مگر میں نے آج تک اسے کبھی پیار نہیں کیا۔ پیغمبرؐ اس شخص کی بے مہری اور خشونت کے اظہار سے بدمزہ ہوئے اور آپ نے فرمایا

جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جائے گا۔

روز و شب اسی طرح گذر رہے تھے اور ہر لمحہ فاطمہؑ کی زندگی میں مٹھاس گھول رہا تھا یہ فاطمہؑ کی زندگی کا وہ شیریں ترین دور تھا کہ جس نے ماضی کی تلخ یادوں اور دور گذشتہ کی مصیبتوں اور پریشانیوں کی یادیں آپؑ کے دل سے محو کر دی تھی۔

پھر فتح خیبر کے بعد یہودیوں نے فدک کا زرخیز علاقہ پیغمبرؐ کو ہدیہ کر دیا اور حضورؐ نے اسے فاطمہؑ کو عطا کر دیا اور فاطمہؑ جن کے گھر میں چار چھوٹے بچے تھے کچھ دنوں کے لیے فقر و تنگدستی کے حصار سے آزاد ہو گئیں۔

فتح مکہ

پھر فتح مکہ کا واقعہ پیش آیا اور فاطمہؑ اپنے فاتح باپ اور اپنے عظیم شوہر، جو لشکر

اسلام کے پرچم بردار تھے ، کے ہمراہ مکہ میں داخل ہوئیں آپ نے باطل پر حق کی اس عظیم ترین فتح کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ سرزمین جو آپؐ کی جائے ولادت تھی آپؐ کی نگاہوں کے سامنے تھی اور مکی زندگی کی تمام خوش گوار اور ناخوش گوار یادیں ایک ایک کر کے تازہ ہو رہی تھیں ، مسجد الحرام اور وہاں پیش آنے والا ناخوش گوار حادثہ ، خانۂ پدر ، اپنی بہنوں کے ساتھ گذارے ہوئے زندگی کے دن ۔ وہ بہنیں جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں ۔ وہ گھر جو آپؐ کا مولد تھا ، شعبِ ابوطالبؑ ، قبرِ ابوطالبؑ ، قبر خدیجہؑ ۔ خدیجہ جو آپؑ کی ماں تھیں ۔ ۔ ۔ ۔

رفتہ رفتہ حالات بدلتے ہیں ان کے پدر بزرگوار سختی اور مصیبت کے حصار سے نکل کر ہجرت فرماتے ہیں ان کی طاقت اور عظمت تیزی سے بڑھتی ہے ۔ تمام جزیرہ نمائے عرب ان کے زیرنگیں آجاتا ہے ۔ یہ وقت ان کے باپ کی طاقت ، عظمت ، فتح و کامرانی اور شادمانی کا مژدہ سنا رہا ہے ۔ اسی طرح ان کے شوہر علیؑ طاقت اور کامیابی کی مجسم کی علامت ہیں وہ بدر و احد ، خندق و خیبر ، فتح مکہ ، حنین وغیرہ غرض ہر مہم کے ہیرو ہیں ان کی تلوار نے باطل پر اسقدر کاری ضربیں لگائی ہیں کہ یوم خندق ان کی ایک ضرب قیامت تک تمام جن و انسانوں کی عبادت سے افضل ہے ۔

اور ان کے بچے جو ایک ایسی زندگی کا جو سراسر سختی و رنج سے عبارت ہے واحد شیریں ثمر ہیں جو گلزار عشق و ایمان کی بہار ہیں

جو نسل پیغمبرؐ اور نسل فاطمہؑ کی بقا اور تسلسل کی واحد ضمانت ہیں ، جو عترت کا دل ہیں جو اہلبیت پیغمبرؐ کا مرکز و محور ہیں ، خوخانۂ رسولؐ کے چشم و چراغ ہیں اور جو رسولؐ کی پاکیزہ نسل کا سرچشمہ ہیں ۔

یوں ہے جیسے فاطمہؑ کو خدا نے ان کے پدر بزرگوار کی زندگی کی تمام تلخیوں اور مصیبتوں کا مداوا بنا دیا ہے ۔ ہاں بے شک فاطمہؑ اپنے باپؐ کے لیے ہر طرح کی مسرت ، شادمانی اور فضیلت کا سرچشمہ ہیں ۔

فاطمہؑ کے لیے سب سے زیادہ اطمینان اور مسرت کا سبب یہ احساس ہے کہ ان

کے بچوں نے ان کے پدر بزرگوار کے قلب و روح کو احساسِ مسرت و شادمانی سے اس طرح سیراب کر دیا ہے کہ وہ ماضی کی تمام تلخیوں اور محرومیوں کو بھول گئے ہیں فاطمہ سے بڑھ کر اپنے باپؐ کے دکھ درد کا محرم اور کون ہے وہ جانتی ہیں کہ ان کے باپ کا دل اپنے کم سن بیٹوں کی موت کے صدمہ سے مجروح ہے۔ ان کی تمام بیٹیاں، سوائے ایک (فاطمہؑ) کے عالم جوانی میں انتقال کر گئیں۔ ہر چند پیغمبرؐ نے خدیجہؑ کے بعد تیرہ شادیاں کیں مگر کسی بیوی سے کوئی اولاد نہ ہو سکی۔ آخر عمر میں ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے ابراہیمؑ پیدا ہوئے وہ بھی عالم شیر خوارگی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اب فقط فاطمہؑ کے بچے ہیں۔ حسنؑ، حسینؑ، زینبؑ اور ام کلثومؑ جن کا دیدار رسولؐ کی آنکھوں کو ٹھنڈک بخشتا ہے اور جن کا وجود اور جن کی محبت پیغمبرؐ کے لیے شیرینیٔ حیات کا واحد سرچشمہ ہے۔ آپ کی تمام زندگی میں رنج و مصیبت کی تلخی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ مگر قدرت نے اولادِ فاطمہؑ کے ذریعے آپؐ کی زندگی کی تلخ کامی کو شہد و شکر کی شیرینی سے بدل دیا ہے اب حضورؐ کا سن ساٹھ سال سے تجاوز کر گیا ہے اور اس سن و سال میں آپؐ کو ہمیشہ سے زیادہ ان بچوں کی ضرورت ہے۔

زندگی بہت مہربان نظر آتی ہے۔ فاطمہؑ کے چہرے پر خوشی کے آثار ہویدا ہیں فاطمہؑ کے گھر کے چاروں طرف خوشبختی، افتخار اور کرامت کا ایک نورانی ہالہ ہے۔ فاطمہؑ اپنے پدر بزرگوار کی ناقابلِ بیان محبت، اپنے شوہر کی بے مثال عظمت اور اپنے بچوں کی زندگی بخش محبت کی نعمتوں اور راحتوں سے سرشار، مطمئن، آسودہ، پُرمسرت اور پُرافتخار زندگی گذار رہی ہیں ایک ایسی زندگی جو ہر طرح کے اضطراب و انتشار سے بے نیاز ہے جہاں ہر رنج سے چین ہے آرام ہے، راحت ہے، مسرت ہے، جہاں قلب بھی مطمئن ہے اور روح بھی مسرور ہے۔

مگر یہ ساری مسرت اور شادکامی، اطمینان و سکون کا یہ دور ایک طوفان سے پہلے کا مختصر وقفہ ہے۔ بہت جلد ان کی زندگی، طوفان کی لپیٹ میں آ گئی۔ سیاہ وہولناک طوفان جو ان کے آشیانہ کو برباد اور ان کے گھر کو ویران کرنے والا تھا۔

رحلتِ پیغمبرؐ

پیغمبرؐ پر مرض نے حملہ کر دیا۔ وہ صاحبِ فراش ہو گئے!
پھر ان میں اتنی طاقت بھی نہیں رہی کہ وہ اُٹھ سکیں!

فاطمہؑ کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ لوگوں کے رخ بدل گئے ہیں انہوں نے آنکھیں پھیر لیں۔ مدینہ کی فضاء پاکیزگی اور نیکی کے بدلے کینہ و ہراس سے لبریز ہو رہی ہے یثرب میں جہاں ایمان اور اخلاص کے پھول کھلتے تھے اب سیاست کی بادِ سموم چل رہی ہے پیمانِ اخوتِ اسلامی ٹوٹ رہے ہیں اور ان کی جگہ پرانی قبائلی عصبیتیں پھر سے سر اٹھا رہی ہیں۔

اب پیغمبرؐ کا حکم نہیں مانا جاتا حضورؐ نے علیؑ کو طلب فرمایا۔ مگر عائشہ اور حفصہ نے ابوبکر اور عمر کو بلالیا۔

فاطمہؑ نے کل مسجدِ نبوی میں حضرت عمر کے نماز پڑھانے کی آواز سنی تھی آج حضرت ابوبکر کی آواز سن رہی ہیں

فاطمہؑ دیکھ رہی ہیں کہ لشکر اسامہ ٹھہرا ہوا ہے اور ان کے پدر بزرگوار کے اصرار حتیٰ کہ نفرین کے باوجود لوگ حرکت نہیں کر رہے چاروں طرف سے اسامہ کے بحیثیت سالار لشکر انتخاب پر اعتراض کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں درآنحالیکہ یہ انتخاب خود پیغمبرؐ نے فرمایا تھا۔

اور آج پنجشنبہ ہے مگر ہائے کون سا پنجشنبہ ان کے پدر بزرگوار کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہو رہی ہے۔ پیغمبرؐ نے حکم دیا ہے کاغذ اور قلم لاؤ تاکہ میں تمہارے لیے ایک ایسا نوشتہ لکھ دوں کہ تم میرے بعد گمراہ نہ ہو سکو۔ لوگ اس حکم کو نہیں مانتے شور و غل برپا کرتے ہیں کہتے ہیں کہ (معاذ اللہ) گفتارِ پیغمبرؐ ہذیان ہے ہمارے پاس کتابِ خدا ہے پھر ہمیں کسی نوشتہ کی کیا ضرورت ہے۔

اب پیغمبرؐ میں گفتگو کرنے کی طاقت بھی نہیں رہی خانۂ عائشہؓ خاموش ہے۔ پیغمبرؐ کا سر علیؑ کی آغوش میں ہے ان کے لب خاموش ہیں۔ مگر ان کی آنکھیں اپنی بیٹی

سے گفتگو کر رہی ہیں۔

فاطمہؑ اپنے پدر بزرگوار کی اس بے چارگی کی تاب نہیں لا سکیں۔ وہ خود سے کہتی ہیں یہ میرے "پدر بزرگوار ہیں اور میں "ام ابیہا" ہوں کیا یہ مجھے اس شہر کی اس ناساز گار فضا میں تنہا چھوڑ دیں گے۔ وہ مجھ سے اپنی نگاہیں نہیں ہٹاتے۔ ہمیشہ سے زیادہ اس وقت میری طرف متوجہ ہیں۔ شاید انہوں نے میرے چہرہ پر میری دلی کیفیت کو پڑھ لیا ہے۔ یقیناً ان کا دل میرے غم کی آگ میں جل رہا ہے میں فاطمہؑ جو ان کی سب سے چھوٹی مگر سب سے پیاری بیٹی ہوں۔

وہ آنکھ سے اشارہ کرتے ہیں۔ میں اپنے کان ان کے لبوں کے نزدیک لے جاتی ہوں وہ سرگوشی کرتے ہیں۔ یہ بیماری، بیماری مرگ ہے میں دنیا سے رخصت ہو رہا ہوں

میں نے اپنا سر ہٹا لیا۔ بدبختی اور مصیبت کے پہاڑ میرے سر پر ٹوٹ پڑے میری طاقت جواب دینے لگی مجھے اپنے والد کی جدائی کا داغ سہنا ہوگا۔ یہ مصیبت مجھ سے کیسے برداشت ہوگی نزدیک تھا کہ میرا دل غم سے پارہ پارہ ہو جائے

مگر یہ خبر صرف مجھی کو کیوں دی گئی ہے حالانکہ میں اس خبر غم کو برداشت کرنے کی سب سے کم تاب رکھتی ہوں۔

لیکن میرے باپ کی نگاہیں صرف مجھ پر جمی ہوئی ہیں وہ صرف میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ یہ نگاہیں کہہ رہی ہیں کہ ان کا دل اپنی بیٹی کے غم میں جل رہا ہے یہ بیٹی وہ ہے جو اپنے باپ کو بہت محبوب رہی ہے۔ جو بچپنے سے اپنے باپ کی شفقت اور محبت کا مرکز رہی ہے۔ پیغمبرؐ پھر اشارہ کرتے ہیں کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ میں پھر ان کے لبوں سے نزدیک ہو جاتی ہوں۔ وہ فرماتے ہیں کہ "تو اے میری بیٹی، وہ پہلا فرد ہوگی جو میرے خانوادہ میں سے میرے پیچھے آکر مجھ سے مل جائے گی"

آپؐ نے مزید فرمایا "فاطمہؑ کیا اس بات سے راضی نہیں ہو کہ تم اس امت کی عورتوں کی سردار ہو"

اللہ اکبر! کیسی عظیم تسلی ہے۔ کیا عجیب مژدہ ہے۔ اے پدر بزرگوار آپؐ پر آفرین

ہو۔ آپؐ خوب سمجھ سکتے تھے کہ فاطمہؑ کے لیے اس وقت کیسی تسلی کی ضرورت ہے وہ کون سا مژدہ ہے جو اس کے غم کی آگ کو سرد کر سکتا ہے یہ حرفِ تسلی، یہ مژدہ خود میری خبرِ مرگ کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ کیا خوب میری موت مجھے اپنے باپ سے بہت جلد ملا دے گی۔ اب مجھ پر یہ راز کھل گیا کہ کیوں آپؐ نے اس اطلاع کے لیے اپنی خبرِ مرگ کے لیے تمام لوگوں کو چھوڑ کر صرف میرا انتخاب کیا

اب میری طاقت بحال ہونے لگی ہے کہ میں اس غم کو برداشت کر سکوں آہ وزاری کر سکوں میں ابو طالبؑ کے کہے ہوئے ایک شعر کی تکرار کرتی ہوں۔

وابیض یستسقی الغمام بوجہہ ثمال الیتامیٰ عصمۃ الارامل[1]

اچانک میرے پدرِ بزرگوار اپنی آنکھیں کھولتے ہیں۔ فاطمہؑ یہ شعر میری مدح میں ابو طالبؑ نے کہا تھا مگر یہ وقت شعر پڑھنے کا نہیں ہے۔ قرآن پڑھو بیٹی قرآن!

"محمدؐ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں ان سے پہلے اور رسول بھی گذر چکے ہیں پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے"[2]

پھر آپؐ نے فرمایا۔۔۔

خدا لعنت کرے اس قوم پر جو اپنے پیغمبر کی قبر کو عبادت گاہ بنا لیتی ہے

اس کے بعد آپ نے خود کلامی کے انداز میں فرمایا۔

کیا ظالموں اور جابر حکمرانوں کا ٹھکانہ جہنم نہیں ہے۔

آپ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔

آخرت میں اچھا گھر ان لوگوں کے لیے ہے جو زمین پر ظلم و فساد برپا نہیں کرتے جو کوئی عذابِ جہنم سے بچنا چاہتا ہو وہ ظلم و فساد سے گریز کرے

۱۔ ان کا چہرہ اس قدر روشن اور سفید ہے کہ اس سے بادل پانی طلب کرتے ہیں۔ یہ یتیموں کا سہارا اور بیواؤں کی پناہ گاہ ہیں۔

۲۔ سورۃ آلِ عمران (آیت ۱۴۴)

وہ لوگ جنہوں نے انہیں لکھنے کا سامان فراہم نہیں کیا تھا۔ چاہتے ہیں کہ پیغمبرؐ زبانی فرمادیں کہ وہ کیا لکھنا چاہتے تھے۔

پیغمبرؐ ان لوگوں کی طرف رنجیدہ ہو کر دیکھتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ میں جو بات کرنے والا تھا وہ اس سے کہیں بہتر ہے جس کا تم مجھ سے مطالبہ کر رہے ہو۔

لوگ آپؐ سے سوال کر رہے ہیں کہ آپؐ آخر کیا لکھنا چاہتے ہیں اس کی وضاحت فرمادیں آپ ارشاد فرماتے ہیں:۔

میں تمہیں تین باتوں کی وصیت کرتا ہوں

- اوّل یہ کہ مشرکوں کو جزیرۃ العرب سے باہر نکال دیا جائے
- دوم یہ کہ قبائلی وفود کی پذیرائی اسی طرح کی جائے جس طرح میں ان کی پذیرائی کرتا رہا ہوں۔
- اور سوم۔ اس مرحلہ پر آپؐ نے سکوت فرمایا

ناگہاں سب کی آنکھیں علیؑ کی طرف اٹھ گئیں۔ علیؑ اپنی سوچ میں غلطاں اور وفورِ غم کے سبب خاموش تھے۔ پیغمبرؐ کا سکوت طولانی ہوتا جا رہا ہے ان کی آنکھیں ایک کونے کی طرف تھیں اور ان سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے وہ اپنی فکر میں غرق تھے کہ تمام لوگ وہاں سے چلے گئے۔

اپنے باپ کے غم نے مجھے بے چین کر دیا اور میں حالتِ غم میں فریاد کرتی ہوں اے بابا جان آپ کے غم نے مجھ پر غم و اندوہ کے پہاڑ توڑ دیئے ہیں۔

انہوں نے میری اس بات کے جواب میں ایک ایسے لہجہ میں جس سے اطمینان اور آسودگی جھلک رہی تھی۔ فرمایا آج کے بعد تمہارے باپ کے لیے کوئی غم و اندوہ نہیں ہے

اس کے بعد میرے پدر بزرگوار کے لب بند ہو گئے۔

وہ لبہائے مبارک کہ جو پیغامِ وحی کی ترجمانی کرتے رہے وہ لب ہائے مبارک جو اپنی بیٹی اور اس کے بچوں کو اظہارِ شفقت کے طور پر چومتے رہے وہ اب ساکت ہو گئے تھے، بند ہو گئے تھے انہوں نے بہت دیر تک میری طرف دیکھا اور وہ ،

نگاہیں بند ہوگئیں حلق سے خون بہنے لگا۔

ان کا سر مبارک علیؑ کے سینہ پر تھا علیؑ پر ایک اندوہناک خموشی طاری تھی ایسا لگتا تھا جیسے کوئی مردہ ساکت وصامت بیٹھا ہو۔

ہر طرف سکوتِ مرگ طاری تھا تمام فضا بوجھل تھی یہ وحشتناک لمحے رفتہ رفتہ گذر رہے تھے اچانک پیغمبرؐ کے دونوں ہاتھ جو اسامہ کے سر پر دعا کے لیے بلند تھے ان کے پہلوؤں میں گر گئے لب ہائے مبارک کو حرکت ہوئی آواز آئی۔

الی الرفیق الاعلیٰ اور اس کے بعد سب کچھ تمام ہوگیا

اتباہ یا ابتاہ (بابا جان! اے بابا جان)

اجاب ربا دعاہ (آپؐ نے اپنے رب کی دعوت کو قبول کر لیا ہے)

الی جبریل ینعاہ (آپؐ جبریل کے مسکن کی طرف چلے گئے)

ناگہاں باہر شور وغل کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ شہر تردد اور ہراس کی لپیٹ میں آگیا میں نے حضرت عمر کی آواز سنی وہ کہہ رہے تھے کہ "نہیں پیغمبرؐ کی موت نہیں آئی وہ جناب عیسیٰؑ کی طرح آسمان پر چلے گئے ہیں اور پھر لوٹ کر آئیں گے جو کوئی یہ کہے گا کہ پیغمبرؐ مر گئے وہ منافق ہے۔ میں اس کی گردن اڑا دوں گا"؟

کچھ دیر بعد خاموشی چھاگئی۔ میں نے دیکھا کہ دونوں، حضرت ابوبکر و عمر آئے حضرت ابوبکر نے میرے بابا کے چہرے سے چادر ہٹا کر دیکھا گریہ کیا اور چلے گئے۔ حضرت عمر بھی ان کے ساتھ ہی چلے گئے۔

علیؑ پیغمبرؐ کے غسل وکفن کے انتظامات میں مصروف تھے

میرے شوہر ابوالحسن میرے بابا کے پاک بدن کو غسل دیتے جاتے تھے وہ پیغمبرؐ کے تنِ اطہر پر پانی ڈال رہے تھے مگر خود ان کے وجود میں آتش غم بھڑک رہی تھی لوگوں نے اپنے پیغمبرؐ کو کھو دیا۔ بے پناہوں سے ان کی پناہ چھن گئی اصحاب اپنے شفیق رہبر سے محروم ہوگئے۔ مگر میرا اور علیؑ کا معاملہ بالکل مختلف تھا۔ ہم سے ہمارا سب کچھ چھن گیا ناگہاں مجھے احساس ہوا کہ ہم دونوں اس شہر میں اس

دنیا میں بالکل تنہا رہ گئے ہیں نہ ہمارا کوئی مونس ہے اور نہ ہمدم و غم خوار یوں لگتا تھا جیسے یکلخت ہر شے بدل گئی ہے ہر چہرہ تبدیل ہو گیا ہے درو دیوار تک سے وحشت برس رہی ہو اب صداقت کی جگہ سیاست نے قدم جما لیے تھے۔ عہد مواخات کے ذریعے جو برادری کے رشتے قائم ہوئے تھے وہ ٹوٹ گئے تھے اور ان کی جگہ عہد جاہلیت کے خاندانی قبائل اور قبائلی رشتے پھر سے استوار ہونے لگے بھائی ایک دوسرے سے دور ہو گئے اور ہم قبیلہ باہم نزدیک آ گئے ادھر میرے پدر بزرگوار رسولؐ خدا موت سے ہم کنار ہو چکے تھے اور ادھر شیوخیت اور اشرافیت کے تن مردہ میں پھر سے جان پڑ گئی تھی۔

میرے اور علیؑ کے لیے یہ حادثہ اسقدر سنگین، وحشتناک اور اندوہناک تھا کہ ہم مرگ پیغمبرؐ کے علاوہ کوئی اور بات سوچ ہی نہیں سکتے تھے ایک طرف مدینہ کی فضا سیاسیات کی منصوبہ سازی اور آویزش و کشمکش سے پر تھی اور دوسری طرف ہمارے لیے زندگی ایک مکمل خلا بن گئی تھی۔

ایسے میں ہمارے سب سے بڑے چچا عباس آئے ان کے چہرے پر خوف کے بادل سایا کیے ہوئے تھے انہوں نے با معنی مگر پر تشویش لہجہ میں علیؑ سے خطاب کیا۔

"اپنا ہاتھ آگے بڑھاؤ۔ میں تمہارے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں تاکہ لوگ یہ کہہ سکیں کہ پیغمبرؐ کے چچا نے پیغمبرؐ کے عم زاد کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے۔ خاندان کے دیگر لوگ بھی تمہارے ہاتھ پر بیعت کر لیں گے اور جب یہ کام انجام پا جائے گا تو پھر دوسروں کے لیے......"

"اچھا! کیا دوسرے اس بات کی طمع کر رہے ہیں؟"

"تمہیں کل سب کچھ معلوم ہو جائے گا"

علیؑ نے خطرے کا احساس کیا۔ لیکن جس طرح بجلی کا کوندا ایک لمحہ کے لیے کوندتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے اسی طرح یہ احساس علیؑ کے دل میں ایک لمحہ کے لیے ابھرا اور پھر غائب ہو گیا ان کا باطنی وجود تو غم پیغمبرؐ سے لبریز تھا محمدؐ، قرابت دار

پدر، ، سرپرست، آموزگار، برادر، دوست، رہبر، پیمبر غرض علیؑ کے لیے کیا کچھ نہیں تھے۔ وہ علیؑ کی ہستی کا تمام سرمایہ تھے وہ ان کے تمام ایمان و احساس کا مرکز تھے۔ علیؑ کی تمام دنیا پیغبرؐ کی ذات تھی ان کے لیے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ رحلتِ پیغمبرؐ کے علاوہ کسی بات کے متعلق کچھ سوچ سکیں۔ گویا ان کے لیے خانۂ پیغمبرؐ سے باہر کی دنیا کوئی وجود ہی نہیں رکھتی ان کا تمام وجود احساس غم کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا وہ پیغمبرؐ کو غسل دے رہے تھے۔ وہ کارِ پیغمبرؐ میں منہمک تھے اور یہیں۔ دخترِ رسولؐ علیؑ کے بچوں یعنی خود اپنے بچوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

یہ حسنؑ ہے جو سات سال کا ہے حسینؑ کی عمر ابھی صرف چھ سال ہے زینبؑ پانچ سال کی ہے اور ام کلثومؑ تو ابھی صرف تیسرے سال میں ہے یہ بچے، میرے پارہ ہائے دل ابھی بہت کم سن ہیں اور پیغمبرؐ کے بعد ان کی تقدیر لوگوں کے بغض و عداوت کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتی۔

بیرون شہر سقیفہ کے مقام پر پیغمبرؐ کے مدنی دوست، انصار، جمع ہیں تاکہ گروہِ انصار میں سے کسی کو پیغمبرؐ کا جانشین منتخب کرلیں انہیں احساس ہے کہ مہاجرین مکہ اس سلسلہ میں کچھ اور منصوبہ بنائے ہیں۔ حضرت ابوبکر و عمر و عبیدہ سقیفہ پہنچتے ہیں وہ انصار کے سامنے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے فرمایا "آئمہ قریش میں سے ہوں گے" اس استدلال سے وہ انصار کو اس بات پر آمادہ کرلیتے ہیں کہ پیغمبرؐ کا جانشین ان کے قرابتداروں میں سے ہونا چاہیئے مگر اس دلیل کا نتیجہ کیا برآمد ہوا حضرت ابوبکر کو سقیفہ میں خلیفہ منتخب کرلیا گیا۔

یہ اندازہ کرنا ممکن ہی نہیں ہے کہ اس فیصلہ سے فاطمہؑ کے حساس اور آگاہ دل پر کیا گذری ہوگی۔ دنیا میں کوئی بیٹی اپنے باپ سے جس قدر محبت کرسکتی ہے فاطمہؑ کی اپنے باپ سے محبت اس سے کہیں زیادہ پرجوش اور گہری تھی انہیں اپنے باپ سے والہانہ محبت تھی۔ یہ وہ بیٹی تھی جسے "ام ابیہا" (اپنے باپ کی ماں) کا لقب دیا گیا تھا۔ یہ پیغمبرؐ کی غربت اور تنہائی کی ہمدم، ان کے رنج و غم میں ان کے لیے باعثِ تسکین و تسلی تھی یہ

ان کے جہاد کی ساتھی بھی تھیں اور ان کے حصار غم میں بھی ان کی رفیق و دمساز تھیں۔ یہ پیغمبرؐ کی سب سے آخری اولاد تھیں جو اپنے باپ کی کبرسنی کے دور میں پیدا ہوئی یہ سب سے چھوٹی، سب سے چہیتی بیٹی جو پیغمبرؐ کے آخری ایام میں ان کی واحد اولاد تھی اور جو ان کی رحلت کے بعد ان کی تنہا وارث، ان کی عترت کا واحد چراغ ان کے خاندان کا واحد سہارا۔ ان کی نسل کی بقاء کی واحد ضمانت ہے۔ صرف یہی وہ بیٹی ہے جس سے رسولؐ کی نسل چلی۔ یہ تنہا معدنِ رسالت اور سرچشمۂ ذریت و عترت ہے یہ زوجۂ علیؑ ہے ہاں یہ فاطمہؑ ہے۔

اور فاطمہؑ کو آغوشِ مادر ہی میں ایک آزمائشی زندگی سے سابقہ پڑا۔ اپنی ماں اور باپ کے سائے میں ان کی زندگی ابتداء ہی سے آلام و مصائب کا شکار رہی اس لیے کہ وہ ایک ایسے وقت میں پیدا ہوئیں جب ان کی ماں کی دولت اور ان کی زندگی کا پرسکون دور ختم ہو چکا تھا ان کی والدہ ضعیف اور کمزور ہو چکی تھیں ان کا سن ۶۵ برس کا ہو چکا تھا خوش نصیبی فارغ البالی اور کامیابی کی جگہ اب فقر و فاقہ سختی اور مصیبت کا دور دورہ تھا اپنے اور بیگانے سب ہی مخالف تھے۔

خدیجہ وہ عظیم ہستی جو رسولؐ کی صرف شریکِ حیات ہی نہیں تھیں بلکہ شریکِ کار بھی تھیں پیغمبرؐ کی سب سے پہلی اور سب سے زیادہ با اعتماد ساتھی تھیں یہ ایک ایسے عظیم انسان کے دکھ درد کی شریک تھیں جو اپنے شانوں پر دنیا کی عظیم ترین رسالت کا بار اٹھائے ہوئے تھا یہ وہ رسالت ہے جو جاہلیت کی تاریکیوں میں روشنی کی علامت ہے جو سرما کی سرد راتوں میں ٹھٹھرنے والے انسانوں کو حرارتِ ایمان بخشنے والی ہے یہ اقتصادی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے، انسانوں کے لیے آزادی کا مژدہ ہے یہ ہر طرح کے ظلم و جہالت اور ہر بت پرستی کے خلاف اعلانِ جہاد ہے۔ یہ سب سے بڑی رسالت اور سب سے آخری نبوت کی منزل ہے اور خدیجہؑ مادرِ فاطمہؑ اس عظیم ذمہ داری میں پوری طرح شریک ہیں۔ ہمہ تن خدمتِ پیغمبرؐ میں مصروف ہیں۔

ادھر پیغمبرؐ کے باطن میں ایک روحانی انقلاب برپا ہو چکا ہے ان کی فکر و احساس مادی سطح سے بلند اور زندگی حقیقی اور دائمی فوز و فلاح کی طرف منعطف ہو چکی ہے۔ مادہ پرستوں کی دشمنی، ان کے بغض و عداوت اور ان کی کینہ پروری کی آگ نے تمام ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ مادر فاطمہؑ محمدؐ کے مسائل اور ان کی انقلابی تحریک میں منہمک ہیں اور محمدؐ خود اپنے انقلابی مشن کی طرف پوری طرح متوجہ ہیں۔ ان کا تمام وقت اور تمام توانائیاں، پیغام الٰہی کی تبلیغ اور لوگوں کی بھلائی کی جدوجہد کے لیے وقف ہیں اور ایسے میں فاطمہؑ جو اپنی عمر کی اس منزل میں ہیں جہاں انہیں ماں کی محبت اور باپ کی شفقت کی شدید ضرورت ہے یہ محسوس کرتی ہیں ان کے ماں باپ تو خود ان کی توجہ اور خدمت کے محتاج ہیں خود ان کی طفلانہ اور معصوم محبت کے طلبگار ہیں انہوں نے دیکھا کہ ان کے والدین کی زندگی کا بیشتر حصہ رنج و مصیبت اور امتحان و آزمائش کا شکار رہا ہے ان کے والدین کی باہمی محبت رنج و مصیبت کے سائے میں پروان چڑھ کر رفاقت اور خلوص کی انتہائی بلند اور ناقابل شکست حدوں تک پہنچ چکی ہے ان کی ماں خدیجہؑ ان کے باپؐ محمدؐ کی وہ رفیق حیات تھیں جس نے ہر امتحان اور آزمائش میں ان کا ساتھ دیا یہاں تک کہ اپنے شوہر کے ساتھ ان کی زندگی گویا "مرگ مشترک" کا نمونہ تھی ان دونوں کا مشترک گھر ان کے باپ کی بے گھری کا واحد تدارک تھا۔ ان کی ماں نے ان کے باپ کا اس وقت ساتھ دیا جب اپنے اور بیگانے سب ان کا ساتھ چھوڑ گئے تھے انہوں نے پیغمبرؐ سے اس وقت محبت اور خلوص برتا جب وہ ہر شخص کی دشمنی اور نفرت کا نشانہ تھے۔ جب وہ تنہا تھے تو یہ ان کی رفیق تھیں یہ ان کی مونس و غمخوار تھیں۔ ان کی ہمت بڑھانے والی اور ان کے دکھ درد بانٹنے والی تھیں۔

کہا جاتا ہے کہ وہ محبت جو رنج اور مصیبت کے سائے میں پروان چڑھتی ہے اس محبت سے جو خوشحالی اور مسرت کے ماحول میں پروان چڑھے کہیں زیادہ گہری اور سچی ہوتی ہے اس محبت میں روح لطافت کے اس نکتہ کمال تک پہنچ جاتی

ہے۔ جہاں دوست کی دوستی، دوست پر ایمان بن جاتی ہے جہاں اگر دوست کے لیے جان قربان کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو انسان اس قربانی کو بخوشی قبول کر لیتا ہے۔ جہاں انسان اپنے وجود کی گہرائیوں میں دوست کے ساتھ یگانگت محسوس کرتا ہے اور اسی احساس کے سہارے زندہ رہتا ہے دوست بھی اپنے دوست کی محبت کا جواب دیتا ہے۔ محبت اور عشق دوستی کی لطافت اور پاکیزگی کی بلند ترین سطح ہے دونوں ایک ہی جذبہ نہیں ہیں۔ بظاہر دوستی اور محبت ایک ہی بات نظر آتے ہیں لیکن ان کی جہتیں مختلف ہیں دوستی دوطرفہ عمل ہے دوطرفہ ایثار اور اشتراک کی جہت ہے جبکہ عشق تسلیم و ایثار کی منزل ہے۔ محبوب کی رضا اور خوشنودی کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینے والی منزل ہے عشق خود اپنا اجر ہے عاشق محبوب سے کوئی اجر کوئی معاوضہ کوئی قیمت طلب نہیں کرتا۔ عشق اور دوستی دو مختلف بلکہ ایک حد تک متضاد جہت رکھنے والے جذبہ ہیں۔

فاطمہؓ کو اپنے باپ سے والہانہ محبت تھی اور یہ محبت اس حد پر تھی کہ جس حد تک دنیا میں کوئی اور بیٹی اپنے باپ سے محبت نہیں کر سکتی اپنے باپ سے ان کی محبت اور ان کا تعلق ناقابلِ شکست اور ان کا خلوص ناقابلِ بیان حد تک گہرا تھا اور اسی تعلق اور احساس یگانگت نے انہیں وہ ہمت اور توانائی عطا کی جس کی بدولت انہوں نے اپنی زندگی کے تمام آلام و مصائب کا مقابلہ کیا وہ ان حالات سے دوچار تھیں جن کی توضیح و تشریح ممکن نہیں ہے۔ ان کے عظیم اور بلند ہمت پدر بزرگوار چاروں طرف سے عداوت اور دشمنی کا نشانہ تھے وہ اپنے وطن میں اجنبی اور اپنے شہر میں بیگانہ تھے وہ اپنے لوگوں کے ہجوم میں تنہا تھے اپنے رشتہ داروں کی محبت سے محروم تھے وہ اپنے ہم زبانوں کے درمیان تھے مگر کوئی بھی ان کا ہم آواز نہیں تھا وہ جہل و بت پرستی کے چوطرفہ حملوں کی زد پر تھے۔ وحشی، شوخ، پست اشراف، دولت کے پجاریوں اور غلامی کا کاروبار کرتے والے کمینہ فطرت لوگوں سے ان کی زبردست کشمکش اور تصادم تھا اپنے شانوں پر رسالت کا عظیم بار لیے

وہ یکہ و تنہا تھے۔ کوئی ان کا مونس و ہمدم نہیں تھا اس طویل راہ میں جو غلامی سے آزادی تک کی راہ ہے۔ ان کا کوئی ہمسفر نہیں تھا مکہ کی تاریک وادیوں سے حرا کی پرنور چوٹیوں تک۔ وہ اکیلے تھے ان کی روح عوام کی بے حسی، فکری جمود، جہالت اور کینہ پروری کے سبب رنجیدہ اور ان کا جسم دشمنوں کی سنگ باری اور ایذا رسانی کے نتیجہ میں زخمی تھا وہ قوم جس پر انہیں مبعوث کیا گیا تھا اور جس کی ترقی، خوشحالی اور نجات کے وہ سب سے زیادہ خواہش مند تھے وہی قوم سب سے زیادہ ان کے درپئے آزار اور انہیں نقصان پہنچانے پر کمربستہ تھی اور ان کے اپنے رشتہ دار جو اوروں کے مقابلہ میں ان سے نزدیک تر تھے وہی انہیں سب سے زیادہ تکلیف پہنچانے والے اور سب سے زیادہ بیگانگی اور دوری کا اظہار کرنے والے تھے ان حالات میں۔ پیغمبرؐ ایک ایسی تنہا اور دردمند شخصیت تھے جن کا ایک رخ وحی کا التہاب ہے تو دوسرا رخ عشق و ایمان کی حرارت جو ایک طرف اپنی قوم کی دشمنی اور مخلوق کی ایذا رسانی کا شکار ہے تو دوسری طرف تنہائی اور بیکسی سے دوچار ہے جس کے کاندھوں پر اس عظیم امانت کا بوجھ ہے جس امانت کے بار کو اٹھانے سے آسمان، زمین، اور پہاڑوں نے انکار کر دیا تھا جس کے قلب پر مسلسل وہ آیات الٰہی نازل ہو رہی ہیں کہ جنہیں اگر پہاڑوں پر نازل کیا جاتا تو وہ ان کی ہیبت سے ریزہ ریزہ ہو جاتے اور وہ ان تمام مسائل اور مصائب میں محصور، ہر روز، اس آتش شوق سے مجبور ہو کر جس نے ان کے وجود کو مشتعل اور متحرک کر رکھا تھا لوگوں کی ہدایت کے شوق میں صبح سے شام تک شہر کے گلی کوچوں میں تن تنہا کار تبلیغ میں مصروف نظر آتے ہیں کبھی کوہ صفا پر چڑھ کر خواب غفلت کا شکار لوگوں کو مستقبل کے خطرہ کا احساس دلا کر بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں کبھی اشراف قریش کے دارالندوہ کے نزدیک مسجد الحرام کے صحن میں تین سو ساٹھ گنگ، بے شعور، اور بے جان بتوں کے روبرو جنہیں لوگوں نے اپنا معبود بنا رکھا تھا صدائے بیداری اور ندائے آزادی بلند کرتے ہیں لوگوں کو دعوت توحید دیتے ہیں انہیں باطل کی غلامی سے آزاد ہونے کا پیغام سناتے

ہیں مگر کوئی ان کی آواز کو نہیں سنتا۔ تمام دن اسی طرح کی مصروفیت اور مشقت میں گذرتا ہے یہاں تک کہ دن ڈھلنے لگتا ہے تو پیغمبرؐ خستہ و درماندہ ایسی حالت میں کہ ان کا جسم زخموں سے نڈھال اور ان کا دل احد اس غم سے لبریز ہے بے نیل و مرام اپنے گھر کی طرف لوٹتے ہیں۔ شہر میں ہر طرف شور و غوغا، دشنام اور استہزا کی آوازیں ان کا تعاقب کرتی ہیں۔ مگر گھر میں ہر طرف خاموشی اور ویرانی کا راج ہے ہاں دو آنکھیں جن میں ایمان اور محبت کی شمعیں فروزاں ہیں ان کے انتظار میں ہمہ تن مشتاق ہیں۔

اور فاطمہؑ جو اس وقت بہت کم سن تھیں جو ایک کمزور و ناتواں لڑکی تھیں۔ ان تمام حالات میں اپنے والد کے ساتھ ہوتیں۔ شہر کی ان گلی کوچوں میں جو دشمنی سے پر تھے مسجد الحرام میں جہاں پیغمبرؐ کو دشنام اور طنز و استہزا کا نشانہ بنایا جاتا ہے ہر جگہ وہ اپنے باپ کے قدم بہ قدم نظر آتیں کسی ایسے پرندہ کی طرح جس کا بچہ آشیانہ سے جدا ہو کر خونخوار اور وحشی جانوروں کے پنجہ میں پھنس گیا ہو وہ اپنے باپ کے لیے مضطر اور بےتاب نظر آتیں وہ تنہا اپنے باپ کی محافظ تھیں وہ اپنے کمزور وجود کی تمام توانائیوں کے ساتھ اپنے باپ کو اپنے حصارِ عافیت میں لینے کی کوشش کرتیں وہ اپنے کمزور بازوؤں کو اپنے عظیم مگر تنہا باپ کے گرد حمائل کر دیتیں اپنی نازک انگلیوں سے جو لطف و محبت کا مجسمہ تھیں اپنے پدر بزرگوار کے سر اور ہاتھوں کو خون سے پاک کرتیں ان کے زخموں کو دھوتیں اپنے معصوم کلمات سے اس مرد بزرگ کو جو کلماتِ خدا کا حامل تھا تسلی دیتیں اور پھر اس تنہا اور غم زدہ عظیم شخصیت کو واپس گھر لے آتیں اور اپنے غم زدہ باپ اور ماں دونوں کے لیے تسکین اور راحت کا سامان فراہم کرتیں۔

جب پیغمبرؐ سفرِ طائف سے اس حالت میں واپس لوٹے کہ ان کا تمام جسم لہو لہان تھا تو اس وقت فاطمہؑ ہی تھیں جنہوں نے گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا اور اپنی طفلانہ باتوں اور معصومانہ تسلیوں کے ذریعے ان کی دلجوئی کی ان سے اس قدر

ہمدردی اور محبت کا اظہار کیا کہ پیغمبرؐ اپنے زخموں کی تکلیف بھول کر بیٹی کی باتوں اور اس کی محبت سے لطف اندوز ہونے لگے۔ پھر شعب ابی طالبؑ کے تین سالہ دور قید و تنہائی میں یہ بیٹی اپنی غم زدہ اور ضعیف ماں اور اپنے رنجیدہ اور محصور باپ کی ہر طرح خدمت اور دلجوئی کرتی رہی اور اس آزمائشی دور میں آپؐ نے بھوک پریشانی، سختی اور تنہائی کی بے شمار مصیبتیں خندہ پیشانی سے برداشت کیں پھر جب آپؐ کی مادر گرامی، خدیجہؑ اور رسولؐ کے عم بزرگوار، ابوطالبؑ اس دنیا سے اٹھ گئے اور دونوں کی وفات نے رسولؐ کی زندگی میں ایک وحشت ناک خلاء پیدا کر دیا تو یہ فاطمہؑ ہی تھیں جنہوں نے اپنی بے مثال محبت سے اس خلاء کو پر کیا یہ وہ دور تھا جب پیغمبرؐ ہر طرف سے بے یار و مددگار ہو گئے تھے نہ شہر میں ان کا کوئی محافظ و رفیق تھا اور نہ گھر میں کوئی مونس و غم خوار، اس تنہائی اور بے کسی کے احساس کا مداوا فاطمہؑ نے اپنی محبت اپنے خلوص اور اپنے جذبۂ ایثار سے کیا

فاطمہؑ نے اپنے پدر بزرگوار سے اس طرح محبت کی جیسے ایک ماں اپنے بچے سے محبت کرتی ہے انہوں نے اپنی تمام زندگی اپنا تمام وجود اپنی تمام محبت اور اپنا جوش ایمان غرض اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنے پدر بزرگوار کے لیے وقف کر دیا انہوں نے اپنی محبت سے اپنے باپ کے عاطفۂ پدری کی تسکین کی اور ان کی رسالت پر ایمان کے ذریعے انہیں قوت و افتخار کا تحفہ دیا۔ پھر جب پیغمبرؐ نے علیؑ کے فقر و شرف کی وجہ سے انہیں آپ کا شریک حیات منتخب کیا تو فاطمہؑ نے اس انتخاب کو پوری خوش دلی سے قبول کر کے اپنے باپ کو تحفۂ امید و مسرت پیش کیا۔ پھر حسنؑ، حسینؑ اور زینب کی شکل میں آپؑ نے اپنے والد بزرگوار کو جن کا دل اولاد کے غم سے داغ داغ تھا، جن کے تین بیٹے کم سنی میں اور تین بیٹیاں جوانی میں داغ مفارقت دے چکی تھیں ان کی زندگی کا شیریں ترین اور عزیز ترین ہدیہ پیش کیا حقیقت یہ ہے کہ فاطمہؑ کی تمام زندگی ان کی ۱۸ یا ۲۸ سالہ مدت حیات کا ایک ایک لحظ اپنے باپ کی محبت، ان کی خدمت اور خوشنودی کے لیے وقف تھا۔ یہ محبت ایک

بیٹی کی محبت سے کہیں زیادہ تھی۔ یہ تعلق رسمی ایمان و عقیدت سے زیادہ گہرا اور خالص تھا یہ محبت، محبت کی عام سطح سے بہت بلند تھی۔ ان زریں اور پاکیزہ جذبات کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ فاطمہؑ نے اپنے وجود کا تار و پود انہی سنہرے تاروں سے بنایا تھا اور انہوں نے انہی احساسات کے ذریعہ خود کو اپنے پدر بزرگوار کے جسم و جان کے ساتھ مربوط اور پیوستہ کر لیا تھا ان کا وجدان کی زندگی اور اس کی تمام معنویت یہی تعلق تھا جو انہیں اپنے والد سے تھا اور یہ تعلق اتنا ہمہ گیر اور ہمہ جہت تھا جس کی تشریح ممکن نہیں ہے۔

اور اب موت کی تلوار نے ناگہاں ان تمام رشتوں کو قطع کر دیا ہے۔ فاطمہؑ اب اپنے باپ سے بچھڑ گئیں اب انہیں اسی خلا میں زندگی گذارنی ہے۔

فاطمہؑ کے دل نازک اور تن ضعیف پر یہ ضرب غم کس قدر ہولناک تھی اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اس لیے کہ یہ وہ بیٹی ہے جس کی زندگی اپنے باپ کی محبت اور ان کی رسالت پر ایمان تھا۔ فاطمہؑ اپنے باپ کے لیے اور ان کے حوالے سے زندہ تھیں اور اب موت نے ان کے باپ کو ان سے چھین لیا تھا کون بتا سکتا ہے کہ ان کے لیے ان کے باپ کی رحلت کس قدر ہولناک اور سنگین سانحہ تھی۔

یہ محض امر اتفاقی نہیں تھا کہ پیغمبرؐ نے بستر مرگ پر صرف ان کو تسلی دینا ضروری سمجھا تاکہ وہ فرقت پدر کے صدمے کو برداشت کر سکیں اور یہ تسلی بھی کیسی عجیب تھی یہ خود فاطمہؑ کی موت کا مژدہ تھا۔ پیغمبرؐ نے انہیں یہ خوشخبری دی تھی کہ وہ دوسری دنیا میں سب سے پہلے اپنے باپ سے جا کر ملیں گی۔ یہی وہ تسلی تھی جس نے بیٹی کو اپنے باپ سے جدائی کا صدمہ برداشت کرنے کی ہمت عطا۔

فاطمہؑ کے لیے یہ وہ شدید ترین ضرب غم تھی جو کسی انسان کے دل پر لگ سکتی ہے قدرت نے انہیں اس عظیم غم سے دوچار کیا تھا جس سے زیادہ اور کوئی صدمہ ممکن نہیں ہو سکتا۔ ان کے لیے ان کے باپ کی موت کا غم بہت بڑا غم تھا مگر ابھی وہ اس غم کو پوری طرح سہار بھی نہ پائی تھیں کہ حالات نے ایک دوسرے صدمے سے دوچار

کر دیا یہ دوسری ضرب غم پہلے غم کی طرح شدید نہ سہی مگر یہ زخم شاید پہلے زخم سے زیادہ گہرا تھا۔ فاطمہؑ پر نہایت کم وقت میں پے در پے غم کے دو پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ابھی وہ فرقتِ پدر کے صدمے سے بے حال تھیں کہ انہوں نے سنا کہ کسی اور کو جانشین پیغمبرؐ منتخب کر لیا گیا ہے اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اس منصب پر کس شخص کو منتخب کیا گیا بہرحال جو کوئی بھی ہو علیؑ نہیں ہیں۔

اب یہ بات واضح ہو گئی تھی کیوں پیغمبرؐ نے حجتہ الوداع سے واپسی پر مسلمانوں کے تمام قافلوں کو قبل اس کے کہ وہ اپنی اپنی جگہوں کی طرف لوٹیں غدیر خم میں مجتمع کر کے ولایت علیؑ کا اعلان فرمایا اور ان سب سے یہ اقرار لیا کہ جیسے نبیؐ مولا ہیں۔ ویسے ہی علیؑ بھی مولا ہیں۔

کیوں اسی سفر میں پیغمبرؐ قبل اس کے کہ مدینہ میں وارد ہو سکیں ایک پہاڑی گھاٹی میں جہاں بارہ افراد چھپے ہوئے تھے۔ قاتلانہ حملہ کا شکار ہوتے ہوتے بچے کیوں ان لوگوں نے جو کمین گاہوں میں چھپے ہوئے تھے یہ کوشش کی کہ وہ پیغمبرؐ اور ان کے ساتھ علیؑ کو بھی قتل کر دیں۔ یہ سازش واقعہ غدیر کے بعد سامنے آئی اس لیے اس کا اعلان غدیر سے یقینی تعلق تھا۔ اس لیے کہ غدیر کے اہم اعلان کے بعد قتل پیغمبرؐ کی سازش کو اتفاقی حادثہ قرار دیکر نظرانداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان دونوں باتوں میں بڑا قریبی اور گہرا ربط ہے۔

اور پھر کیوں پیغمبرؐ نے ان لوگوں کے نام پردۂ راز ہی میں رہنے دیئے حالانکہ انہیں قدرت نے اس سازش سے پہلے ہی مطلع کر دیا تھا اور انہوں نے ان لوگوں کو کمین گاہوں سے ہٹانے کا حکم دیا تھا۔ مگر پھر بھی انہوں نے ان لوگوں کے نام افشا نہیں کئے حالانکہ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ بالخصوص جب ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ نے پیغمبرؐ کی زندگی کے ہر چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کو تفصیل سے محفوظ کر لیا ہے اور اصحاب پیغمبرؐ نے ہر واقعہ کی جزئیات کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے تو پھر اس بات پر مزید حیرت ہوتی ہے کہ آخر اس واقعہ کی تفصیلات کیوں بیان نہیں کی گئیں۔

پھر ایسا ہوا کہ پیغمبرؐ اپنی زندگی کی آخری جنگ، جنگِ تبوک میں باوجود اپنی پیرانہ سالی کے خود بھی تشریف لے گئے اور اپنے ان تمام اصحاب کو بھی جو سن رسیدہ بھی تھے اور جن کا فوجی مہموں سے زیادہ سیاسی امور سے تعلق تھا اپنے ہمراہ اس محاذِ جنگ پر لے گئے جہاں روم کی طاقتور سپاہ سے مقابلہ میں موت کا شدید خطرہ تھا۔ لیکن اس موقع پر علیؑ کے ساتھ استثنائی سلوک کیا گیا، پیغمبرؐ، علیؑ کو ان کی خواہش کے خلاف مدینہ میں ہی چھوڑ گئے۔ حالانکہ منافق اور یہودی علیؑ پر طعنہ زن تھے اور حالانکہ علیؑ مردِ میدان اور صاحبِ سیف تھے انہوں نے تمام غزوات میں بے مثال بہادری کے کارنامے انجام دیئے تھے مگر پیغمبرؐ نے علیؑ کو مدینہ میں مقیم رکھنے کا فیصلہ کیا اور فرمایا۔ میں تمہیں مدینہ میں اپنے ترکہ کی حفاظت کے لیے چھوڑ رہا ہوں کیا تم اس بات سے راضی نہیں ہو کہ تمہیں مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو گا

پھر کیوں پیغمبرؐ نے اپنے مرض الموت کی حالت میں بھی روم کی طرف لشکر بھیجنے کا اہتمام فرمایا۔ اور وہ بھی محض ایک جنگِ انتقامی کے لیے نہ کہ کسی دفاعی جنگ کے لیے جس کی ضرورت فوری ہوتی ہے۔

پھر کیوں پیغمبرؐ نے حکم دیا کہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور دوسرے بزرگ اصحاب اور سیاست داں اس لشکر کے ہمراہ جائیں اور کیوں آپؐ نے ایک ایسے لشکر کی امارت اور سالاری جس میں تمام بزرگ صحابی شریک تھے ایک اٹھارہ سالہ نوجوان اسامہ کے سپرد کی اور جب لوگوں نے آپؐ کے اس انتخاب پر اسامہ کی کم سنی کے سبب اعتراض کیا تو آپؐ نے سخت ناپسندیدگی اور ناراضگی کا اظہار فرمایا اور شدت سے اس بات کی تاکید کی کہ مسلمانوں کی امارت اور سالاری کے لیے سن و سال کو نہیں اہلیت ولیاقت کو دیکھا جاتا ہے۔

اور کیوں پیغمبرؐ اپنے مرض کی شدت کے باوجود لشکرِ اسامہ کی روانگی کے بارے میں اس قدر زیادہ فکرمند تھے کہ آپؐ نے اس کا بار بار حکم دیا اور لشکر کی جلد روانگی

پر اصرار کیا۔ یہاں تک کہ جب آپؐ کے حکم کے باوجود لشکر روانہ نہ ہوا تو آپ نے حکم عدولی کرنے والوں پر نفرین کی۔ آخر پیغمبرؐ کیوں اس قدر شدت سے یہ چاہتے تھے کہ لشکر اسامہ روم کی طرف روانہ ہو جائے اور تمام بزرگ صحابی اور شیوخ اس لشکر کے ساتھ روانہ ہو جائیں مگر علیؑ رسولؐ کے ساتھ مدینہ ہی میں مقیم رہیں

کیوں پیغمبرؐ نے اپنے آخری لمحات میں کاغذ اور قلم طلب کیا اور فرمایا کہ میں تمہارے لیے ایسا نوشتہ لکھ دوں کہ تم ہرگز گمراہ نہ ہوسکو اور کیوں لوگوں نے یہ چاہا کہ پیغمبرؐ کوئی نوشتہ نہ لکھ سکیں۔ یہاں تک کہ وہ پیغمبرؐ کے سامنے بحث و تکرار اور شور و غل کرنے لگے جس سے پیغمبرؐ آزردہ ہو گئے اور انہیں اپنے حکم نہ مانے جانے پر توہین محسوس ہوئی۔ پیغمبرؐ کی ازواج پس پردہ آہ و زاری کر رہی تھیں کہ آخر پیغمبرؐ جب کاغذ اور قلم طلب کر رہے ہیں تاکہ وصیت تحریر کر سکیں تو یہ کیسی آفت ہے کہ انہیں وصیت لکھنے سے منع کیا جا رہا ہے۔ وہ لوگ جو پیغمبرؐ کے حضور شور و غل کر رہے تھے انہیں ازواجِ رسول کا یہ گریہ اور مشورہ پسند نہ آسکا اور انہوں نے ازواج کے رونے پر اعتراض کیا۔ مگر پیغمبرؐ ان صحاب سے سخت کبیدہ ہوئے۔ آپؐ نے انہیں یارانِ یوسفؑ سے تعبیر کیا اور ان سے کہا کہ یہ خواتین تم سے بہت بہتر ہیں اور اس کے بعد آپؐ نے حکم دیا کہ وہ لوگ آپؐ کے سامنے سے چلے جائیں

پیغمبرؐ نے اپنے آخری وقت میں فرمایا، میں تم سے تین باتوں کی وصیت کرتا ہوں مگر حضورؐ نے ان میں سے صرف دو باتوں کا ذکر کیا اور تیسری بات کے بارے میں خاموشی اختیار فرمائی۔ کیوں؟

جس وقت بلال نے اذان دی اور پیغمبرؐ میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ بستر سے اٹھ کر نماز کی امامت کے لیے جا سکتے اس وقت آپؐ نے فرمایا علیؑ کو بلاؤ۔ مگر اچانک اپنی بیٹیوں کی اطلاع پر دونوں بزرگ اصحاب آگئے۔ پیغمبرؐ نے انہیں دیکھا اور بغیر کوئی لفظ کہے رخصت کر دیا۔

کیوں..... ؟ کیوں....... ؟ کیوں....... ؟

اور کیوں پیغمبرؐ جو مشکل ترین حالات اور سخت ترین جنگی مہمات کے مواقع پر بھی ہمیشہ مطمئن اور پرامید نظر آتے تھے۔ دشمن کی طاقت اور قوت آپؐ کو کبھی بھی ہراساں نہیں کرسکتی تھی مگر اپنی عمر کے آخری ایام میں جو آپ کے اقتدار اور طاقت کے عروج کا دور تھا۔ آپ پریشان اور متفکر نظر آتے تھے

کیوں ؟ جس رات آپؐ پر مرض الموت کے حملہ کی ابتدا ہوئی آپ نصف شب کو رات کی تنہائی میں اپنے خدمت گار ابو مویہبہ کے ہمراہ قبرستان تشریف لے گئے دیر تک قبروں سے سرگوشی کرتے رہے اور حسرت ناک لہجہ میں مردوں سے یوں مخاطب ہوئے۔

"خدا تمہیں خوش رکھے تمہارا حال اس قوم سے بہتر ہے"

پھر کیوں جیسے جیسے آپؐ کا وقت آخر نزدیک آرہا تھا آپ بار بار فرمارہے تھے کہ فتنے تاریک رات کے لشکر کی طرح امڈے چلے آرہے ہیں۔

ہاں! اب تمام سوالوں کے جواب واضح ہو گئے ہیں شب تاریک کی فتنہ سامانیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ علیؑ پیغمبرؐ کے دفن کے کام میں منہمک رہے اور اصحاب پیغمبرؐ نے علیؑ کے حق کو دفن کردیا۔

گروہ اصحاب اب سقیفہ سے مسجد کی طرف لوٹ آیا ہے تاکہ نومنتخب خلیفہ لوگوں کو اپنے انتخاب سے مطلع کریں۔ ادھر علیؑ پیغمبرؐ کے اداس اور خالی گھر سے بیت فاطمہؑ کی طرف خالی ہاتھ لوٹ آئے ہیں یہ ان کے سکوت اور گوشہ نشینی کے تاریک اور درد ناک ۲۵ سالہ دور کا آغاز ہے۔

اور فاطمہؑ اپنی جان ناتواں پر درد و غم کی ان بے رحم اور پے بہ پے ضربات کو برداشت کر رہی ہیں۔

ان کے پدر بزرگوار، جو ان کی زندگی کا سب سے بڑا سہارا تھے جو ان کے محبوب ترین عزیز تھے اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ اور علیؑ جو ان کے شریک حیات ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے عم زاد ان کے دوست ان کے عزیز اور ان کے درد کے محرم

ہیں خانہ نشین ہو چکے ہیں، وہ خود غمگین اور شکستہ نظر آتے ہیں وہ بالکل تنہا رہ گئے ہیں۔ بہت جلد ہر شخص نے ان سے آنکھیں پھیر لیں۔ یوں ہے جیسے مدینہ انہیں پہچانتا ہی نہ ہو۔

اسلام — بعد رحلتِ پیغمبرؐ

اور اسلام، وہ دین جس کے لیے فاطمہؑ اپنے بچپن ہی سے مصروفِ جہاد ہیں اپنی خردسالی اور ضعف کے باوجود اپنے پدر بزرگوار کے قدم بہ قدم اس راہِ دشوار میں سرگرمِ سفر ہیں اس راہ میں جہاد کرنے والے اوّلین مجاہدوں کی صف میں شامل ہو کر سختیاں اور مصیبتیں برداشت کرتی رہیں، فقر و فاقہ، قید و حصار، بھوک، اور ہر طرح کی پریشانی کا مقابلہ کرتی رہیں یہاں تک کہ ان کا تمام بچپن اور جوانی اسی کشمکش اور آزمائش کی نذر ہو گئی۔ ان کی تمام زندگی اسی جدوجہد میں گذری کہ نخلِ اسلام بارآور ہو سکے انہوں نے اپنے قدموں سے اس راہ کو ہموار کیا جس پر اسلام کے اوّلین مجاہد اور مہاجر سرگرمِ سفر ہوئے انہوں نے اپنے تمام ایمان احساس اور توانائی کو اس مقصد کے لیے وقف کیا کہ ان کے والد کا پیغامِ رسالت اپنے قدم جما سکے اور راستی، حق پرستی، آزادی، عدل، تقویٰ، مساوات اور اخوت کی قدریں جڑیں پکڑ سکیں تاکہ وہ لوگ جو جہالت اور غفلت کا شکار تھے جن کے دلوں میں جہل اور ظلم کی بیماری کی جڑیں بہت گہری تھیں وہ دانش و آگاہی، علم و عدالت اور پاکیزگی کی راہ پر چل سکیں وہ اس راستہ پر چل سکیں جس راستہ کی تعلیم رسولِ امی دے رہے تھے وہ راستہ جو سنتِ نبوی کہلاتا ہے یعنی علم آگاہی، انصاف، اخوت اور مساوات کا راستہ۔

مگر آج فاطمہؑ کے لیے ہر چیز ٹوٹ پھوٹ گئی تھی ان کی تمام کوششیں، قربانی اور جدوجہد بے نتیجہ نظر آنے لگی تھی۔ ہر دیوار، ہر مورچہ، ہر منارہ جسے انہوں نے بڑی

محنت اور مصیبت سے بنایا تھا لوٹ کر زمین بوس ہو رہا تھا۔

اسلام کی تقدیر کا سقیفہ میں فیصلہ کر لیا گیا تھا حالانکہ اس وقت وہاں علی سلمان ابوذر، عمار، مقداد اور ان کے گنے چنے ساتھی موجود نہ تھے۔ اب یہ سب بیت فاطمہؑ کے گرد جمع ہو گئے تھے یہ سب غم و غصہ میں گرفتار تھے۔ آخر یہ لوگ علیؑ سے وفادار کیوں ہیں؟ نہ ان کا تعلق قبیلہ اوس و خزرج کے اشراف سے ہے جنہیں مدینہ میں وقار و اعتبار حاصل ہو۔ نہ ان کا تعلق اشراف قریش سے ہے جو اپنے خاندانی، تفوق نسلی برتری اور قبائلی امتیاز کی وجہ سے خلافت رسولؐ کے منصب کے امیدوار ہو سکیں اور عوام و خواص ان کی خلافت پر اجماع کر سکیں۔ نہ یہ وہ لوگ ہیں جو خاندانی اور طبقاتی بنیاد پر لوگوں کے درمیان کوئی اعتبار حاصل کر سکیں خونی رشتہ یا سرمایہ یا اور کوئی سیاسی مصلحت یا گروہی مفاد غرض کسی لحاظ سے ان کو کوئی طاقت یا اعتبار حاصل نہیں ہے پھر یہ کون لوگ ہیں یہ سلمان کی طرح غریب بھی ہیں اور غریب الوطن بھی سلمان ایران سے آئے ہوئے تھے اور ابوذر صحرا نشین تھے اور عمار تھے جن کی ماں افریقی کنیز تھیں اور باپ یمنی بدو۔ یہ وہ لوگ ہیں جو میثم تمار کی طرح معاشرہ کے پسماندہ اور غریب طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ سادہ اور بے سہارا لوگ ہیں اور یہی لوگ علیؑ سے وفادار ہیں اور ان کی وفاداری کا محرک کوئی ذاتی منفعت یا سیاسی مصلحت نہیں ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو چشم پیغمبرؐ میں جو عزیز اور محبوب تھے۔ مگر اب جبکہ پیغمبرؐ دنیا سے تشریف لے گئے تو دور جاہلیت کی قدریں دوبارہ لوٹ آئیں۔ اب پھر یہ لوگ بے وقار و بے اعتبار ہو گئے۔

علیؑ ۔ واحد سہارا۔

اب ان کے لیے جز علیؑ اور کوئی سہارا اور پناہ نہیں ہے اور خود علیؑ اب مدینہ میں بے سہارا ہو گئے ہیں۔ عہد رسالتؐ سے قبل کی کہنہ اقدار اب پھر زندہ ہو گئی ہیں ان اقدار کے پیمانہ میں اب علی کی کیفیت یہ ہے کہ وہ جوان ہیں ان کی عمر

۳۰ سال سے کچھ زیادہ ہے (اور دوسرے شیوخ سن رسیدہ ہیں) اس کے علاوہ علیؑ تہذیب ہیں۔ ان کا کوئی گروہ نہیں ہے وہ سیاسی اور قبائلی گروہ بندی سے بے نیاز ہیں ان کی خوبیاں اور قدریں یہ ہیں۔ تقویٰ، علم و دانش، شجاعت، استقامت عزیمت، بلند فکری اور شمشیر و سخن کی بے نظیر قدرت۔ ان کا تمام سرمایہ وہ منافقین اور دشمنیاں ہیں جو انہیں ان کی پیمبرؐ سے دوستی اور وفاداری کے سبب ملی ہیں ان کی شمشیر نے میدان جہاد میں ان بہت سارے لوگوں کا خون بہایا ہے۔ جن کے ورثاء پیغمبرؐ کی طاقت کے آگے سرنگوں ہو کر اب دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے ہیں مگر ان کے دلوں سے پرانے کینہ دور نہیں ہوئے۔

علیؑ کے شخصی فضائل و کمالات اس حد پر تھے جہاں انسان دوستوں کا محسود بن جاتا ہے لوگ دانستہ یا غیر دانستہ اس سے حسد کرنے لگتے ہیں۔ اور علی کی شجاعت اور فدا کاری نے انہوں دشمنوں کی کبھی نہ ختم ہونے والی دشمنی کا نشانہ بنا دیا تھا اور یہ دونوں عوامل یعنی دوستوں کا حسد اور دشمنوں کی عداوت ان کے خلاف بیک وقت کام کر رہے تھے یہ دونوں عوامل علیؑ کی حیثیت کو گھٹانے ان کی تحقیر کرنے اور ان پر الزام تراشیاں کرنے میں ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علیؑ اپنی حیثیت سے محروم ہو کر مدینہ میں تنہا رہ گئے۔

جب کوئی انسان اپنے وقت کی سطح سے اسقدر بلند ہو جاتا ہے کہ دوسرے اس کی عظمت اور انفرادیت کی تاب نہیں لا سکتے۔ تو پھر وہ انسان تنہا ہو جاتا ہے اس کے ٹھوس پرمایہ زیبا اور غنی وجود کے سامنے دوسرے جنکا وجود خام ناپختہ زشت اور تہی ہوتا ہے خود بخود حقیر نظر آنے لگتے ہیں۔ ہر چند کہ وہ عظیم انسان تواضع وانکسار سے کام لیتا ہے مگر اس کی عظمت اور انفرادیت دوسروں کے لیے باعث حسد و عداوت بن جاتی ہے دشمن اور دوست دانستہ یا نادانستہ اس کی شخصیت کی نفی کرنے، اس کی عظمت کو پامال کرتے یا اسے اس کے جائز حق سے محروم کرنے کی سازش میں باہم مل جاتے ہیں۔ ان کا مفاد ایک دوسرے سے مربوط ہو جاتا ہے۔ صورت یہ ہوتی ہے کہ

دوست جو ہم فکر اور ہمراہ بھی ہوں اس کی عظمتِ وجود کے سامنے خود کو حقیر اور ہیچ محسوس کرتے ہیں۔ اپنی تحقیر کا یہ احساس انہیں حسد اور رنج میں مبتلا کر دیتا ہے پھر وہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ اس کے فضائل کا انکار کریں یا ان فضیلتوں کو مسخ کردیں اس کی تحقیر و تخفیف کریں تاکہ اسے خود سے نزدیک لے آئیں ان کے حقیر اور بے مایہ وجود اور اس کے عظیم اور پرمایہ وجود کے درمیان جو فرق اور فاصلہ ہے اور جس کی وجہ سے وہ احساس کمتری اور غم بے مائیگی کا شکار رہتے ہیں اس فاصلہ کو کسی طرح کم دیں۔ انہیں اتنی اہلیت نہیں ہوتی کہ وہ خود کو اس کی سطح تک بلند کرسکیں اس لیے وہ اسے اس قدر نیچے اتارنا چاہتے ہیں کہ وہ خود ان کی پست سطح تک گر جائے دوستوں کی یہی تحقیر ہی دشمنوں کے لیے راہ ہموار کر دیتی ہے اور دوست اور دشمن کا مفاد مشترک ہو جاتا ہے۔ (یعنی اس شخصیت کی تحقیر و تصغیر) رفتہ رفتہ دوست، دشمنوں کا آلۂ کار بن جاتے ہیں اور اس ظلم میں دشمن کے ساتھ شریک ہو جاتے ہیں۔

یہی وہ حالات تھے جو علیؑ کی حیثیت کو گھٹانے کا سبب بنے

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بنی امیہ جو مہاجر اور انصار دونوں کے دشمن تھے اور جو علی اور عمر دونوں سے خصومت رکھتے تھے بالآخر انہوں نے حضرت علی کو تحقیر و ملامت کا ہدف بنالیا وہ ہر طرف یہ چرچا کرنے لگے کہ علیؑ "ابوتراب" ہیں وہ نماز نہیں پڑھتے۔ کاتب وحی، جامع قرآن، پیغمبرؐ کے عزیز اور عم زاد بنی امیہ ہیں۔ دختر ابوسفیان ام المومنین ہیں چشم پیغمبرؐ میں خانۂ ابوسفیان کی حرمت خانۂ کعبہ کی طرح ہے فتح مکہ کے موقع پر آپؐ نے اس گھر کو جائے امن اور محل پناہ قرار دیا یہ کیسی خبر ہے کہ علیؑ کو محراب مسجد میں شہید کر دیا گیا علیؑ مسجد میں کیا کر رہے تھے ان کا محراب سے کیا تعلق تھا، کیا علیؑ نماز پڑھتے تھے؟

ہر شخص جانتا ہے کہ علی کو بدنام کرنے کی اس مہم کا محرک وہ کینہ اور عداوت تھی جو جنگ بدر و خندق میں علیؑ کی تلوار کے کاری زخموں کے ردعمل کی

حیثیت رکھتی ہے

مگر وہ لوگ جو بدر و خندق میں علی کے ساتھ بنی امیہ کے خلاف برسر پیکار تھے اب بنی امیہ کے ہم آواز ہو گئے۔ آخر کیوں؟ تاریخ بتاتی ہے کہ وہ سن رسیدہ اصحاب پیغمبرؐ جو آج تحقیر علیؑ کی مہم میں بنی امیہ کے ہم آواز ہو گئے ہیں۔ یہ جنگ خندق میں دشمن کی مبارزطلبی کے جواب میں سر کو جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔ جبکہ علیؑ جو اس وقت صرف ۲۷ سالہ جوان تھے انہوں نے دشمن پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ دشمن وحشت زدہ ہو گیا اور لشکر اسلام سے تکبیر کی صدائیں بلند ہوئیں۔ خندق میں علیؑ کی ضرب کی تعریف کرتے ہوئے پیغمبرؐ نے فرمایا "یوم خندق علیؑ کی ایک ضربت تمام جن وانس کی عبادت سے افضل ہے" وہ لوگ جو اس وقت اس ضرب کو دیکھ کر وجد میں آ گئے تھے جن کے دلوں سے تکبیر کی صدا نکلی تھی جنہیں اس ضرب نے ذلت وخواری سے بچا کر عزت وافتخار عطا کیا تھا۔ خوف کے بدلے فتح کا مژدہ سنایا تھا۔ وہی لوگ آج علیؑ کی تحقیر کر رہے ہیں۔ کیوں؟ وجہ یہ ہے کہ ان کے دلوں میں حسد کا ایک بیج خفیہ طور پر جڑ پکڑتا رہا رفتہ رفتہ یہ بیج ایک ایسے تناور درخت میں تبدیل ہو گیا جسکے برگ وبار تے ان کے تمام شعور واحساس کو اپنے سایہ میں لے لیا اور اس کی جڑیں ان کے گوشت پوست سے گذر کر ان کے استخوانوں میں پیوست ہو گئیں

خیبر میں ابو بکر علم لے کر گئے اور ناکام ونامراد لوٹے اسی طرح عمرؓ بھی قلعہ کو فتح کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے اور شکست کھا کر پلٹ آئے۔ پیغمبرؐ نے فرمایا کل میں علم ایسے شخص کو دوں گا۔ جو خدا اور اس کے رسولؐ کو دوست رکھتا ہے اور خدا اور اس کا رسولؐ بھی اسے دوست رکھتے ہیں

اور دوسرے دن پیغمبرؐ نے علم علیؑ کو عطا فرمایا اور انہوں نے اپنی حیرت انگیز شجاعت کے وہ جوہر دکھائے کہ ایک کے بعد دوسرا قلعہ فتح ہوتا گیا وہ ایک قلعہ کو فتح کرتے تھے لوگ وہاں کا مال واسباب جمع کرنے میں لگ جاتے تھے اور علیؑ آگے بڑھ کر دوسرے قلعہ پر حملہ آور ہو جاتے تھے۔

بدر اور احد کے معرکوں میں وہ اصحاب بزرگ جو سن و سال اور اجتماعی حیثیت کے اعتبار سے خود کو برتر خیال کرتے تھے یا تو میدان سے فرار ہو گئے یا خوف اور مایوسی کی حالت میں گوشہ گیر رہے مگر علیؑ میدانِ کارزار میں برق و باد کی طرح سرگرم جہاد رہے اور پریشانی اور شکست کے عالم میں بھی انہوں نے اپنی جرأت اور استقامت سے فتح کی راہ ہموار کی۔ جنگِ حنین میں کہ جب بزرگ، معتبر اور مقتدر صحابی حنین کے تنگ درہ سے اس طرح سراسیمہ ہو کر بھاگ رہے تھے کہ ابوسفیان خوشی کے عالم میں طنز کر رہا تھا کہ یہ اس طرح بھاگ رہے ہیں کہ دریائے احمر سے پہلے نہیں رکیں گے۔ اس پریشانی، افراتفری اور انتشار کے عالم میں علی ایک کوہِ ثبات کے مانند اس گھاٹی کے دہانہ پر جمے رہے۔

علیؑ کی شمشیر شرربار نے دشمنوں کو تہہ تیغ کر کے ان کے ورثاء کی عداوت مول لی مگر اس کے ساتھ ہی ان کی شجاعت کا کارنامے ان کے ہم صف اور ہم رزم دوستوں کے حسد اور حقارت کا نشانہ ٹھہرے۔

اور یہی وہ صورتِ حال ہے جہاں دشمن اور دوست ہم محاذ نظر آتے ہیں یعنی علیؑ کی شخصیت، فضیلت اور قدرت و کمالات کو گھٹانے کی سازش میں دوست اور دشمن دونوں شریک ہیں دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے دونوں مل کر علی کی تحقیر کرنا چاہتے ہیں علیؑ کی غیر معمولی عظمت ان کے دلوں میں جو احساس کمتری پیدا کرتی ہے اس احساس کا مداوا یہ تحقیر علیؑ سے کرنا چاہتے ہیں۔ مگر کس طرح ...؟ اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ یہ علیؑ کی فضیلتوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ ان فضائل کو بیان نہیں کرتے اگر ان کی مجرمانہ، فطرت بہت زیادہ پست ہوتی ہے تو یہ ان فضائل کو توڑ مروڑ کر بیان کرتے ہیں انمیں تحریف کرتے ہیں ان کے معنی بدل دیتے ہیں وہ علی پر تہمت طرازی کرتے ہیں اور اگر طبیعت کی پستی اس قدر زیادہ سنگین نہیں ہوتی تو وہ علیؑ کی خوبیوں اور ان کی فضیلتوں کے بارے میں سکوت اختیار کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ ان کی شخصیت یوں کہیں سے

کوئی کمزور نکتہ نکال سکیں اور پھر اپنا پورا زور بیان صرف کرکے اس نکتہ کو اس قدر بڑھائیں کہ رائی کا پہاڑ نظر آنے لگے۔ یا اگر طبیعت میں انصاف حضرت ابوبکر یا حضرت عمر کی حد تک ہو تو پھر علی کے حق کا اعتراف تو کر لیتے ہیں مگر انہیں ان کے حق سے محروم کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے اور اس حق تلفی کا جواز مصلحت کو قرار دیتے ہیں

علیؑ ؟ ہاں ! مگر ابھی وہ جوان ہیں ابھی انہیں کچھ عرصہ انتظار کرنے دو

علیؑ ؟ ہاں ! مگر وہ مرد شمشیر ہیں، متقی ہیں، عالم ہیں انہیں بھلا سیاست سے کیا واسطہ، وہ بے شک شجاع ہیں مگر جنگی حکمت عملی سے واقف نہیں ہیں

علیؑ ؟ ہاں ! مگر ان کے مزاج میں ظرافت زیادہ ہے

علیؑ ؟ ہاں ! مگر اسلام کا فوری مفاد ان کے حاکم ہونے کے خلاف ہے ان کے دشمن بہت زیادہ ہیں انہوں نے پیغمبرؐ کے ساتھ جنگوں میں بڑے قبیلوں اور بڑے بڑے خاندانوں کے سر برآوردہ لوگوں کو قتل کیا ہے۔ لوگوں کے دلوں میں یہ کینہ ابھی تازہ ہیں اس لیے ان کا خلیفہ بنایا جانا مصلحت اسلام کے خلاف ہے

علیؑ ؟ ہاں! مگر وہ خودستائی بہت کرتے ہیں (یہاں احساس کمتری کھل کر بول رہا ہے)

علی ؟ ہاں ! اگر انہیں زمام خلافت سونپ دی جائے تو وہ اس شتر اقتدار کو راہِ استوار پر چلائیں گے۔ مگر کیا کیا جائے وہ امر خلافت کے حریص ہیں

نتیجہ یہ ہوا کہ علیؑ کو ان کے حق سے محروم کرنے میں بنو امیہ کا بھی ہاتھ تھا اور حضرت عمر کا بھی ہاتھ تھا باوجودیکہ عہد پیغمبرؐ کی جنگوں میں حضرت عمر بنی امیہ کے دشمن اور حضرت علی کے ساتھی تھے۔ اور حضرت عثمان کی کامیابی کے لیے حضرت عمر اور بنی امیہ دونوں نے مل کر راہ ہموار کی۔

فاطمہؑ ان سب معاملات کو خوب سمجھتی ہیں ان کی نگاہ سے یہ باتیں پوشیدہ نہیں

ہیں وہ ایک ایسی خانہ نشین خاتون نہیں ہیں جسے کسی بات کی کوئی خبر نہ ہو۔ وہ خاتون ناآگاہ نہیں ہیں۔ وہ مبارزہ آرائی کی راہ پر چلنے کا سلیقہ بن جاتی ہیں ان میں حق کے ابلاغ وا ظہار کا حوصلہ ہے ان کا بچپن اسلام کی انقلابی تحریک کی آغوش میں گذرا اور ان کی جوانی اسلامی سیاست کے معاملات کے درمیان بسر ہوئی وہ ایک مثالی مسلم خاتون ہیں وہ ایک ایسی خاتون ہیں جن کے نزدیک عفت اخلاق کا مطلب اجتماعی مسئولیت سے بری الذمہ ہونا نہیں ہے۔

صورتِ حال یہ ہے کہ ابھی پیغمبرؐ کو دفن کئے زیادہ وقت نہیں گذرا، خانۂ فاطمہؑ میں علیؑ ہیں اور ان کے گرد بنی ہاشم کے چند لوگ ہیں اور چند وہ اصحاب ہیں جو علیؑ سے وفادار ہیں ان لوگوں نے سقیفہ کی کارروائی کو ماننے سے انکار کر دیا ہے یہ نو منتخب خلیفہ کی بیعت کے لیے تیار نہیں ہیں۔ مسجد نبوی میں نئے خلیفہ نے اپنے انتخاب کا اعلان کر کے لوگوں سے بیعت کا مطالبہ کیا لوگوں کی اکثریت نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی باقی ماندہ لوگوں کو بھی بیعت کے لیے بلایا جا رہا ہے اس سلسلہ میں حضرت عمر بہت زیادہ سرگرم نظر آتے ہیں اس سیاسی مہم کے سربراہ وہی ہیں اور وہ سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں کہ جلد سے جلد زیادہ سے زیادہ لوگوں سے بیعت حاصل کر لی جائے۔ تاکہ نئے خلیفہ کے لیے راہ استوار ہو جائے۔

قبیلۂ خزرج کے رئیس سعد بن عبادہ جو بااثر شخصیت ہیں اور جو سقیفہ میں انصار کی طرف سے خلافت کے امیدوار تھے حضرت ابوبکر کے انتخاب کو قبول نہیں کرتے اور بطور احتجاج مدینہ سے نقل مکانی کر کے شام کی طرف جانے کا قصد کرتے ہیں اچانک خبر آتی ہے کہ انہیں اثنائے راہ میں ایک نادیدہ تیر نے ہلاک کر دیا لوگ کہتے ہیں کہ سعد کو جنوں نے ہلاک کیا۔ یہ بات اس قدر یقین سے کہی جاتی ہے کہ لوگ اس جن کا نام تک دریافت کر لیتے ہیں اور اس کی شان میں فصیح و بلیغ قصیدے کہے جاتے ہیں۔

دیگر قبائل کا کیا ردعمل ہوگا یہ ابھی واضح نہیں ہے اگرچہ اس بات کا امکان

ہے کہ وہ خلافتِ ابوبکر کو قبول نہ کریں۔ لیکن خطرے کا اصل مرکز اور منبع بیتِ فاطمہؑ ہے ہاں اس دن سے آج تک، تاریخ کے ہر دور میں بیتِ فاطمہؑ ہر حکومت کے لیے خطرے کی علامت رہا ہے

اب مدینہ میں تاریخ تین اہم نقطوں کے گرد گردش کر رہی ہے۔ مسجد، خانۂ فاطمہؑ اور خانۂ پیغمبرؐ جہاں اب موت کا سکوت طاری ہے۔ اور تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ تینوں نکتے یکجا ہیں۔ ان کی دیوار سے دیوار ملی ہوئی ہے۔ ہاں ان تینوں کے درمیان ایک دیوار سے زیادہ کا فاصلہ نہیں ہے۔

عمرؓ نئی حکومت کے خلاف اس تنہا نقطۂ مقاومت سے بہت ناراض ہیں انہوں نے ابوبکر کی خلافت کے استقرار میں بڑی جدوجہد کی ہے راستے میں سیکڑوں، رکاوٹوں کو ہٹایا ہے اب یہ ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہے کہ وہ لوگ جو خلیفہ کی بیعت کرنے سے انکار کر رہے ہیں وہ اس گھر میں جمع ہو کر حکومت کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیں اور یہ گھر مسجد سے جو حکومت کا مرکز اور پارلیمنٹ ہے بالکل متصل ہے اور اس گھر میں وہ لوگ ہیں۔ جو پیغمبرؐ کے عزیز ترین اور مخلص ترین صحابی ہیں۔

اور اس وقت فاطمہؑ کی کیفیت ایک ایسے زخمی پرندے کی سی ہے جس کی روح دو سنگین حادثوں سے زخم خوردہ ہے یعنی مرگِ پیغمبرؐ اور شکستِ علیؑ تاریک غموں، کے بوجھ سے نڈھال اپنے سر کو جھکائے وہ ماضی کے تصور میں گم ہیں انہیں بار بار یہی خیال آرہا ہے کہ ان کے پدرِ بزرگوار کو فکرِ فردا نے پریشان کر رکھا تھا وہ اس بارے میں بہت فکر مند تھے کہ ان کے بعد "مذہبِ عدالت و رہبری" کی تاریخ کیا رخ اختیار کرے گی۔ ماضی کی تلخ اور شیریں یادیں ان کے دل پر ہجوم کر رہی ہیں اور ان کی روح ایک ایسے پرندہ کی طرح جو قفس سے آزادی کے لیے بیتاب ہو اپنے والد کی یادوں کے ساتھ ساتھ افق ہائے گذشتہ میں پرواز کر رہی ہے وہ اپنی اس سنگین مصیبت کا ماضی کی خوش گوار یادوں کے ذریعے وقتی اور جزوی مداوا تلاش کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ناگہاں ان کے گھر کے باہر زبردست شور و غل اور

ہنگامہ برپا ہوتا ہے اور اس شور و غوغا میں انہیں عمر بن خطاب کی ہولناک آواز سنائی دیتی ہے یہ آواز دمبدم ان کے دروازے سے نزدیک تر ہوتی جارہی ہے
یں اس گھر کو مع اس کے مکینوں کو نذر آتش کردوں گا۔

فاطمہؑ نے یہ جملہ صاف طور پر سنا اب یہ آواز بہت نزدیک سے آرہی تھی۔ خانۂ فاطمہؑ کا دروازہ مسجد میں کھلتا ہے وہاں لوگ حیرت سے کہہ رہے ہیں۔

کیا اس کے باوجود کہ فاطمہؑ بھی اس گھر میں ہیں۔ (تم اسے نذر آتش کردوگے) اور عمر قطعی اور دو ٹوک لہجہ میں کہتے ہیں کہ۔ ہاں۔

اسی اثنا میں عمر کا غلام آگ لے آتا ہے۔ اب آگ بیتِ فاطمہؑ کے دروازے پر ہے لوگ شور و غل کر رہے ہیں اس شور میں حضرت عمر کی گرجدار آواز سنائی دیتی ہے۔

علی ۔ باہر آؤ۔

آگ کی حدت سے گھر کا دروازہ جھلسا جارہا ہے روزنوں سے شعلوں کی سرخ زبانیں گھر کے اندر داخل ہو رہی ہیں اور حضرت عمر کی آواز لحظہ بہ لحظہ زیادہ گرجدار اور خوفناک ہوتی جارہی ہے۔

فاطمہؑ جو در خانہ کے متصل ہیں اس صورتِ حال کو دیکھ رہی ہیں ناگہاں ان کی صدائے فریاد بلند ہوتی ہے اس صدائے پر درد میں تمام دنیا کے درد و غم سمٹے ہوئے ہیں

اے پدر بزرگوار، اے اللہ کے رسولؐ آپؐ کے بعد پسر خطاب اور پسر ابی قحافہ نے ہم پر کیا کیا ستم نہیں ڈھائے حضرت عمر کے ساتھی اس صدا کو سن کر چند گام پیچھے لوٹ جاتے ہیں یہ صدائے پر درد، یہ فریاد و احتجاج کی آواز دختر محبوبؐ خدا کی آواز ہے

کچھ لوگ اس نالہ و فریاد کو سن کر اپنا گریہ ضبط نہیں کر سکے ان کے رونے کی آوازیں بلند ہونے لگیں، کچھ لوگ سراسیمگی کے عالم میں خانۂ فاطمہؑ اور خانۂ رسولؐ پر نظریں جمائے ہوئے ہیں۔

اب یہ عالم ہے کہ جیسے لوگوں کے ہاتھ اور پاؤں شل ہو گئے ہوں لوگ شرم

سے سر جھکائے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ گئے حضرت عمر اب تنہا رہ گئے وہ چند لمحہ دروازے کے قریب کھڑے رہے اس وقت ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کریں اس طرح کچھ دیر تنہا کھڑے رہنے کے بعد وہ حضرت ابوبکر کی طرف لوٹ گئے۔ اب تمام لوگ حضرت ابوبکر کے گرد مجتمع ہیں لوگ ان سے نہایت افسردہ اور غمناک لہجہ میں اس واقعہ کی روداد بیان کر رہے ہیں۔

پسر ابی قحافہ اور پسر خطاب دوبارہ خانۂ فاطمہؑ کی طرف آتے ہیں مگر اس بار ان کے تیور مختلف ہیں۔ وہ خاموش اور سنجیدہ دکھائی دیتے ہیں حضرت عمر کی درشتی کے مقابلہ میں حضرت ابوبکر نرمی سے کام لینے کے عادی ہیں۔

فاطمہؑ جنہیں رنج و مصیبت سہنے کی عادت ہے جو کشمکش اور جد و جہد کے ماحول میں پروان چڑھتی ہیں۔ ان کے لیے اگرچہ یہ سانحہ ان کی زندگی کا سب سے زیادہ سنگین سانحہ ہے اور اس وقت وہ اپنے آپ کو ہمیشہ سے زیادہ کمزور اور ناتواں محسوس کر رہی ہیں مگر ان کی یہی کوشش ہے کہ ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ آنے پائے اور اس حادثہ سنگین کے بارے میں وہ سرنگوں نہ ہو جائیں وہ تنہا اپنے گھر کے دروازے کے پاس کھڑی ہوئی ہیں گویا اس گھر کی نگہبانی اور دفاع کر رہی ہیں گویا وہ چاہتی ہیں کہ علی کو جو اس وقت سخت تنہا اور درماندہ ہیں اپنی حمایت اور اور حفاظت سے سہارا دیں۔

دونوں بزرگ گھر میں داخل ہونے کی اجازت چاہتے ہیں۔ فاطمہؑ اجازت نہیں دیتیں علیؑ کہ جن کے صبر کا اندازہ کرنا ممکن نہیں ہے فاطمہؑ سے درخواست کرتے ہیں کہ دونوں کو گھر میں داخل ہونے کی اجازت دے دی جائے۔ فاطمہؑ علی کی رائے کی مخالفت نہیں کرتیں وہ زبان سے کچھ نہیں کہتیں ان کا سکوت ان کے غم و غصہ کا آئینہ دار ہے علیؑ ان دونوں کو گھر کے اندر بلا لیتے ہیں دونوں داخل ہوتے ہیں۔ فاطمہؑ کو سلام کرتے ہیں، فاطمہؑ غصہ سے اپنا رخ دوسری طرف کر لیتی ہیں اور ان کے سلام کا جواب نہیں دیتیں وہ دروازے سے ہٹ کر گھر کے اندرونی حصہ میں چلی جاتی ہیں اب

ان کے اور دونوں اصحاب کے درمیان دیوار حائل ہے حضرت ابو بکر کو احساس ہوتا ہے کہ فاطمہؓ کا غصہ اور ان کی ناراضگی حد سے گذر چکی ہے ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہیں۔ گفتگو کس طرح شروع کریں۔

دونوں بزرگوں پر شرم و سکوت کا عالم طاری ہے اس مرحلہ پر ان کے لیے فاطمہؓ اور علیؓ سے گفتگو کرنا بڑا کٹھن ہے

ان دونوں کے پاس صرف علیؓ بیٹھے ہیں گویا وہی ان کے تنہا میزبان ہیں۔ مگر وہ بھی خاموش ہیں اور فاطمہؓ قہر و غضب کے عالم میں پس دیوار ایستادہ ہیں انہوں نے اپنے اور ان دونوں بزرگوں کے درمیان دیوار کو حجاب بنا لیا ہے تاکہ وہ ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں یہ دیوار ایک ایسی فصیل ہے جسے نہ اس وقت توڑا جا سکتا ہے اور نہ اس کے بعد آج تک توڑا جا سکا۔

ابو بکر نے کوشش کی کہ وہ خود کو سنبھالیں اور اپنی توانائیوں کو مجتمع کر کے گفتگو کا آغاز کریں وقت لحظہ لحظہ کر کے گذرتا جا رہا ہے خانۂ فاطمہؓ میں مکمل سکوت طاری تھا ایک ایسا سکوت جو سخن ہائے بے شمار سے عبارت تھا ابو بکر کے چہرے پر گہرے غم کے آثار اور ان کے لہجہ میں جذبات کی لرزش تھی انہوں نے نہایت نرمی اور ملائمت سے گفتگو کا آغاز اس طرح کیا۔

اے رسولؐ خدا کی محبوب دختر! خدا کی قسم مجھے پیغمبرؐ کے قرابت دار اپنے قرابت داروں سے عزیز تر ہیں اور میں تمہیں اپنی بیٹی عائشہ سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں جس دن تمہارے والد کا انتقال ہوا میری دلی تمنا تھی کہ ان کے بدلے مجھے موت آجاتی تاکہ میں ان کے بعد اس دنیا میں نہ رہتا تمہیں اندازہ ہے کہ میں تمہاری حیثیت کو پہچانتا ہوں تمہارے عز و شرف کا اعتراف کرتا ہوں اور اگر میں نے تمہیں پیغمبرؐ کی میراث سے محروم کیا ہے تو وہ اس وجہ سے کہ میں نے پیغمبرؐ (ان پر درود و سلام ہو) سے سنا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ہم گروہ انبیا میراث نہیں چھوڑتے جو کچھ ہمارا ترکہ ہے وہ صدقہ ہے۔"

ابوبکر یہ کہہ کر خاموش ہو گئے عمر بھی ساکت تھے دونوں منتظر تھے کہ دیکھیں اس نرم اور ستائش آمیز گفتگو نے فاطمہؑ کے غم زدہ دل پر کیا اثر کیا ہے۔ فاطمہؑ اس گفتگو کو سن کر ایک لحظہ کے لیے بھی متردد نہیں ہوئیں۔ انہوں نے صاف اور واضح لہجہ میں اپنی گفتگو کا آغاز کیا گویا اب وہ غم وغصہ کا اظہار نہیں کر رہی تھیں بلکہ استدلال کر رہی تھیں۔

اگر میں تم دونوں سے رسولؐ خدا کا قول نقل کروں تو کیا تم اسے قبول کرو گے اور اس پر عمل کرو گے۔

دونوں نے بیک زبان کہا۔ ہاں (کیوں نہیں)

فرمایا۔ میں تمہیں خدا کی قسم دے کر پوچھتی ہوں کیا تم دونوں نے رسولِ خداؐ کی یہ حدیث نہیں سنی جس میں آپؐ نے فرمایا۔

"فاطمہؑ کی خوشنودی میری خوشنودی ہے اور فاطمہؑ کی ناراضگی میری ناراضگی ہے، جو میری بیٹی فاطمہؑ کو دوست رکھتا ہے وہ مجھے دوست رکھتا ہے جو فاطمہؑ کو خوشنود کرتا ہے وہ مجھے خوشنود کرتا ہے اور جو فاطمہؑ کو ناراض کرتا ہے وہ مجھے ناراض کرتا ہے"

دونوں نے جواب دیا کہ بے شک ہم نے رسولؐ خدا سے یہ قول سنا ہے۔

اس پر آپؑ نے بے دریغ فرمایا:

میں خدا اور اس کے فرشتوں کو گواہ کر کے کہتی ہوں کہ تم دونوں نے مجھے ہرگز خوش نہیں کیا بلکہ تم نے مجھے ناراض اور ناخوش کیا ہے اور جب میں رسولؐ خدا سے ملاقات کروں گی تو ان سے تم دونوں کی شکایت کروں گی۔

ابوبکر یہ سن کر رونے لگے انہوں نے محسوس کیا کہ اب نہ ان میں کچھ کہنے کی تاب ہے اور نہ فاطمہؑ مزید کچھ سننے کے لیے آمادہ ہیں چنانچہ وہ وہاں سے اٹھ گئے عمر بھی ان کے پیچھے ہو لیے وہاں سے مسجد میں آئے تو لوگوں نے دیکھا کہ وہ آشفتہ اور گریاں ہیں۔ متفکر اور متردد ہیں

مگر حکومت کے کارندوں نے انہیں سمجھایا کہ اس وقت ان کا خلافت سے کنارہ کش ہونا مصلحتِ اسلام کے خلاف ہے اور وہ بھی لوگوں کی اس دلیل سے قائل ہو گئے ان کے خیال میں ان کا حکومت کو اپنے ہاتھ میں لینا نصرتِ اسلام اور اجرائے سنت کے لیے ضروری تھا اور اس کے بعد انہوں نے جو سب سے پہلا حکم صادر کیا وہ یہ تھا کہ فدک کو بحقِ سرکار ضبط کر لیا جائے۔

اس طرح علیؑ مالی اور ذاتی حیثیت سے مفلوج کر دیئے گئے اب ان کا انحصار اس آذوقہ پر تھا جو انہیں بیت المال کے سرکاری ادارے سے مل سکتا تھا

اس تہیدستی اور تنہائی کے عالم میں علیؑ کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ وہ چند لوگ جو ان کی وفاداری کا دم بھرتے تھے کسی دباؤ کے تحت یا اپنی مرضی سے منتشر ہو گئے۔ اب تنہا علیؑ کا بیعت نہ کرنا حکومت کی نظر میں کسی خطرہ کا موجب نہیں تھا پھر یہ بھی کہ صاحبانِ اقتدار کو اس بات کا یقین تھا کہ جب تک فاطمہؑ زندہ ہیں علیؑ کو بیعت پر مجبور کرنا ممکن نہیں ہے اس لیے کہ فاطمہؑ کے دل میں ایک ایسی حکومت کے لیے جس کی بنیاد حق پر نہیں تھی کسی طرح کا کوئی نرم گوشہ نہیں تھا۔ وہ جب تک زندہ رہیں اس حکومت کی مخالف رہیں اور اس سے شدید ناراضگی اور برہمی کا اظہار کرتی رہیں ان کی اس برہمی اور ناپسندیدگی میں تا دمِ مرگ کسی ایک لحظہ کے لیے بھی کوئی کمی واقع نہ ہو سکی۔

پیغمبرؐ رحلت فرما چکے، علیؑ خانہ نشین ہو گئے۔ میراثِ فاطمہؑ (فدک) جو ان کا ان کے شوہر اور بچوں کا واحد سہارا تھی چھین لی گئی حکومت ابوبکر اور عمر کے ہاتھ میں چلی گئی اور اسلام اور عوام کی تقدیر سیاست کو سونپ دی گئی۔ عبدالرحمٰن بن عوف عثمان، خالد بن ولید اور سعد بن وقاص جیسے لوگ خلافت کے اصلی کارگذار ٹھہرے اور علیؑ خانہ نشیں ہو کر قرآن کی جمع اور تدوین میں مصروف ہو گئے وہ مستقبل اسلام کے متعلق فکرمند تھے، بلالؓ مدینہ چھوڑ کر شام میں گوشہ گیر ہو کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے اور سلمان فارسیؓ اپنے پرمعنی اور افسردہ لہجہ میں اپنے دلی جذبات کا اظہار

کر کے خاموش ہو گئے انہوں نے ان لوگوں سے جو سقیفہ کی کارروائی میں شریک تھے کہا کہ تم نے وہ کیا جو تمہیں نہیں کرنا چاہیئے تھا تھا اور تم نے وہ نہیں کیا جو تمہیں کرنا چاہیئے تھا اس کے بعد وہ غم زدہ اور مایوس ایران کی طرف لوٹ گئے اور مدائن میں انتقال کر گئے ابوذرؓ جو پیغمبرؐ کے انیس و غم گسار تھے اور عمارؓ جو پیغمبرؐ کو عزیز تھے خاموش اور بے عمل ہو گئے۔

مگر فاطمہؑ

مگر فاطمہؑ نے ہمت نہیں ہاری ہر چند کہ ان پر غم و اندوہ کے پہاڑ ٹوٹے مگر ان کے پائے استقامت میں لرزش نہیں ہوئی انہوں نے خلافت اور خلیفہ کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھی فدک کو واپس لینے کے لیے بھرپور کوشش کی اور اس کوشش میں حکومت پر سخت تنقیدی حملے کئے انہوں نے کوشش کی کہ سب لوگوں پر یہ بات کھل جائے کہ حکومت نے فدک کو چھین کر ان سے سیاسی مخالفت کا انتقام لیا ہے اور اس طرح علیؑ کو اقتصادی طور پر زک پہنچانے کی کوشش کی ہے

فدک ایک چھوٹا سا زرخیز قطعہ تھا اور اگر یہ بہت بڑا قطعہ اراضی بھی ہوتا تو بھی فاطمہؑ کے لیے کسی قطعہ زمین کی یہ اہمیت ہرگز نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اس کے لیے مبارزہ کریں جدوجہد اور کشمکش کی راہ اختیار کریں لیکن فدک کا غصب کیا جانا حکومت کے ظلم و جور کی علامت تھا۔ وہ مسئلہ فدک کے حوالے سے حکومت کی پالیسیوں کو بے نقاب کرنا چاہتی تھیں وہ یہ واضح کرنا چاہتی تھیں کہ حکومت اپنی مصلحت کی قربان گاہ پر حق کو کس طرح قربان کر رہی ہے کس طرح لوگ اس بات سے بھی دریغ نہیں کرتے کہ وہ پیغمبرؐ سے کوئی جھوٹی حدیث منسوب کریں یا ان کے قول کو لفظی اور معنوی طور پر مسخ کر دیں ان کی خواہش تھی کہ لوگ یہ جان لیں کہ وہ حکومت جو "سنتِ رسولؐ" کو اپنا شعار بتاتی ہے خاندانِ رسولؐ کو کس طرح ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہی ہے اسلام

کے قوانین میں ہر باپ کا ورثہ اس کی اولاد کو ملتا ہے یہ لوگ پیغمبرؐ اور ان کی اولاد کو اس عام حق سے بھی محروم کرنا چاہتے ہیں گویا ان کا کہنا ہے کہ پیغمبرؐ اولاد تو چھوڑ سکتا ہے مگر اولاد کے لیے ورثہ نہیں چھوڑ سکتا۔

فدک، فاطمہؑ کی نگاہ میں اقتصادی مسئلہ نہیں تھا۔ بلکہ سیاسی مسئلہ تھا۔ جس کے وسیلہ سے وہ حکومت کے غصب حق کے رویہ کو بے نقاب کرنا چاہتی تھیں۔ فاطمہ نے اس مسئلہ میں جو اس قدر جدوجہد کی۔ اس کا مقصد محض مالی فائدہ نہیں تھا جیسا کہ ان کے دشمن اور نادان دوستوں کا خیال ہے

فاطمہؑ نے حالات کے آگے سر نہیں جھکایا ہر چند کہ مرگ پیغمبرؐ کے صدمۂ جانگاہ نے ان کے وجود کو غم کی آگ سے بھر دیا تھا اور اس کے بعد پے درپے واقعات کی سنگین ضربات نے ان کو مجروح اور شکستہ کر دیا تھا۔ ہر چند کہ تمام مہاجر اور انصار سوائے ان چند لوگوں کے جن کو انگلیوں پر شمار کیا جا سکتا تھا نئی حکومت کو قبول کر چکے تھے اور نئے خلیفہ کی بیعت کر کے سقیفہ کی کارروائی کی تائید کر چکے تھے۔ مگر فاطمہؑ نے ہمت نہیں ہاری فاطمہؑ کو اس بات کی بہت کم امید تھی کہ حالات کے رخ کو بدلا جا سکتا ہے وہ جانتی تھیں کہ علیؑ اپنے حق سے محروم کر دیئے گئے ہیں بازی گران سیاست بہت دنوں سے اپنے لیے زمین ہموار کر رہے تھے اور انہوں نے سقیفہ میں انتخاب خلیفہ کر کے بازی جیت لی تھی نئی حکومت اور اس کے کارندے ماحول پر پوری طرح حاوی ہو چکے تھے لوگوں نے نئی حکومت کو تسلیم کر لیا تھا۔ فاطمہؑ ان سب باتوں کو سمجھتی تھیں لیکن لوگوں کی خاموشی اور بے تعلقی کے باوجود حالات کی تمام تر سنگینی اور ناسازگاری کے باوجود وہ یہ سمجھتی تھیں کہ ان پر حق کی راہ میں جدوجہد اور مبارزہ کی جو ذمہ داری ہے وہ اس سے بری الذمہ نہیں ہو سکتیں وہ اپنی مسئولیت کو نظرانداز نہیں کر سکتیں اس لیے کہ وہ فاطمہؑ تھیں ان پر باطل کے خلاف جدوجہد کی ذمہ داری تھی اگرچہ انہیں اس جدوجہد میں کامیابی کی توقع بہت کم تھی مگر باطل کے خلاف جہاد ان کا فریضہ تھا ان کی ذمہ داری تھی کہ وہ نظام باطل کے خلاف جہاد کریں اس لیے کہ اگر وہ اس نظام کو شکست نہیں

دے سکیتں تھیں تو کم از کم اس کی اصلیت کو بے نقاب تو کر سکتی تھیں وہ اگر باطل کو مٹا نہیں سکتی تھیں تو اسے رسوا تو کر سکتی تھیں اگر ان کے لیے حق حاصل کرنا ممکن نہیں تھا تو حق کا اثبات کرنا تو ممکن تھا انہوں نے اپنی ذمہ داری کو پورا کیا باطل کے خلاف حق کا اثبات کیا تاکہ دعویٰ حق زندہ رہے تاکہ آنے والے زمانوں میں لوگ سمجھ سکیں کہ جو کچھ ہوا وہ ناحق اور ظلم تھا اور حالات نے باطل کو کامیاب اور کامران بنا دیا جبکہ شکست اور محرومی، حق، عدل اور آزادی کے حصے میں آئی یہی وجہ ہے کہ مدینہ کی فضا تاریخ کے اس عجیب منظر کو دیکھ رہی ہے کہ مسجد پیغمبرؐ کے کنارے میں رات کی تاریک فضاؤں میں ایک مرد اپنی شریکِ حیات کو جو سرتاپا سیاہ لباس عزا میں ملبوس ہے مرکب پر سوار کرتا ہے اور پھر دونوں مدینہ کی پیچ در پیچ گلیوں میں گشت کرتے ہیں۔

ان میں جو شخص پیادہ ہے وہ علیؑ ہے اور جو خاتون مرکب پر سوار ہے وہ پیغمبرؐ کی محبوب اور مجاہد بیٹی فاطمہؑ ہے دونوں ہر رات اسی طرح اپنے گھر سے برآمد ہو کر انصار کے محلوں میں جاتے ہیں۔ انصار نسبتاً مخلص اور غیر جانبدار ہیں جبکہ مہاجرین جن کی اکثریت قریش سے تعلق رکھتی ہے ایک دوسرے کے حلیف ہیں ان کا ایک دیرینہ سیاسی نظام ہے جو ان کی اجتماعی شیرازہ بندی کا ضامن ہے، اب کہ خلیفہ ان میں سے منتخب ہو گیا ہے اور اس انتخاب میں قبائلی اثر و نفوذ کا بڑا گہرا دخل تھا اس لیے تمام قبیلہ حکومت میں خود کو سہیم اور شریک سمجھتا ہے انصار کی صورت اس سے مختلف ہے، انہیں نئی حکومت میں کوئی حصہ نہیں مل سکا ہے سعد بن عبادہ انصار کی طرف سے خلافت کے امیدوار تھے مگر انہیں مدینہ چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا اور جب وہ شام کی طرف جا رہے تھے تو اثنائے راہ میں انہیں ہلاک کر دیا گیا اور انکے قتل کو جنوں کی کارروائی سے تعبیر کیا گیا۔ انصار نے ابوبکر کے اس استدلال کو تسلیم کر لیا کہ پیغمبر کی یہ خواہش تھی کہ خلیفہ قریش میں سے ہو ان کے خاندان میں سے ہو اور ان کے قرابت داروں میں سے ہو انہوں نے قولِ پیغمبرؐ کے احترام اور خاندان

رسالتؐ کی حرمت کے پیش نظر امر خلافت سے دست کشی اختیار کر لی اور حکومت ابوبکر کے سپرد کر دی اس لیے کہ ابوبکر کا تعلق پیغمبرؐ کے قبیلہ سے تھا اور وہ زوجۂ رسولؐ کے باپ تھے اور یہ اس حقیقت کے باوجود کہ انصار کی اکثریت تھی اور وہ مدینہ کے اصل باشندے تھے۔

اور اب فاطمہؑ ذاتی طور پر ان کے پاس جاتی ہیں وہ ہر شب علیؑ کے ہمراہ ان کے اجتماعات سے خطاب کرتی ہیں، انہیں علیؑ کی ایک ایک فضیلت یاد دلاتی ہیں ان سے پیغمبرؐ کی ایک ایک خواہش بیان کرتی ہیں وہ اپنی عظیم انسانی شخصیت اپنی روحانی معنویت، سیاسی آگاہی اسلام اور اس کے تقاضوں سے اپنی گہری واقفیت اور اپنی قوتِ منطق و استدلال کو بروئے کار لا کر ان پر علیؑ کے حق کو ثابت کرتی ہیں، علیؑ کو چھوڑ کر جو انتخاب کیا گیا ہے اس کے ناحق ہونے کا اثبات کرتی ہیں لوگوں کو جو فریب دیا گیا ہے اسے آشکار کرتی ہیں اور جلد بازی میں کی گئی سیاسی کارروائی اور اس کی طرف سے غفلت کے نتیجہ میں آئندہ اسلام اور امتِ مسلمہ کو جو خطرات پیش آنے والے ہیں ان سے متنبہ کرتی ہیں۔

جتنے راویانِ تاریخ نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے ان میں سے کسی نے کہیں یہ نہیں لکھا کہ کسی شخص نے کسی موقع پر فاطمہؑ کی بات سے ذرا سا بھی اختلاف کیا ہو سب لوگ ان کی دلیلوں کو من و عن تسلیم کرتے تھے انتخابِ خلیفہ کے باب میں اپنی زبردست غلطی کا اعتراف کرتے تھے علیؑ کے حق ان کی فضیلت اور شرف کا اقرار کرتے تھے لیکن جب فاطمہؑ ان سے یہ مطالبہ کرتی تھیں کہ علیؑ کے حق کو واپس دلوانے کے لیے مدد کریں تو یہ سب معذرت کرتے تھے کہ

اے رسولؐ خدا کی بیٹی، ہم نے ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے اب یہ معاملہ ختم ہو چکا ہے اگر آپ کے شوہر اور ابن عم، علی ہم سے پہلے رابطہ کر کے اپنے حقِ خلافت کا مطالبہ کرتے تو ہم ان کے مقابلے میں کسی اور کو ہرگز ترجیح نہ دیتے۔

انصار کی یہ گفتگو سن کر علیؑ متعجب ہوتے اور احتجاج آمیز لہجہ میں کہتے:

میں رسولِ خدا کو ان کے گھر میں چھوڑ کر ان کے غسل و کفن سے دست کش ہو کر باہر آجاتا اور حکومت کے جھگڑوں میں پھنس جاتا؟

فاطمہؑ محسوس کرتیں کہ اس موقع پر بھی ہمیشہ کی طرح علی پیغمبرؐ سے عشق و وفاداری کے سبب اپنے حق سے محروم ہوگئے۔ وہ کہتیں

ابوالحسن نے وہی کیا جو انہیں کرنا چاہیئے تھا اور کوئی ایسا کام نہیں کیا جو ان کے شایانِ شان نہیں تھا دوسروں نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا اس کا حساب لینے والا خدا ہے۔ وہی ان کا محاسبہ کرے گا۔

فاطمہؑ کا احساسِ محرومی

اب ہر بات گویا ختم ہوگئی ہر چیز اپنے انجام کو پہنچ گئی

فاطمہؑ کو اب صرف موت کا انتظار ہے وہ اپنے آپ کو اس قدر تنہا محسوس کر رہی ہیں جس کا تصور بھی ممکن نہیں ہے وہ چہرے جو سالہا سال تک ان کے والد کے فدا کار و جاں نثار تھے وہ لوگ جو ہر جگہ اور ہر موقع پر ان کے ساتھ نظر آتے تھے اب بالکل بدل گئے ہیں وہ تمام چہرے سخت بیگانہ نظر آتے ہیں اب اصحابِ پیغمبرؐ بالکل بدلے ہوئے ہیں مدینہ اب "شہر پیغمبرؐ" نہیں رہا اس "شہر ایمان" کی فضا کو حکومت و سیاست نے اپنی گرفت میں لے لیا ہے اسلام نے جو انقلاب برپا کیا تھا عرب بدویت کے قالب میں احساس و ایثار و حق پرستی اور خضوع و خشوع کی جو روح پھونکی تھی انسانی عزت اور شرافت کے جو معیار قائم کئے تھے۔ جہاد و ایمان و تقویٰ کا جو فلسفۂ حیات تعلیم کیا تھا اس کی جگہ پرانا نظام پھر عود کر رہا ہے کہنہ روایات، قبائلی، نسلی، اور خونی تعصبات سر اٹھا رہے ہیں، قبائلی برتری شخصی خود پسندی، سیاسی گروہ بندی اور مصلحت شناسی کا دور دورہ ہے لوگ گھٹیا مصلحتوں اور حقیر مفادات کے دام میں پھر سے پھنس گئے ہیں مسلسل ایسی باتیں کی جا رہی ہیں جن سے اسلام کی آتشِ انقلاب سرد ہو جائے لوگوں میں مسئولیت اور ذمہ داری کا احساس ختم ہو جائے جدوجہد اور ترقی کا جذبہ ماند

پڑجائے گویا اسلام کا وہ نور جو روح کو روشن کرتا ہے بجھ جائے اس کے پیغام کی، معنویت مسخ ہو جائے اور اسلام جو فکر و عمل کے لیے ایک مسلسل انقلابی تحریک ہے حکومت کے جامد نظام کے مترادف سمجھا جانے لگا۔

علیؑ کی گوشہ گیری

علیؑ خانہ فاطمہؑ میں گوشہ گیر ہو گئے ہیں ان کے وفادار دوست جو خاندانی اور طبقاتی اعتبار سے بے حیثیت تھے مگر جن کی چشم و دلِ پیغمبرؐ میں بڑی حیثیت تھی جنہوں نے اپنی شخصیت اور حیثیت اپنے ایمان، اخلاص آگاہی اور راہِ حق میں جدوجہد کے حوالے سے بنائی تھی اب سیاست کاروں کی نگاہوں میں بے وقعت قرار پائے ہیں اس کے برعکس موقع شناس اور مصلحت پسند لوگوں کو اپنی حیثیت اور اہمیت بنانے کا ہر موقعہ حاصل ہے

اب فضا غوغائے حکومت و سیاست سے اس قدر معمور ہے کہ اس شور و غل میں لوگوں کے لیے محبت اور اخلاص کی نرم و لطیف آواز کا سننا ممکن نہیں ہے

ابوبکر کی شخصیت، عمر کی ہیبت، خالد کی تلوار اور عمرو عاص کی چالاکی نے مدینہ کی فضاؤں میں ایسی دیواریں بلند کر دی ہیں کہ عوام و خواص اس حصار میں محصور ہو گئے ہیں خانۂ فاطمہؑ اس حصار سے باہر ہے اور فاطمہؑ کی آواز ان دیواروں کو توڑ کر حصار کے اندر نہیں پہنچ سکتی۔

سنگین صورتِ حال

مدینہ میں دشمنانِ فاطمہؑ، ان دشمنوں کے مقابلے میں جن سے مکہ میں سابقہ تھا کہیں زیادہ طاقتور نظر آتے ہیں ان کے والد نے مکہ میں تن تنہا پورے شہر کی مخالفت کا مقابلہ کیا اس وقت رسولؐ کا حامی اور محافظ اگر کوئی تھا تو وہ ان کی کم سن اور کمزور بیٹی فاطمہؑ تھیں لیکن پیغمبرؐ مسجد الحرام میں جہاں ۳۶۶ بے جان بت رکھے ہوئے تھے، وہ

پتھر کے بت جنہیں عرب اپنا شفیع اور معبود سمجھتے تھے قریش کے مرکز طاقت دار الندوہ کے سامنے غرض ہر موقع پر بغیر کسی تردد کے ببانگ دہل اعلان کرتے تھے کہ میں اللہ کی نصرت سے ان سب بتوں کو شکست دوں گا وہ گمراہ عربوں کو بے زبان اور بے شعور پتھروں سے تشبیہ دیتے تھے وہ ان کے آباؤ اجداد کی روایت کو جہالت اور غفلت سے تعبیر کرتے تھے اور ان کے تمام بتوں کو خرافات اور بے مایہ قرار دیتے تھے مکہ میں ان کے جاہ وجلال کا یہ عالم تھا کہ ان کے لہجہ میں کسی قسم کا ضعف یا افسردگی نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ قطعی اور واضح اور دو ٹوک لہجہ میں قوم سے مبارزہ فرماتے تھے اس کے برعکس مدینہ میں اپنی زندگی کے آخری ایام میں جو ان کے اوج وقدرت وطاقت کے عروج کا زمانہ تھا ان کی بات نہیں مانی گئی سپاہ اسامہ کے بارے میں ان کے حکم کی تعمیل نہیں کی گئی درآنحالیکہ اس بارے میں انہوں نے صریحی احکامات صادر فرمائے تھے لیکن پیغمبرؐ کی تاکید و تکرار کے باوجود دعا و نفرین کے باوجود بیماری کے عالم میں ان کی تمام کوششوں اور خواہشوں کے باوجود سپاہ اسامہ نے حرکت نہ کی انہوں نے جس لشکر کو پیش قدمی کا حکم دیا تھا وہ مدینہ کے مضافات میں جرف کے مقام پر پڑاؤ ڈالے رہا اور لوگ ایک قدم آگے بڑھنے پر تیار نہیں ہوئے۔

اب کیا کہا جائے حقیقت یہ ہے کہ پیغمبرؐ خود اپنے گھر میں اپنے نزدیک ترین اصحاب کو ایک تحریر لکھ کر دینا چاہتے تھے مگر وہ تحریر نہ لکھ سکے۔ کچھ وصیت کرنا چاہتے تھے مگر وہ وصیت نہ کر سکے اور جو کچھ کہا وہ تحریف و توجیہ سے محفوظ نہ رہ سکا۔

فاطمہؑ کے شوہر علیؑ جو مرد شمشیر و جرأت تھے جو دور پیغمبرؐ کی تمام جنگی مہموں کے ہیرو تھے علی جنہوں نے شجاعت اور جرأت کے وہ کارنامے انجام دیئے کہ تاریخ انگشت بدنداں ہے۔ جنگ خندق میں تمام دشمن قبائل نے متحد ہو کر مدینہ پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اس موقع پر تمام مخالف قوتیں (مشرک اور یہودی، اہل کتاب اور کافر ایک خدا کو ماننے والے اور بت پرست) اسلام کی مخالفت میں ایک ہو گئی تھیں عربوں اور یہودیوں نے اپنی تمام توانائیوں کو یکجا کر لیا تھا تاکہ اسلام کی نو عمر انقلابی

تحریک کو کچل دیں اور انقلاب رسالتؐ کے مرکز یعنی مدینہ کو تاخت و تاراج کر دیں
ان کا دعویٰ تھا کہ وہ مدینہ کی مٹی تک کھود کے لے جائیں گے ایسے موقع پر علی نے
جو اس وقت صرف ۲۰ سالہ جوان تھے اپنی ایک کاری ضرب سے جنگ کا نقشہ بدل
کر رکھ دیا۔ جنگ احد میں جب کفار قریش نے درّہ کے نگہبانوں کو ہلاک کر کے مسلمانوں
پر یلغار کر دی جب مسلمان لشکر منتشر اور پراگندہ ہو چکا تھا جب لوگ میدان جنگ
سے فرار کر رہے تھے جب بڑے بڑے صحابی میدان چھوڑ گئے جب پیغمبرؐ تنہا اور بے سہارا
رہ گئے تھے اور دشمن نے ان کو زخمی کر دیا تھا جب دشمن ہر طرف سے پیغمبرؐ پر یلغار
کر رہے تھے اور کوئی ان کی حفاظت کرنے والا نہ تھا ایسے عالم میں صرف علیؑ ہی تھے
جو اپنی جان پر کھیل کر پیغمبرؐ کے گرد ان کی حفاظت کر رہے تھے وہ ایک طوفان کی طرح
کبھی پیغمبرؐ کے گرد نظر آتے اور کبھی میدان جنگ میں سر فروشی کے جوہر دکھاتے اور
دشمن کے ان دستوں کو جو شہدا کی لاشوں کو روندتے ہوئے پیغمبرؐ کی طرف یلغار
کر رہے تھے پیچھے دھکیلتے۔ پھر وہ پیغمبرؐ کی طرف واپس لوٹتے ان کی حفاظت کرتے اور
پھر کسی آندھی کی طرح میدان جنگ کی طرف سبقت کرتے فرار کرنے والوں کو روکتے ،
میدان چھوڑنے والوں کو آوازیں دیتے دل شکستہ مجاہدوں کی ہمت بڑھاتے اس کے
ساتھ ہی وہ حفاظت پیغمبرؐ کے فریضہ سے عہدہ برآ ہونے کے لیے پیغمبرؐ کی طرف رجوع
کرتے اور انہیں دشمنوں کے حملے سے بچاتے یہ علیؑ ہی تھے کہ جن کی فداکاری نے پیغمبرؐ
کو محفوظ رکھا اور جن کی شجاعت اور سر فروشی کے نتیجہ میں مسلمانوں کا لشکر جو منتشر ،
پراگندہ اور دل شکستہ ہو چکا تھا پھر سے مرتب ہوا۔ اور قریش جو خبر مرگ پیغمبرؐ سے
خوش اور شادکام، لاشہائے شہدا کے نظارے سے دلشاد اور خون حمزہؑ سے بدمست
اپنی فتح کا جشن منا رہے تھے بالآخر میدان چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور یہ علیؑ ہی تھے جنہوں
نے حنین میں شکست کو فتح سے بدلا اور یہ علی ہی تھے کہ جن کے ہاتھوں پر خیبر فتح ہوا۔

علیؑ وہ مرد شجاع کہ جن کی تلوار میدان جنگ میں دشمنوں کے سروں کو اس طرح
کاٹتی ہے جیسے کوئی درانتی گندم کی پکی ہوئی فصل کو کاٹتی جائے جن کی شمشیر خوں

آشام سے میدانِ جنگ موت اور خون کا کشت زار بن جاتا ہے جن کے گھوڑے کے آگے دشمنوں کے لاشوں کے ڈھیر جمع ہوجاتے ہیں اب خاموش اور غمگین ہیں یہ کیا بات ہے کہ انہوں نے خاموشی اور گوشہ گیری اختیار کرلی علیؑ جن کے چہرے پر کسی نے کبھی خوف کی کوئی ہلکی سی رمق بھی نہیں دیکھی اب ہراساں نظر آتے ہیں جیسے ان کی فکر افق ہائے تاریک کا مشاہدہ کر رہی ہو۔ جیسے وہ خوفناک اور مایوس کن مستقبل کی فکر میں غلطاں ہوں۔

فاطمہؑ سوچتی ہیں کہ ان کے شوہر کی شمشیر جوہر دار اب کیوں خاموش ہے یہ وہی شمشیر ہے کہ علیؑ جب بھی جہاد سے لوٹتے تھے یہ تلوار دشمنوں کے خون سے رنگین ہوتی تھی اور جب علیؑ گھر میں داخل ہوتے تھے تو رسولؐ خدا کی شمشیر آبدار کے ساتھ ساتھ اپنی خون آلود تلوار کو ان کے حوالے کرکے نہایت فخر و مباہات کے لہجہ میں ان سے فرمائش کرتے تھے کہ اس تلوار کو دھو کر صاف کر دو۔ مگر عہد پیغمبرؐ کے دس سالہ مجاہدانہ کارناموں کے باوصف اب آخر کیا ہو گیا ہے کہ علی اس طرح خاموش اور غمگین ہیں اس طرح گوشہ گیر ہو گئے ہیں حتیٰ کہ جب لوگوں نے ان کے گھر پر یلغار کی تو بھی وہ اپنی خاموشی کے حصار سے باہر نہیں نکلے۔ فاطمہؑ دیکھ رہی ہیں کہ اب ایک ایسی کشمکش اور مبارزت کا آغاز ہو چکا ہے جس میں خود پیغمبرؐ عاجز و ناتواں تھے اور جس میں علیؑ جو صاحب سیف و علم ہیں اور جن کی ہیبت سے میدان جنگ لرزتا تھا مجبور اور شکست خوردہ نظر آتے تھے اس صورت حال میں تنہا فاطمہؑ کیا کریں۔

ہمیشہ داخلی محاذ پر کشمکش، خارجی دشمن سے جنگ کے مقابلہ میں زیادہ دشوار اور کٹھن ہے اب جس جنگ کا آغاز ہوا ہے اس میں مد مقابل ابولہب، ابوجہل ابوسفیان، ہند، عتبہ، امیہ بن خلف، اور عکرمہ نہیں ہیں ان پلید چہروں کو سب پہچانتے تھے ان کا ایمان، اسلام، اور انسانی اقدار سے کوئی تعلق نہیں تھا یہ محض اپنی دولت اور طاقت کے لیے جنگ کر رہے تھے۔ ان کی محاذ آرائی کا مقصد اپنے معاشی اور سماجی مفادات کا تحفظ تھا، یہ اپنی معیشت، تجارت، اور طبقاتی نظام

کی حفاظت کے لیے اسلام کے خلاف برسرپیکار تھے ان سے جنگ رجعت پسندی اور انقلاب غلامی اور آزادی، ذلت اور عزت اور برائی اور اچھائی کی جنگ تھی۔ یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس جنگ میں ایک طرف دشمنانِ انسانیت تھے جو جہل اور تاریکی کے پاسبان تھے اور دوسری طرف انسانیت نواز اور پرچم علم و آگہی کے علمبردار تھے۔

مگر اب صورتِ حال مختلف ہے ایک طرف علیؑ اور فاطمہؑ ہیں جنہوں نے پیغمبرؐ کی مکی زندگی میں ان کی جدوجہد میں حصہ لیا جنہوں نے بدر و احد و خیبر و حنین کے معرکوں میں شرکت کی مگر اب دوسری طرف کون ہے؟ ابوبکر کہ خانوادہ پیغمبرؐ کو چھوڑ کر پیغمبرؐ پر سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں جو ان کے یارِ غار ہیں جو ہجرت کے موقع پر ان کے شریک سفر ہیں جو زوجۂ پیغمبرؐ ام المومنین عائشہ کے والد ہیں یہ وہ ہیں کہ جنہوں نے پیغمبرؐ کی بے کسی اور غربت کے دور میں ان کا ساتھ دیا اپنا تمام مال و دولت راہِ اسلام میں خرچ کر دی یہاں تک کہ انہیں مدینہ میں غربت کے ہاتھوں یہودیوں کے یہاں کام کرنے پر مجبور ہونا پڑا یہ وہ ہستی ہے جسے لوگ پورے تیئس سال یعنی آغاز بعثت سے، رحلتِ پیغمبرؐ کے تمام عرصہ میں ہر موقع پر اور ہر جگہ پیغمبرؐ کے ساتھ ساتھ دیکھتے رہے ہیں۔

اور عمر ہیں جو وہ چالیسویں فرد ہیں جنہوں نے خانۂ ارقم بن ابی ارقم پر حاضر ہو کر اسلام قبول کیا، اور ان کے اور حمزہ کے مشرف بہ اسلام ہونے سے پیغمبرؐ کے وہ اولین ساتھی جو خود کو ضعیف اور کمزور محسوس کر رہے تھے توانا اور طاقتور محسوس کرنے لگے اور اس دن سے انہوں نے اپنی تمام توانائیوں کو نہضت اسلامی کے لیے وقف کر دیا۔ یہاں تک کہ ان کا شمار پیغمبرؐ کے نزدیک ترین اصحاب اور معزز ترین مہاجرین میں ہونے لگا وہ ام المومنین حفصہ کے والد تھے اور لوگوں کی نگاہوں میں ان کی حیثیت یہ تھی کہ ان کا شمار اصحاب کبار اور رہبرانِ بزرگ میں کیا جاتا تھا اور ان دونوں کے ساتھ کون لوگ تھے؟ ابوعبیدہ جو مہاجرین اور سابقین میں تھے اور عثمان جنہیں

مہاجر ذو ہجرتین اور "ذوالنورین" کہا جاتا تھا۔ یہ صاحب حیثیت و دولت شخص تھے جن کا تعلق قریش کے دو معزز خانوادوں سے تھا۔ (باپ کی طرف سے خاندانِ امیہ اور ماں کی طرف سے خاندانِ ہاشم) انہوں نے اپنی کثیر دولت سے پیغمبرؐ کے غریب و نادار ساتھیوں کی بہت مدد کی اور اپنی دولت کو امور خیر میں خرچ کرتے رہے لوگ انہیں پیغمبرؐ کے قدیم اصحاب میں شمار کرتے تھے ان کو اولین مہاجرین میں گنتے تھے اور انہیں پیغمبرؐ کا قریبی دوست اور ان کا قرابتدار سمجھتے تھے۔

اور خالد بن ولید ہیں جنہوں نے دشمنانِ اسلام سے جہاد میں بڑے زبردست کارنامے انجام دیتے ہیں جنگ موتہ میں جہاں کشت و خون کا بازار بہت شدت سے گرم تھا انہوں نے رومیوں کے خلاف اس شدت سے جنگ کی کہ ان کے ہاتھ میں نو تلواریں ٹوٹیں اور ان کا لقب سیف اللہ پڑ گیا۔ اور عمرو عاص ہیں جن کا شمار عرب کے چار عقل مند ترین افراد میں ہوتا تھا۔ وہ بہت دنوں سے دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے اور شمالی علاقوں میں رومی حکومت کے خلاف طاقتِ اسلام کا مظاہرہ کرتے رہے تھے اور سعد ابن ابی وقاص ہیں جو مسلمانوں میں پہلے تیر انداز تھے۔ جنہوں نے دشمنوں پر تیر چلا کر مسلمانوں کو مدافعانہ جنگ کے ساتھ ساتھ دشمنوں پر حملہ کرنے کی تدبیر سکھائی جنہوں نے جنگِ احد میں اپنی ناوک اندازی کے جوہر دکھلاتے ہوئے پیغمبرؐ کی اس مرحلہ پر حفاظت کی جب وہ سخت خطرے میں گھر گئے تھے اور ان کی ان کوششوں کی پیغمبرؐ نے بالخصوص ستائش فرمائی اور اسی طرح کے دوسرے لوگ ہیں اور ان لوگوں کو تمام مقتدر مہاجرین و انصار تمام سر برآوردہ مسلمانوں اور پیغمبرؐ کے قریب ترین دوستوں اور ساتھیوں کی تائید اور حمایت حاصل ہے۔

اور ان کا شعار کیا ہے؟ بت پرستی و شرک نہیں ہے یہ قبائلی اور معاشی مفاد کا علم بلند نہیں کر رہے بلکہ ان کے ہاتھوں میں توحید کا علم ہے ان کا نعرہ اسلام کی برتری ہے یہ جمع و ترویج قرآن کے دعویدار ہیں یہ دولت کے مقابلہ میں تقویٰ کو فضیلت دیتے ہیں ان کا نعرہ خدمتِ خلق، رضائے الٰہی کا حصول، حدود و احکام

شرع کی حفاظت اور اجرا رہے بالفاظ دیگر یہ لوگ سنتِ رسولِ خدا کے احیاء کے دعویدار ہیں اور سب سے بڑھ کر ان کا نعرہ وحدت و اتحاد مسلمین ہے۔

اور اس تمام حکمت عملی میں حق کو پامال کرنا بہت سہل اور آسان ہے حق علیؑ کس طرح پامال کیا گیا۔ نہایت آسانی سے، بڑی ہوشیاری سے، مفادِ اسلام اور مفادِ امت کے نام پر اس حق کو قربان کر دیا گیا دلیل یہ دی گئی کہ داخلی طور پر علیؑ کے بہت دشمن ہیں ان کو حاکم بنانے سے یہ مخالفیں سر اٹھائیں گی تو ملت میں انتشار پیدا ہوگا۔ جب ملت داخلی طور پر منتشر ہوگی تو خارجی خطرہ بھی شدید ہو جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ یہ بات عملی مصلحت کے خلاف ہے۔ علیؑ جوان ہیں ابھی صرف تیس سال سے کچھ زیادہ ہیں ان کے مزاج میں ایک ایسی سختی ہے جو لوگوں کی اکثریت کو پسند نہیں اور لوگ ان سے کینہ رکھتے ہیں اکثر معزز قبیلوں کے سربرآوردہ لوگ ان سے خوش نہیں ہیں بہت سی با اثر شخصیتیں اور طاقتور گروہ ان کے مخالف ہیں ان کا حاکم ہونا اپنے مفاد کے خلاف سمجھتے ہیں

علیؑ کے لیے ابھی خلافت قبل از وقت ہے ان کا حاکم ہونا "مصلحت" کے خلاف ہے۔ ہاں "مصلحت" ہی تلوار ہے جس سے ہمیشہ "حقیقت" کے جسم کو لہو لہان کیا گیا ہے۔

مصلحت وہ تلوار ہے جس سے ہمیشہ حقیقت کو ذبح کیا گیا اور اس قربانی کو شرع کے نام پر انجام دیا گیا ہے یہ ذبح، ذبح شرعی، رو بہ قبلہ، بنامِ خدا ہے۔ اس کا گوشت حلال ہے اس لیے کہ یہ قربانی طیب و طاہر ہے۔

اور یہ کام کس قدر آسانی سے انجام پاتا ہے اس میں کوئی آواز نہیں ابھرتی کوئی اس راز کو سمجھ ہی نہیں سکتا جو سوئے ہوئے ہیں وہ بیدار نہیں ہوتے لوگ کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں کر سکتے کسی کے لیے یہ موقع نہیں ہوتا کہ وہ عوام الناس کو حقیقت سے آگاہ کر سکے ان حقائق کو بے نقاب کر سکے جنہیں مصلحت کی تیغ کی پیہم ضربیں اس طرح خاموشی سے قربان کر دیتی ہیں کہ لوگ ان حقائق کو فراموش کر دیتے

ہیں یہاں تک کہ مصلحت پرستی کے اسلحے سے مسلح لوگ کس طرح کسی کو اس بات کا موقع نہیں دیتے کہ وہ کوئی اعتراض یا احتجاج بھی کر سکے کس طرح مصلحت کے مقابلے میں حقیقت کا دفاع کر سکے یا کم از کم حقیقت کی نشاندہی کی جا سکے۔

ہر چند کہ فاطمہؑ نے ہر عنوان سے حتی المقدور کوشش کی، نالہ و فریاد کے ذریعہ، احتجاج و استدلال کے ذریعہ مگر ان کی ہر صدا، صدا بصحرا ثابت ہوئی اس لیے کہ جس وقت مکر تقویٰ کا لباس پہن لیتا ہے تو تاریخ اپنے ہولناک ترین حادثہ سے دوچار ہوتی ہے

اور یہی وہ ہولناک حادثہ ہے جو علیؑ اور فاطمہؑ اور ان کے تمام فرزندوں اور ان کی نسل کی قربانیوں سے عبارت ہے ان تمام لوگوں کی قربانیوں کی خاموش اور غمگین داستان ہے یہ تاریخ کا سب سے سنگین المیہ ہے

فاطمہؑ نے محسوس کر لیا کہ اس المناک حادثہ کا آغاز ہو چکا ہے اور اب قربانی کے علاوہ اور کوئی بات ممکن نہیں ہے۔

ناگہاں تمام عمر کی جدوجہد کی خستگی نے فاطمہؑ کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ تمام تکالیف، مصائب، وہ تمام سختیاں جو وہ تمام عمر برداشت کرتی رہی تھیں اب پوری شدت کے ساتھ محسوس ہونے لگیں۔

خستگی اور تکلیف کے اس احساس کے ساتھ ہی انہیں یہ بھی یقین ہو گیا کہ اب ہر چیز ہاتھ سے نکل چکی ہے وہ سمجھ گئیں کہ جس سنگین اور المناک حادثہ کو روکنے سے پیغمبرؐ معذور رہے اور جس کے آگے علیؑ بے بس نظر آ رہے ہیں اس حادثہ کو روکنا ان کی استطاعت سے باہر ہے۔

ان کی نگاہوں کے سامنے افق تا افق تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ہر طرف وہ شبِ سیاہ چھائی ہوئی تھی جس کی خبر ان کے پدر بزرگوار نے اپنے آخری ایام میں دی تھی اور اس شبِ سیاہ میں فتنوں کی پے بہ پے یلغار بڑھتی جا رہی تھی مستقبل کیا رنگ اختیار کرے گا؟ ان کے پدر بزرگوار کی محنت شاقہ کے ثمرات کا سیاست اور مصلحت

کی اس بادِ مخالف میں کیا حال ہوگا؟ اس امتِ نوخیز کا مستقبل کیا ہوگا۔ عوام الناس جن کی تقدیر ہمیشہ سیاست، خاندانی اور طبقاتی مفادات اور تضادات کا شکار رہی آئندہ ان کی قسمت کن لوگوں کے ہاتھ میں ہوگی؛ اشرافیت اور قومیت کا تصور پھر سے سر اٹھانے لگا ہے۔ "قومیت" کی جگہ "بیعت" کا اصول اپنا لیا گیا ہے آخر کیوں کر ہوا کہ اوس و خزرج کے قبیلوں کی رائے جو انہوں نے اپنے سرداروں کے حق میں دی اور قریش کی رائے جو ان کے شیوخ کے حق میں تھی۔ پیغمبرؐ کی رائے اور ان کی وصیت پر فائق قرار دی گئی کس طرح ان لوگوں نے جو سقیفہ میں جمع ہوئے تھے پہلے سعد کا انتخاب کیا اور پھر جب ابوبکر نے اپنے حق میں دلائل دیئے تو سب نے ان پر اجماع کر لیا کیا یہ علم اور آگہی میں اس قدر آگے بڑھ گئے ہیں کہ انہیں ملت کے سیاسی مستقبل کے لیے پیغمبرؐ کی کسی ہدایت اور رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے اور یہ سب لوگ مدینۂ رسول کے باشندے ہیں۔ یہ ان کے ساتھی ہیں انہوں نے پیغمبرؐ کے ساتھ اپنی زندگیاں گذاری ہیں۔ غزوات میں حصہ لیا ہے انہوں نے اسلام کی تعلیم خود پیغمبرؐ سے حاصل کی ہے یہ کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں۔ یہ ابوبکر و عمر ہیں۔ مستقبل میں جب اسلام مدینہ سے باہر پھیل جائے گا جب یہ موجودہ نسل گذر جائے گی تو اس وقت "بیعت" کا یہ مسئلہ کیا گل کھلائے گا کون منتخب کرے گا۔ کس کو منتخب کرے گا۔

جب ابھی یہ حال ہے کہ ان مہاجرین اور انصار نے جو پیغمبرؐ کے مخلص فدائی اور جاں نثار تھے ان لوگوں نے جن کا تعلق اسلام کی اوّلین نسل سے ہے اور جو سابق الایمان ہیں۔ علیؑ کو اپنی مصلحتوں کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا اور انہیں خانہ نشینی اور تنہائی کی زندگی گذارنے پر مجبور کر دیا تو پھر وہ نسلِ فردا جو ایمان و تقویٰ اور جہاد کے ماحول کی پروردہ نہ ہوگی ان کی اولاد کے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔ فاطمہؑ اندازہ کر سکتی تھیں کہ مستقبل کی سیاست حسنؑ، حسینؑ، اور زینبؑ کے ساتھ کس طرح کا سلوک کرے گی انہیں اس بات کا یقین تھا کہ ان کے بچوں کا مستقبل کشمکش، جدوجہد اور قربانی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

علیؑ کی خانہ نشینی ایک تاریخ کا نقطۂ آغاز ہے ایک ایسی تاریخ کا جو ہولناک اور خون آشام ہے۔ بیعت سقیفہ نے، جس کا آغاز بے ضرر طریقہ پر ہوا اپنے عقب میں نہایت خون ریز بیعتوں کا دروازہ کھول دیا اور غصب فدک کا قضیہ مستقبل کی نہایت سنگین غاصبانہ اور ظالمانہ کارروائیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ فردا، نہایت ہولناک اور سنگین اور خون آشام ہے اور اس کے بعد اور اس کے بعد...... قتل وغارت گری اور مظالم کا ایک سلسلہ ہے جو پھیلتا چلا جائے گا۔

اور مستقبل کی حکومتیں اسلام کے لیے بہت بڑی مصیبت اور انسانیت کے لیے سنگین ترین حادثہ قرار پائیں گی۔

مگر اب کیا کیا جاسکتا ہے؟ فاطمہؑ نے ہر ممکن کوشش کی کہ خشتِ اوّل کج نہ رکھی جائے۔ مگر وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہوسکیں یوں لگتا تھا جیسے مدینۂ رسولؐ نے ان کی صدا و فریاد کی طرف سے کان بند کرلیے ہوں۔ جیسے لوگوں کے سینہ میں دل کی جگہ پتھر ہوں کہ جو علیؑ کے سکوت سے ذرا متاثر نہ ہوسکیں۔ حالانکہ علیؑ کی خاموشی ہر دل پر جو زندہ ہے، جو علیؑ کو سمجھتا ہے جو اس زمانہ کو پہچانتا ہے ایک ایسی بجلی بن کر گرتی ہے جس سے احساس سلگ اٹھتا ہے۔

خودغرضی بھی کیا سخت اور بے رحم چیز ہے بالخصوص جب وہ مصلحت سے مسلح ہو اور جب وہ اپنے مفاد کی توجیہ عقیدے کے ذریعہ کرسکے یہ وہ منزل ہوتی ہے۔ جب بڑے بڑے صحابی حق کشی پہ آمادہ ہوجاتے ہیں۔

حق بھی کس کا؟ علیؑ کا حق۔

اور فاطمہؑ جو ایک عمر تک اپنے پدر بزرگوار کے بار رسالتؐ کو اٹھانے میں شریک رہیں، جو جاہلیت کے ساتھ مبارزہ اور کشمکش میں مصروف رہیں جن کی زندگی مسلسل سختی، مصیبت، خطرہ، فقر و تنگدستی اور جد و جہد کا نمونہ رہی اب تمام عمر کی جد و جہد اور بار مصیبت سے خستہ ہیں اسی کے ساتھ ہی وہ اپنے باپ کی

موت کے جانکاہ صدمے سے دوچار ہیں وہ اس باپ کی عزادار ہیں جس کی زندگی کے ساتھ ان کی زندگی وابستہ تھی۔ وہ علیؑ کی اس ناقابل برداشت مصیبت کو دیکھ رہی ہیں کہ علیؑ ایک مدت تک دشمن سے مصروف جہاد رہنے کے بعد اب گوشہ نشینی پر مجبور ہو گئے ہیں انہیں دشمن نے نہیں دوست نے گوشہ نشینی پر مجبور کیا ہے وہ اس حکومت کی قربان گاہ پر قربان کر دیئے گئے جو حکومت خود ان کی قوتِ ایمان، جذبۂ جہاد و اخلاص اور ان کی طاقتِ شمشیر کا ثمر تھی، فاطمہؑ خستہ و غمگین و مضطر ان تمام حوادث میں گھری ہوئی ہیں۔ انہوں نے حتی الامکان اس بات کی کوشش کی کہ علیؑ کو ان کا حق واپس مل سکے۔ مگر ان کی یہ کوشش بھی بارآور نہ ہو سکی۔ اس ناکامی نے ان کو بالکل شکستہ اور ناامید کر دیا۔ ان کی ہمت جواب دے گئی۔

اب نہ صرف یہ کہ مزید جدوجہد کی تاب نہیں ہے بلکہ جن حالات سے دوچار ہیں ان کے غم و اندوہ کو سہارنا مشکل محسوس ہو رہا ہے۔ نہ صرف گھر کے باہر کی فضا، ناقابلِ برداشت ہے بلکہ خود گھر کے اندر کی خاموشی اور اداسی سے بھی دل خون ہوا جاتا ہے اور سب سے بڑھ کر اپنے گھر سے متصل گھر یعنی خانۂ پیغمبرؐ کے ہولناک سکوت کی دلدوز صدا ان کی روح کو گھائل کئے دے رہی ہے۔

اب وہ دریچہ بھی بند ہو چکا ہے جو ان کے گھر کے دریچہ کے مقابل کھلتا تھا اور جس دریچہ سے ہر روز پیغمبرؐ کا روشن اور مسکراتا چہرہ طلوع ہوتا تھا اور اس مسکراہٹ سے فاطمہؑ کے مٹی کے گھر میں پر لطف و امید کی زندگی بخش لہر دوڑ جاتی تھی اب وہ دریچہ خاموش اور اداس ہے۔ موت نے اس مطلع امید و مسرت کو فاطمہؑ پر ہمیشہ کے لیے بند کر دیا ہے سیاست کے تقاضوں کے تحت فاطمہؑ کے گھر کا دریچہ بھی بند کر دیا گیا اب فاطمہؑ اپنے گھر کی تنہائی میں قید ہیں۔ ان کے ساتھ علیؑ ہیں جو ایک کوہ ثبات کی مانند افسردہ اور خاموش بیٹھے ہیں یہ ایسا سکوت ہے جس نے اپنے حصار میں جوش مارتے ہوئے آتش فشاں کو قید کر رکھا ہے اور ان دونوں کے علاوہ اس گھر میں فرزندانِ رسولؐ ہیں جن کے معصوم اور غمزدہ

چہروں پر ان کے مستقبل کی ہولناک داستان صاف پڑھی جاسکتی ہے۔

اب فاطمہؑ کے لیے زندہ رہنا ایک ایسی مصیبت ہے جس کو برداشت کرنے کی طاقت وہ خود میں نہیں پاتیں زندگی ایک ایسا سنگین بوجھ بن گئی ہے کہ جس بار کو اٹھانے سے فاطمہؑ کے خستہ وناتواں شانے معذور نظر آتے ہیں۔ وقت بوجھل اور آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا گذر رہا ہے۔ وہ وقت کے قدموں کا بار اپنے مجروح دل پر محسوس کر رہی ہیں۔ ہر لحظہ، ہر دقیقہ ان کے لیے ایک ناقابلِ برداشت بوجھ ہے۔ اب اس دنیا میں ان کی تسلی کا عنوان ایک تو ان کے پدر بزرگوار کی تربتِ مہربان ہے اور دوسرے وہ مژدۂ جاں بخش جو پیغمبرؐ نے ان الفاظ میں سنایا تھا کہ "فاطمہؑ میرے خاندان میں تم وہ پہلی ہستی ہو جو مجھ سے آکر ملو گی۔"

لیکن کب؟ وہ ساعت جس کے انتظار نے بے تاب کر رکھا ہے آخر کب آئے گی۔

فاطمہؑ کی روح آزردہ کسی ایسے زخمی پرندے کی طرح جس کے پر شکستہ ہو گئے ہوں درد و غم کے تین زاویوں کے درمیان بے تاب اور مقید ہے یعنی ان کے شوہر کا خاموش اور غمگین چہرہ ان کے بچوں کی غم زدہ صورتیں اور ان کے باپ کی سرد و ساکت قبر۔

جب کبھی ان کے دل پر غم کا فشار بڑھتا ہے۔ جب وفورِ گریہ سے ان کا دم رکنے لگتا ہے تو انہیں اپنے باپ کی محبت اور ان کی تسلیوں کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے چنانچہ اپنی بے تابی کا مداوا کرنے کے لیے وہ تربتِ پدر کا رخ کرتی ہیں اپنی وہ آنکھیں جو مسلسل روتے روتے زخمی ہو چکی ہیں تربتِ پدر پر جما دیتی ہیں یہاں تک کہ ان پر ایسی کیفیتِ غم طاری ہو جاتی ہے جیسے انہیں ابھی ابھی اپنے باپ کی موت کی خبر ملی ہو شدتِ گریہ انہیں بے حال کر دیتا ہے پھر وہ اپنے لرزتے ہوئے ہاتھ اپنے باپ کی تربت پر رکھ دیتی ہیں ان خالی اور بے سہارا ہاتھوں کو تربتِ پدر کی خاک سے پر کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ پردۂ اشک کو چیر کر ان کی نگاہیں

اس خاک کو دیکھ سکیں پھر وہ اپنے ہاتھوں کو اپنے چہرے کے نزدیک لے جاتی ہیں محبت کے اس شدید احساس کے ساتھ جو انہیں اپنے باپ سے تھی خاک تربت پدر کو سونگھتی ہیں۔ اس مٹی کی خوشبو سے ان کی بے کلی کو عارضی طور پر قرار مل جاتا ہے پھر وہ ایسی آواز میں جو شدتِ گریہ کا تاثر لیے ہوئے ہے آہستہ آہستہ کہتی ہیں۔

"جس نے تربتِ احمدؐ کی مٹی سونگھ لی اسے اب قیامت تک کسی اور خوشبو کو سونگھنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔

"آپ کے بعد مجھ پر ایسی مصیبتیں پڑیں کہ اگر وہ روز روشن پر پڑتیں تو وہ سیاہ رات میں تبدیل ہو جاتا۔"

رفتہ رفتہ ان پر سکوت طاری ہوجاتا ہے۔ تربتِ احمدؐ کی خاک ان کی انگلیوں کے کنارے سے آہستہ آہستہ گرتی جاتی ہے۔ مگر انہیں احساس غم نے اس قدر نڈھال کر رکھا ہے کہ وہ اس مٹی کو اپنے ہاتھوں سے پھسلنے سے نہیں روک سکتیں وہ ایک ایسے انسان کی طرح جو درد سے مغلوب ہوگیا ہو اس مٹی کو دیکھتی رہتی ہیں خاموش اور ساکت "بے خندہ و بے گریہ" جیسے ان کی روح جسدِ عنصری سے پرواز کر گئی ہو جیسے وہ کسی دوسرے عالم میں پہنچ گئی ہوں۔

انہوں نے اپنے تمام دکھ درد اپنے باپ کی فرقت کے غم میں ضم کر دیئے تھے ان کے لیے ہر دن مرگِ پدر کا گویا پہلا دن تھا۔ ان کی بے تابی میں ہر روز اضافہ ہو رہا تھا ان کے نالے ہر دن کچھ اور دردناک ہو جاتے۔ انصار کی عورتیں ان کے پاس آتیں اور ان کے ساتھ مل کر پیغمبرؐ پر گریہ کرتیں ایسے عالم میں جب شدت نالہ و فریاد سے ان کا دل بے حال اور ان کی آنکھیں خونچکاں ہوتیں وہ ان سے اس ستم کا شکوہ کرتیں جس کا نشانہ خانوادۂ رسولؐ بنا تھا اور اس حق کو یاد دلاتی جسے انہوں نے پائمال کر دیا تھا۔

ان کا غم اب ان منزلوں سے گذر چکا تھا جہاں کسی کی تسلی ان کے کام آسکتی یا کوئی ان کا غم بٹا سکتا۔

روز و شب اسی طرح گذرتے رہے، اصحاب رسولؐ کاروبار حکومت، فتوحات اور مالِ غنیمت کے بکھیڑوں میں پھنس گئے، علیؑ گوشۂ تنہائی میں خاموش اور ساکت ہو گئے اور فاطمہؑ موت کے خیال میں غلطاں اس ساعتِ نجات کا بے چینی سے انتظار کرتی رہیں جس کا مژدہ انہیں پیغمبرؐ نے دیا تھا۔

رحلت فاطمہؑ

ہر گذرتے ہوئے دن کے ساتھ موت کے لیے فاطمہؑ کی بے قراری بڑھتی جارہی ہے ہر دن اسی امید میں کٹتا ہے کہ شاید موت رشتۂ حیات کو منقطع کردے اور بیٹی جس کی روح درد اور شکایت سے لبریز ہے اپنے باپ کے سایۂ عاطفت میں پہنچ کر آرام اور سکون حاصل کرسکے۔

مگر وقت بہت آہستہ آہستہ گذر رہا ہے پیغمبرؐ نے جو مژدۂ مرگ سنایا تھا اسے آج ۹۵ دن ہوگئے۔ مگر ابھی تک موت کا پیغام نہیں آیا۔

کیوں؟

آج دوشنبہ ہے۔ جمادی الثانی کی تیسری تاریخ، ہجرت کا گیارہواں سال اسی سال پیغمبرؐ نے رحلت فرمائی۔

یکایک انہوں نے اپنے بچوں کو پیار کیا، سات سالہ حسنؑ، چھ سالہ حسینؑ پانچ سالہ زینبؑ اور ام کلثومؑ ابھی صرف تین سال کی ہیں یہ گویا بچوں کو ماں کا آخری اور الوداعی بوسہ تھا۔

اور یہ علیؑ سے رخصت کا لمحہ ہے۔

کس قدر مشکل اور سنگین لمحہ!

ابھی علیؑ کو اس دنیا میں ہی رہنا ہے۔ مزید تیس سال

ام رافع کو طلب فرمایا۔ یہ پیغمبرؐ کی آخری رسوم میں خدمتگار کے فرائض انجام دے چکی ہیں ان سے فرمایا۔

اے کنیز خدا تم مجھ پر پانی ڈالو تاکہ میں غسل کرسکوں۔ بڑی دقت اور بڑی احتیاط

کے ساتھ غسل کیا اور پھر نیا لباس زیب تن فرمایا حالانکہ رحلتِ پیغمبرؐ کے بعد آپ علامتِ عزا کے طور پر ہمیشہ سیاہ لباس میں ملبوس رہیں لیکن آج سیاہ لباس کو بڑھا کر آپؑ نے نیا لباس پہنا ہے یہ تبدیلی لباس گویا اس بات کی نشانی ہے کہ اب دورِ عزاداری رسول ختم ہو رہا ہے اور آج بیٹی اپنے باپ سے ملاقات کے لیے ان کی خدمت میں جا رہی ہے۔

پھر ام رافع سے کہا۔

میرا بستر کمرے کے درمیان میں کر دو۔

آرام و سکون سے آپ بستر پر لیٹ گئیں، رخ قبلہ کی طرف کر لیا اب صرف موت کا انتظار ہے

وقت لحظہ لحظہ کر کے گذر رہا ہے ۔۔۔

ناگہاں گھر سے نالہ و شیون کی صدا بلند ہوتی ہے۔

موت کے سرد ہاتھ نے ان کی پلکوں کو بند کر دیا ہے لیکن بند پلکوں کے پیچھے ان کی روشن آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور وہ اپنے محبوب باپ کے چہرے کا دیدار کر رہی ہیں وہ چہرہ جو اپنی بیٹی کا انتظار کر رہا تھا۔

شمع آتش در شب جو خانۂ علیؑ میں روشن تھی اب خاموش ہو گئی۔

افسوس کہ علیؑ اب تنہا رہ گئے

اپنے کمسن بچوں کے ساتھ

علیؑ سے وصیت کی تھی کہ دفن رات کے وقت کیا جائے۔ نشانِ قبر کسی کو نہ بتایا جائے اور ان دونوں شیوخ کو جنازہ میں شریک نہ کیا جائے

اور علیؑ نے ایسا ہی کیا۔۔۔

مگر کسی کو نہیں معلوم کہ کس طرح؟

یہ اب تک کوئی نہیں جانتا کہ انہیں کہاں دفن کیا گیا

ان کے اپنے گھر میں، یا بقیع میں؟

اور اگر بقیع میں تو کس طرف؟ ...... آج تک کسی کو معلوم نہیں ہے ؎۱

ہاں ہمیں جو کچھ معلوم ہے وہ علیؑ کا رنج و غم ہے اس رات، قبرِ فاطمہؑ پر مدینہ کو رات نے اپنی سیاہ آغوش میں لے لیا ہے سب مسلمان غفلت کی نیند سو رہے ہیں رات کا پراسرار سناٹا علیؑ کی سرگوشیوں کی طرف گوش بر آواز ہے اور علیؑ اب بالکل اکیلے ہیں۔ ہر طرح تنہا ہیں مدینہ پیغمبرؐ سے خالی تھا اور اب گھر فاطمہؑ سے خالی ہو گیا علیؑ شہر میں تو تنہا تھے ہی اب گھر میں بھی اکیلے رہ گئے وہ ایک کوہِ غم کی طرح فاطمہؑ کی قبر پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ تنہا خاموش اور سوگوار کتنی ساعتیں بیت گئیں۔

رات، خاموش اور غمگین رات علیؑ کی سرگوشیوں کی طرف کان لگائے ہوئے ہے بقیعہ کا خوش نصیب ماحول اور مدینہ کی بے وفا اور بدبخت فضا مکمل طور پر خاموش ہے۔ بیدار قبریں اور خوابیدہ گھر علیؑ کی آواز سن رہے ہیں۔

نسیم نیمہ شب، علی کی صدائے جاں سوز، قبرِ فاطمہؑ سے خانۂ پیغمبرؐ کی طرف لے جا رہی ہے۔ وہ بدقت یہ کلمات فرما رہے ہیں؛

اے اللہ کے رسولؐ آپ پر میری جانب سے اور آپ کے ہمسایہ میں پہنچنے والی اور آپؐ سے بہت جلد ملحق ہونے آپؐ کی دختر کی طرف سے سلام ہو۔

یارسولؐ اللہ، آپؐ کی دخترِ عزیز کی رحلت کے باعث میری شکیبائی جواب دے رہی ہے اور میری طاقت ضعف سے بدل رہی ہے لیکن جس طرح میں نے آپؐ کی فرقت کے عظیم صدمہ اور آپؐ کی رحلت کی جانکاہ مصیبت پر صبر کیا اسی طرح مجھے اس موقع پر

؎۱ یہ کام محققین کا ہے کہ وہ اس باب میں تحقیق کریں لیکن میں کہ محقق نہیں ہوں مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ اس باب میں تحقیق کروں میں نہیں چاہتا کہ ان کی قبر کی صحیح جگہ دریافت کروں۔ ان کا مدفن ہمیشہ سے نامعلوم رہا ہے اس لیے کہ انھوں نے ایسا ہی چاہا تھا ان کی یہی خواہش تھی کہ ان کا مدفن نامعلوم رہے۔ ان کی قبر کا نشان پوشیدہ رہے۔ ہر دور میں ہر شخص کے لیے، تاکہ ہر دور میں ہر شخص خود سے یہ سوال کرے کہ آخر نشانِ قبر کو پوشیدہ رکھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ آخر ایسا کیوں ہوا۔

بھی صبر سے کام لینا ہوگا۔

میں نے اپنے ہاتھوں سے آپؐ کو لحد میں اتارا اور آپؐ کی پاک روح نے ایسی حالت میں پرواز کی کہ آپؐ کا سرِ اقدس میرے حلقوم اور سینہ کے درمیان تھا۔ اناللّٰہ وانا الیہ راجعون۔

فاطمہؑ ایک ودیعت تھی جو پلٹا دی گئی ہے اور رہن چھڑا لیا گیا ہے لیکن اب میرا حزن و ملال دائمی ہے۔ اب میری راتیں جاگتے گذریں گی یہاں تک کہ خداوند عالم میرے لیے بھی وہی گھر منتخب فرمادے جس میں آپ مقیم ہیں۔

اب آپؐ کی دختر آپ کو مطلع کریں گی کہ کس طرح آپؐ کی امت نے ایکا کر کے ان پر مصیبت کے پہاڑ توڑے آپؐ ان سے تمام حالات پوچھ لیں ایک ایک بات دریافت کرلیں وہ آپ کو اپنے تمام مصائب سے باخبر کردیں گی۔ یہ تمام مصیبتیں ان پر گذر گئیں حالانکہ ابھی آپؐ کی رحلت کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا ہے اور نہ زمانہ آپؐ کی یاد سے خالی ہوا ہے۔

آپ پر اور آپ کی دختر عزیز پر میرا سلام ہو ایسے وداع کنندہ کا سلام جو خشمگیں ہے اور نہ ملول۔

علیؑ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو جاتے ہیں۔ یوں ہے جیسے کہ تمام عمر کے دکھ درد نے ان کے دل پر ایک ساتھ یلغار کردی ہو جیسے ہر اس لفظ کے ساتھ جوان کی روح کی گہرائیوں سے نکل رہا تھا ان کے وجود کا ایک حصہ تحلیل ہوتا جا رہا ہے۔

حیران و پریشان وہ اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں؟ یہیں ٹھہریں؛ چلے جائیں؟ بھلا فاطمہؑ کو یہاں تنہا کیوں کر چھوڑیں؟ کس دل سے گھر کی طرف اکیلے لوٹ جائیں؟ شہر کسی ایسے عفریت کی مانند جو رات کی تاریکی میں گھات لگائے ہوئے ہو۔ ان کے انتظار میں ہے ہر طرف سازشوں، فتنوں، خیانت کاریوں، اور بے شرمی کے سائے رینگ رہے ہیں۔

لیکن علیؑ کے لیے یہاں ٹھہرے رہنا بھی ممکن نہیں ہے ان کے بچے، مسلم عوام

حقیقت اور مسئولیت کی عظیم ذمہ داری ان کے لیے چشم براہ ہے۔ ان کے علاوہ یہ عظیم ذمہ داریاں اب اور کون اٹھا سکتا ہے؟

درد و غم کی شدت نے ان کی توانا روح کو کمزور کر دیا ہے وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پلتے۔ عجیب کشمکش کا عالم ہے، چلے جائیں ۔۔۔؟ ٹھہرے رہیں۔۔۔؟

علی محسوس کر رہے ہیں کہ جیسے وہ دونوں باتوں سے معذور ہوں۔ جیسے ان کی تاب و تواں رخصت ہو گئی ہو۔ قوتِ فیصلہ جواب دے گئی ہو پھر گویا فاطمہؑ سے اپنی کیفیت کی توضیح کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

"پس اگر میں یہاں سے چلا جاؤں تو اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ میں اس تربت سے دل گرفتہ ہوں اور اگر یہاں ٹھہرا رہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اس وعدہ سے بدظن ہوں جو خدا نے صبر کرنے والوں سے کیا ہے"

پھر آپ بدقت اٹھ کھڑے ہوئے خانۂ پیغمبرؐ کی طرف رخ کیے تنہا اور ملول کھڑے رہے یہ درد اور تنہائی کی وہ کیفیت ہے جس کا تصور کرنا بھی مشکل ہے گویا علیؑ زبانِ حال سے کہہ رہے تھے کہ اے اللہ کے رسول آپؐ نے جو ودیعت گرانمایہ میرے سپرد کی تھی آج میں نے اسے آپؐ کو واپس کر دیا ہے اب آپؐ ان کا احوال خود انہی سے سن لیجئے ان سے پوچھیئے، بہ اصرار پوچھئے تاکہ وہ آپ کو ایک ایک بات بتا دیں آپؐ کے بعد جو کچھ ان پر گذرا ہے ان تمام باتوں سے آپؐ کو مطلع کر دیں۔

فاطمہؑ اس شان سے زندہ رہیں اور اس عنوان سے ان کی زندگی اختتام کو پہنچی اپنی رحلت کے بعد انہوں نے تاریخ میں ایک نئی زندگی کا آغاز کیا ان تمام لوگوں کے چہروں پر جو تاریخ میں آپؐ کے بعد ظلم و ستم کا نشانہ بنائے جاتے رہے آپ کی مظلومیت کا عکس جھلکتا ہے وہ تمام لوگ جو مظلوم و محروم ہیں جن کے حقوق غصب کیے گئے ہیں جنہیں مکر و فریب نے اپنے مفاد کی خاطر قربان کیا ہے آپؐ کے نام کو اپنی نجات اور بقا کی علامت سمجھتے ہیں۔

فاطمہؑ کی یاد ان تمام انسانوں کے خواہ وہ مرد ہوں یا عورت جذبۂ عشق و

ایمان اور حیرت انگیز شوقِ جہاد کی صورت میں پروان چڑھتی رہی جو اسلام کی طویل تاریخ کے ہر دور میں آزادی اور عدالت کی جنگ لڑتے رہے ہیں ظالم اور جابر حکومتوں کے جور و ستم اس یاد کو مٹا نہیں سکے بلکہ جس قدر ظلم نے اس یاد کو مٹانے کی کوشش کی اس کی اثر آفرینی اور بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ یہ نام ہر زخمی دل کی پکار بن گیا۔ یہی سبب ہے کہ فاطمہؑ کا نام ملتِ اسلامی کی تاریخ کے ہر موڑ پر محروم اور مظلوم انسانوں کے لیے سرچشمۂ الہام و آزادی حق پسندی و عدالت طلبی بن گیا اور آپؑ کی شخصیت ظلم و ستم، جبر و تشدد اور طبقہ واریت کے خلاف جہاد کی علامت قرار پائی۔

فاطمہؑ کی شخصیت کے بارے میں گفتگو کرنا انتہائی دشوار ہے وہ ایک "عورت" تھیں اسلام نے مثالی عورت کا جو تصوّر پیش کیا ہے اس تصوّر کی روشن تصویر، یہ پاکیزہ تصویر خود پیغمبرؐ نے اپنے انسانیت طراز ہاتھوں سے بنائی تھی جس طرح سونے کو آگ میں تپا کر کندن بنایا جاتا ہے اسی طرح پیغمبرؐ نے آپ کو سختی، فقر اور جدوجہد کی آنچ میں تپا کر نکھارا۔ آپ کی تعلیم و تربیت پر بڑی گہری اور کڑی نگاہ رکھی اور آپؑ کو حیرت انگیز انسانی خوبیوں کا مظہر بنا دیا۔

وہ ہر اعتبار سے ایک مثالی عورت تھیں، نسوانیت کی تمام گوناگوں ابعاد کے لیے ایک مثالی نمونہ۔

اپنے باپ کے حوالے سے ——— ایک مثالی بیٹی

اپنے شوہر کے حوالے سے ——— ایک مثالی بیوی

اپنے بچوں کے حوالے سے ——— ایک مثالی ماں

اور وقت اور سماجی ماحول کے تناظر میں وہ ایک "زن مبارز و مسئول" کا نمونہ تھیں، انہوں نے اپنی سیرت سے معاشرے میں عورت کی ذمہ داریوں اور اس کے دائرۂ عمل کی نشاندہی کی۔

وہ بذاتِ خود ایک امام ہیں ایک نمونۂ مثالی ہیں ایک آئیڈیل ٹائپ

(IDEAL TYPE) ہیں ان کا "اسوہ" عورتوں کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ ہے
ہر اس عورت کے لیے جو آزادانہ طور پر اپنی شخصیت کی تعمیر کرنے کی خواہش مند ہو
وہ ایک نگراں " شاہد " ہیں۔

ان کی حیرت انگیز طفلی، ان کی جد و جہد اور کشمکش سے لبریز زندگی، داخلی، اور خارجی ہر دو محاذ پر ان کا مسلسل جہاد اپنے باپ کے گھر اپنے شوہر کے گھر اور اپنے معاشرہ میں ان کا کردار ان کی فکر، ان کا عمل غرض ان کی جامع اور مثالی شخصیت اس سوال کا مکمل جواب ہے کہ ایک عورت کو کیسا ہونا چاہیئے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کہوں، بہت کچھ کہہ چکا مگر ابھی کہنے کے لیے بہت کچھ باقی ہے۔

فاطمہؑ کی شخصیت کا ہر پہلو روشن ہے ہر جلوہ خیرہ کن ہے لیکن ان کی مقدس شخصیت کے بے شمار خیرہ کن جلووں میں مجھے جو بات سب سے زیادہ حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ وہ علیؑ جیسی عظیم شخصیت کی ہمسفر، ہمگام اور ہم پرواز ہیں۔ وہ کمالِ انسانیت کی شاہراہ پر ان کے ساتھ قدم بہ قدم چلتی ہوئی نظر آتی ہیں وہ ارتقائے انسانیت کے افق ہائے بلند پر علیؑ کی ہم پرواز ہیں۔

علیؑ کے ساتھ ان کا تعلق محض ایک زوجہ کے تعلق سے کہیں زیادہ بامعنی تھا علیؑ نے ان کی رحلت کے بعد دوسری عورتوں سے عقد کیا مگر کوئی عورت ان کے خلاء کو پر نہ کر سکی، علی کی نگاہ میں ان کی حیثیت ایک ایسے دوست غمخوار اور محرم کی تھی جو ان کے بلند مقاصد میں ان کے ساتھ برابر کی شریک ہو، وہ ان کے دکھ درد کی ساتھی ان کی ہمدم و ہمراز، ان کی شریک کار، ان کی بیکراں خلوتوں کی انیس اور ان کی بلندیٔ فکر و نظر میں ان کی ہمدم و دمساز تھیں۔

اسی سبب سے علیؑ نے ان کو اپنی دوسری بیویوں سے مختلف سطح پر دیکھا اور یہی رویہ ان کی اولاد کے ساتھ بھی رکھا۔

فاطمہؑ کے بعد علیؑ نے دوسری عورتوں سے عقد کیے اور ان سے اولادیں بھی

ہوئیں مگر علیؑ نے ہمیشہ اپنی اس اولاد کو جن کی ماں فاطمہؑ تھیں اپنی دیگر اولاد سے ممتاز حیثیت دی، یہ "بنی علیؑ" کہلائے اور وہ "بنی فاطمہؑ"۔

کیا یہ تعجب انگیز بات نہیں کہ علیؑ جیسے عظیم باپ کے مقابلے میں بچوں کو ماں کی نسبت سے پہچانا جائے

اور ہم دیکھتے ہیں کہ خود پیغمبرؐ کی نگاہ میں ان کی حیثیت دوسری بیٹیوں سے بالکل جدا تھی آپ نے اپنی تمام بیٹیوں میں محض فاطمہؑ کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ فرمائی ان پر سخت اور کڑی نگاہ رکھی یحض انہی کو اپنی امیدوں کا مرکز بنایا انہیں عالم خوردسالی میں اسلام کے عظیم پیغام سے روشناس کرایا۔

میری عقل حیران ہے کہ ایسی شخصیت کے بارے میں کیا کہوں کس عنوان سے کہوں؟

میری خواہش تھی کہ میں فرانس کے اس نامور خطیب کی تقلید کروں جس نے ایک موقع پر "لوئی" کے حضور میں حضرت مریمؑ کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہا۔

سترہ سو برس سے مسلسل دنیا کے تمام سخن ور جناب مریمؑ کے بارے میں دادِ سخن دے رہے ہیں۔

سترہ سو برس ہو گئے کہ پیہم شرق و غرب کے تمام فلسفی اور مفکرین جناب مریمؑ کے فضائل بیان کر رہے ہیں۔

سترہ سو برس سے مسلسل تمام دنیا کے شاعر جناب مریمؑ کی تعریف میں اپنی تمام تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا رہے ہیں۔

سترہ سو برس سے مسلسل تمام فنکار، مصوّر، مجسمہ ساز، جنابِ مریمؑ کی شخصیت و سیرت کی تصویر کشی کے باب میں معجزہ ہائے ہنر تخلیق کرتے رہے ہیں۔

لیکن طویل صدیوں پر محیط فکر و فن کی یہ تمام کوششیں اور یہ تمام معجزہ ہائے ہنر جناب مریمؑ کی تعریف میں کہے گئے اس مختصر سے جملہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے کہ بہ

"مریمؑ مادرِ عیسیٰؑ ہیں"

میں نے چاہا تھا کہ میں بھی اسی عنوان سے جنابِ فاطمہؑ کی تعریف میں کوئی جملہ کہوں۔ مگر میری تابِ سخن سخت عاجز اور درماندہ ہے۔

میں نے چاہا کہوں : فاطمہؑ دخترِ خدیجہؑ بزرگ ہیں
میں نے دیکھا کہ یہ فاطمہؑ (کی مکمل تعریف) نہیں ہے
چاہا کہوں : فاطمہؑ دخترِ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں
مگر دیکھا کہ یہ فاطمہؑ (کی مکمل تعریف) نہیں ہے۔
سوچا کہوں : فاطمہؑ علیؑ کی ہمسفر و ہم کفو ہیں۔
دیکھا کہ یہ : فاطمہؑ (کی مکمل تصویر) نہیں ہے۔
سوچا کہوں : فاطمہؑ حسنینؑ کی ماں ہیں۔
دیکھا کہ یہ : فاطمہؑ (کی مکمل تصویر) نہیں ہے۔
سوچا کہوں : فاطمہؑ مادرِ زینبؑ ہیں۔
مگر دیکھا کہ یہ بھی فاطمہؑ (کی مکمل تصویر) نہیں ہے۔
ہاں — ! فاطمہؑ یہ سب کچھ ہے مگر یہی سب کچھ فاطمہؑ نہیں ہے۔
فاطمہؑ ، فاطمہؑ ہے ہاں !
فاطمہؑ ، فاطمہؑ ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆